

مُصَنَّفِینِ دینی کا علمی و دینی کام ہونا

بُریکات

مرتب
سعید احمد کسٹریادی

مطبوعات ندوة المصنفین دہلی

ذیل میں ندوة المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور اجار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

غلامان اسلام :- پچھتر سے زباوہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت ۳۰ روپے	مسند اسلام میں غلامی کی حقیقت - مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جن میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت - ۲۰ روپے
اخلاق اور فلسفہ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصول اخلاق اور انواع اخلاق اور فلسفہ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳۰ روپے	تعلیمات اسلام اور سچی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ۲۰ روپے
مسند قصص القرآن حصا اول - جدید ایڈیشن ندوة المصنفین کی مایہ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت ۳۰ روپے	سوشلزم کی بنیادی حقیقت - اشتراکیت کے متعلق پروفیسر ہارلڈس آفٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں نقل کیا گیا ہے قیمت ۲۰ روپے
بین الاقوامی سیاسی معلومات :- یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت ۲۰ روپے	ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ - مسند نبی عربی صلعم بتاریخ ملت کا حصول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے قیمت ۲۰ روپے
وحی الہی - مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت ۲۰ روپے	نہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے اس موضوع پر اپنے رنگ کی بیشل کتاب قیمت ۲۰ روپے
تاریخ انقلاب روس - ٹرانسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت ۲۰ روپے	

بُرْهَان

شماره (۱۱)

جلد ہیردہم

جنوری ۱۹۴۷ء مطابق صفر المظفر ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

- | | |
|--------------------------------------|--|
| ۱۔ نظرات | سعید احمد |
| ۲۔ قرآن مجید اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟ | جناب مولانا محمد حفیظ الرحمن صنا سیوہاری |
| ۳۔ اسباب کفر و جحود | جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ |
| ۴۔ بچوں کی تعلیم و تربیت | سعید احمد |
| ۵۔ تبصرے۔ | ۲۰۷۔ ج |

کیا نسبت مانج میں اس دشتِ بربریت اور زندگی و سبیت کی مثالیں بہت ہی کم ملیں گی۔ لیکن مسلمانوں کے نامی گرامی زعماء میں سے کتنے ہیں جو وہاں پہنچے ہوں، چند جماعتوں کی طرف سے کچھ وفد گئے بھی تو پورٹ مرتب کرنے کیلئے حالات کا مشاہدہ کئے، اخبارات میں بیان شائع کر دیے چند کی اسلیپ کر دیں اور بس! ہندوؤں میں گاندھی جی جس مرتبہ کے لیڈر ہیں کیا مسلمانوں میں بھی اسی مرتبہ کا کوئی لیڈر وہاں پہنچا اور اُس نے وہاں کے مصیبت زدہ مسلمانوں کے زخمی دل و جگر پر اپنے ہاتھ کی تسکین اطمینان کا پھایہ رکھنے کی کوشش کی جب گھر میں آگ لگ ہی ہو اور تمام سامان جل ٹھن کر خاک سیاہ ہو جائے تو اُس وقت محض بیان دیدنیہ کیونکر تقاضا ہمدردی کی تکمیل کر سکتا ہے پھر اس سلسلہ میں جو بیانات شائع کیے گئے انہیں بار بار انتقالِ آبادی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ انتقالِ آبادی کا معاملہ اگر ہزاروں گھنٹوں اور سو پر غور بھی کیا جاسکتا تھا لیکن لاکھوں کروڑوں کی آبادی کو کس طرح ایک حصہ ملک سے منتقل کر کے دوسرے حصہ میں آباد کیا جاسکتا ہے، پھر اس ناممکن العمل تجویز کو عمل میں لانا اگر مسلمانوں کیلئے ایسا ہی نہایت ضروری اور مفید ہے تو اُس کا اہتمام و انصرام خود کرنا چاہیے تو اُس درپوزہ گری کا بڑا ہوک اس کے لیے بھی درخواست و اصرارے بہادر سے ہی کی جا رہی ہے۔ گویا۔

۴۴ مذہبی اور اجتماعی کاموں کی تکمیل کے لیے فی الحقیقت بہت ہی قیمت ہے۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہے جس کے سبب اسی عطار کے لڑکے کو دوا لیتے ہیں
آہے خدا آج آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی اور قلب یہ کیا محسوس کر رہی کہ تمام صفاتِ کمال، غم و ہمت، جوشِ عمل، خود اعتمادی، عقل و فہم و عزتِ نفس، غیر میں موجود ہیں اور خود تیرے نام لیاؤں کا دامن ان سے تہی ہے، ہمارا جو قدم اٹھتا ہے غلط ہوتا ہے۔
جو بات ہماری زبان سے نکلتی ہے وہ محض جذبات انگیز ہوتی ہے، عمل سے اُس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا، قومیں بن رہی ہیں اور ہم بگڑ رہے ہیں اغیار پارہے ہیں اور ہم کھورہے ہیں۔

سے بہتر سا بچکاں کردہ نئے ناب سبیل نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را
مذہبِ المصنفین اور ہندستان کے دیگر علمی اور دینی حلقوں میں یہ خبر سترت کے ساتھ سنی جائیگی کہ دہلی، کلکتہ کے مشہور و معروف صاحبِ خیر جناب محترم شیخ فیروز الدین صاحب بنگال کے مسلم حلقے سے کونسل آف اسٹڈیٹس کے ممبر منتخب کیے گئے ہیں اس حلقے سے جو دوسرے اصحاب کھڑے ہوئے تھے انہوں نے موصوف کے حق میں اپنا نام واپس لے لیا اور اس طرح جناب شیخ صاحب بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے، ہم اُس مخصوص تعلق کی بنا پر جو جناب موصوف کو مذہبِ المصنفین سے ہے اس اعزاز پر ان کی خدمت میں اہدیہ تبریکِ تهنیت پیش کرتے ہیں۔ انجیل شیخ فیروز الدین کا وجود اس زمانے میں مسلمانوں کے علمی، ۴۴

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیدوہاروی

(۵)

بصائر | موعظت اور بصیرت تو ام ہیں کیونکہ جس کو بصیرت نصیب ہو جائے وہی موعظت بھی حاصل کر سکتا ہے اور جو نصیحت حاصل ہی نہ کرنا چاہتا ہو اس کو بصیرت سے کیا سروکار بلکہ یوں کہیے کہ عبرت نصیحت و حقیقت بصیرت کا قدرتی نتیجہ ہیں، جب قرآن ”موعظت“ ہے تو اس کو بصیرت بھی ضرور ہونا چاہیے ورنہ شجر بے ثمر اور گل بے رنگ و بو کی طرح ہو کر رہ جائے گا جو اس کی شان رفیع کے قطعاً خلاف ہے۔

”بصیرت“ اپنے معانی اور دلالت کے لحاظ سے وسیع المعنی لفظ ہے۔ قلبی عقیدہ، علم یقین یقینی معرفت، عبرت، حجت، برہان روشن، فطانت، قلب میں ادراک تمام و کامل کا حصول، یہ سب ایک ہی حقیقت کا بیان ہیں اور آخری معنی ”بصارت“ کے مقابل میں یعنی آنکھوں کے مشاہدہ کے کسی شے کا کامل احساس ”بصارت“ ہے اور قلب سے کامل ادراک کا نام ”بصیرت“ ہے، چنانچہ آیات ”لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ“ اور ”بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرٌ“ اس فرق کو نمایاں کرتی ہیں۔

پس قرآن بلاشبہ ان تمام معانی اور مطالب کی روشنی میں ”بصیرت“ ہے، وہ کتاب ہے کہ میں صرف اپنی ظاہری شکل و صورت اور اپنے الفاظ و نقوش کی ہیئت و ترتیب میں ”کتاب“ اور ”قرآن“ نہیں ہوں بلکہ اس لیے بھی ہوں کہ قلب انسانی کے لیے ایک روشن عقیدہ اور واضح اعتقاد ہوں، لہذا صرف زبان سے میری صداقت کا اقرار کافی نہیں ہے بلکہ قلبی یقین

کی مطابقت بھی اس کے لیے لازمی اور ضروری ہے اور یہ کیوں ہے اس لیے کہ میں ظنون و اہام و وساوس و ہوا جس اور خیالات و قیاسات نہیں ہوں بلکہ ”علم یقین“ اور ”یقین جازم“ ہوں اور میری تعلیم اور محجہ سے حاصل کردہ معرفت یقین محکم پر مبنی ہے میں ذخیرہ عبرت بھی ہوں اور خزانہ ”حجت و برہان“ بھی میں خود بھی ”فطانت“ ہوں اس لیے کہ قول حکیم ہوں اور دوسروں کی فطانت کے لیے دلیل راہ بھی ہوں اور ہر ایک مدرب حقیقت کے لیے آئینہ ادراکِ کامل بھی۔

اگر بصارت میرے نقوش و الفاظ اور نظم و ترتیب سے اعجاز کا مشاہدہ کرتی ہے تو میرے معانی و مفہیم اور مطالب و مدلولات عقل و خرد اور قلب و صلوٰۃ کے لیے ”بصیرت“ کا آئینہ دکھاتے ہیں۔

غور کرو کہ توحیدِ خالص کی حقیقت تک کس نے پہنچایا، رسالت سے متعلق افراط و تفریط کی گمراہی سے بچا کر طریقِ مستقیم کس نے دکھایا، کائناتِ رنگ و بو میں وہ کون سی الہامی کتاب ہے جس نے ایک ”اقی“ کی معرفت دینِ دنیوی نظامِ کامل کا معجزانہ مظاہرہ کیا اور ماضی کے ساربانوں کو مستقبل کے لیے جہاں بین و جہاں باں بنایا، ماضی کے مٹے ہوئے نقوش اور دھندلے خاکوں کو کہ ورت سے صاف کر کے کس نے بساطِ عالم پر روشن کیا اور مستقبل کے پر وہ ہائے غیب کو چاک کر کے کس نے عروج و زوال اور ہدایت و ضلالتِ اقوام کو روشناس کرایا، اُممِ ماضیہ اور اقوامِ سالفہ کے عبرت آموز اخبار و واقعات کو پیش کر کے رشد و ہدایت اور عبرت و موعظت کے لیے کس نے سامانِ ہتیا کیا اور علیٰ حقہ و حجتِ ادیان کا فراموش شدہ قانون کس نے دہرایا اور معاش و معاد کو توام بنا کر کس نے حیاتِ مستعار کا پیوند حیاتِ سرمدی کے ساتھ لگایا ہو اگر ان سب سوالات کا جواب صرف اکائی سے دینا چاہتے ہو تو اس صورت میں یہی کہنا پڑے گا کہ ایسا منظم دستور، محکم قانون، جازم عقیدہ، کامل فطانت، اور ادراکِ تام ”قرآن“ ہی ہے جو ”سر بستر بصیرت“ ہی ”بصیرت“ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علماء تفسیر نے اس کے مقامِ ”بصیرت کو ”علم“ سے تعبیر کیا ہے یعنی

جب جہل کے مقابلہ میں ”علم“ کمد و تو گویا تم نے سب کچھ کمد یا اور اس سے زیادہ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

کیونکہ جب تم یہ کہنا چاہو کہ وہ نور ہے ظلمت نہیں، حق ہے باطل نہیں، صدق ہے کذب نہیں، عبرت ہے تخریہ نہیں، یقین ہے ظنون و اوهام نہیں، بیان آئین ہے اخفار و ستر نہیں، برہان ہے تقلید جامد نہیں، ہدایت ہے ضلالت نہیں، استقامت ہے زلیغ نہیں، تو ان سب کی بجائے بس ایک بات یہ کہہ دو کہ وہ ”علم“ ہے ”جہالت“ نہیں ہے، اس لیے کہ ”جہالت“ عمی اور کور باطنی ہے اور ”علم“ بصارت و بصیرت ہے ”فَاِنَّهَا لَا تَعْمٰی اِلَّا بِصَاۡرٍ وَّلٰكِنْ تَعْمٰی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْر“

لیکن اس کو ”بصیرت“ نہیں ”بصائر“ کہا گیا ہے یعنی مفرد کے نہیں بلکہ جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے، کیونکہ وہ ایک گوشہ کی بصیرت تو نہیں ہے یا ایک پہلو اور رخ کے لیے تو بصیرت فراہم نہیں کرتا بلکہ وہ تو ہر گوشہ اور ہر سمت اور ہر موقع اور ہر محل میں بصیرت ہی بصیرت ہے، الہیات ہوں یا مادیات، عقائد ہوں یا اعمال و اخلاق، معاش و معاد ہو یا قصص و اخبار، ہر ایک شعبہ دینی و دنیوی کے لیے بصیرت مہیا کرتا ہے اس لیے وہ صرف ”بصیرت“ کیسے ہو سکتا تھا وہ تو ”بصائر“ ہے۔

فَدَجَانُکُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ
فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِہٖ وَ مَنْ
عَمٰی فَعَلِیْہَا مَا اَنَا عَلَیْکُمْ
بِحَقِیْقَۃٍ

بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی
جانب سے بصیرتیں آ پہنچیں، بس جس شخص
نے ان حقیقتوں کا مشاہدہ کیا اُس نے اپنے نفس
کو ہی فائدہ پہنچایا اور جس نے اندھا پن اختیار
کر لیا تو اُس کا نقصان بھی اُسی پر پڑا اور میں دمخ
صلی اللہ علیہ وسلم، تمہارے لیے نگہبان نہیں بنایا گیا
یہ تمہارے پروردگار کی جانب سے بصیرتیں

(انعام)

هٰذَا اَبْصَارٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ

وَهْدَىٰ ذُرِّيَّتَهُ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (اعراف)
 ہیں اور ہدایت و رحمت ہیں اُن لوگوں کے
 لیے جو مومن ہیں۔

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (جاثیہ)
 یہ لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں اور ہدایت
 اور رحمت ہیں اُن لوگوں کے لیے جو یقین کرتے
 ہیں۔

حکمِ ادیان سابقہ کی تصدیق، اُن میں نسخ و نسخ اور تحریف کی نگہبانی اور بصائر و غیر اور مواظبت و نصح کی فراوانی کے بعد قانون قدرت کا تقاضا ہے کہ ان حقائق پر ایمان لانے اور تصدیق کرنے والوں کے لیے ”حکم“ بھی برسرِ کار آنا چاہیے تاکہ اس کے امتثال سے سعادت اور اُس کے انکار سے شقاوت مندرج ہو اور ہر فرد اور جماعت اپنے اعمال و افعال میں قانونِ پاداشِ عمل کو پیش نظر رکھنے پر مجبور ہو۔

پس قرآنِ عزیز یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں ہی وہ ”حکم“ ہوں جو اس ترقی پذیر کائنات کے لیے بقائِ نسلِ انسانی تک ہمہ گیر ہے اور جس کے امتثال سے سعادتِ گہری کا حصول اور انکار پر شقاوتِ ابدی کا نزول ہوتا ہے اور ایک نفسِ انسانی خدائے قدوس کی اس حجتِ بالغہ کے بعد جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کے پاداشِ عمل کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔

گندم از گندم بر وید جو ز جو

از مکافاتِ عمل غافل مشو

الئے آج کسی قوم اور کسی گروہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ میرے ”حکم“ سے سربازی کرے اور یہ کہہ کر مخلصی پیدا کرے کہ وہ نزولِ قرآن سے قبل نازل شدہ کتابِ الہی اور دینِ سابق پر ایمان رکھتا ہے اور اس لیے قرآنِ عزیز کے امتثال کا محتاج نہیں ہے کسی بھی ملت کو یہ حق اس لیے حاصل نہیں ہے کہ جب میں تاریخِ ملل و ادیان کی روشنی میں برہان اور حجت بن کر یہ ثابت کر چکا کہ ادیانِ سابقہ کے قبول کرنے والوں نے اُن کی حقیقی تعلیم کو فنا کر دیا اور نسخ و تحریف کی گند چھری سے

ذبح کر دیا اور آج نہ وہ ایمانیات میں اُس کے سچے پیرو ہیں اور نہ احکام و اعمال میں اُس کے حامل بلکہ ادیانِ قدیم اور مطلق سابقہ کی سچی اور صاف تعلیم کی اساس و بنیاد و حقیقت وہ ہے جس کو آج میں پیش کر رہا ہوں اور ”صراطِ مستقیم“ اس کے ماسوا کچھ نہیں ہے گویا میں قوموں کا وہ بھولا ہوا دینی اور ملی سبق ہوں جو اس کامل و مکمل شکل میں تم کو درسِ ہدایت دے رہا ہوں تو پھر اگر حجتِ حق یہ ثابت کر چکا ہے کہ میں ”حق“ ہوں ”نور“ ہوں ”برہان“ ہوں ”مصدق“ ہوں ”ہیمن“ ہوں تب جو فرد انسانی مجھ سے روگردانی کرتا ہے، وہ بلاشبہ حق کی جگہ ”باطل“ نور کی بجائے ”ظلمت“ برہان کے بدلہ رسومِ جاہلیت کی، ”مصدق“ کے عوض ”مکذب“ کی، اور ”ہیمن“ کے مقابل ”منسوخ و محرف“ کی پیروی کرتا ہے اور اس طرح جادہ حق اور صراطِ مستقیم سے بے راہ ہو جاتا ہے۔

تم اس پر تعجب نہ کرو کہ میں ”حُكْمًا عَرَبِيًّا“ ہوں، یعنی میری زبان عربی ہے، اس لیے کہ جب تم اس پر تعجب اور حیرانی کا اظہار کرتے ہو تو دوسرے الفاظ میں گویا تانچہ ادیان کے روشن پہلو کے منکر اور یا اس سے بے خبر ہونے کے معترف ہو جاتے ہو۔

کیا تم فراموش کر دو گے کہ خدا کا قانونِ قدرت ہمیشہ ہی رہا ہے کہ جس کسی قوم کسی ملت، اور کسی گروہ میں اُس نے اپنا ہادی یا پیغمبر بھیجا ہے تو جس قوم میں بھی وہ بھیجا گیا ہے اُس کی دعوت و تبلیغ اور کتابِ الہی کا نزول اُسی زبان میں ہوا ہے، چنانچہ سامی اقوام نے سامی زبانوں میں اور غیر سامی ملتوں نے اپنی اپنی مروجہ زبانوں میں ہی ”صوتِ ہادی“ کو سنا اور سمجھا ہو۔

تو اب اگر ایک وقت معین ہو چکا تھا کہ خدائے کائنات کا پیغام تمام کائنات میں اقوام و ملل میں جدا جدا سننا اور سمجھا جائے بلکہ توحیدِ الہی کے محدود و مفید پیغامات حق نے اب عالمِ انسانی کو نشو و ارتقاء کی اُس منزل پر پہنچا دیا ہے کہ بالغ نظری اور بلند نگاہی اپنے کمالات کو نمایاں کرے اور وحدتِ ادیان ایک حقیقی وحدت کی شکل میں منصہ شہود پر آجائے شبِ عقلِ سلیم اور فطرتِ مستقیم ہی فیصلہ کرتی ہے کہ دینِ وحدت - پیغامِ اقوامِ لاطل کائنات کی

صد مختلف اور متعدد زبانوں میں نہیں بلکہ ایک اور صرف ایک ہی زبان میں سنی اور سمجھی جائے تاکہ قانون وحدت یہاں بھی اپنی جگہ برقرار رہے اور اختلاف و انتشار اپنا دخل نہ پاسکے اور جب یہ فیصلہ حق اور صحیح ہے تو پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور جس قوم میں پیغمبر کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا خدا کے پیغام کا بھی اسی قوم کی زبان میں نزول ہوا۔

اور اگر یہ بات آج مسلمات میں سے ہے کہ قوموں کے تہذیب و تمدن اور ثقافت (کلچر) کی سب سے بڑی ترجمان "قومی زبان" ہوتی ہے اور وہی کسی جماعت کی خصوصیات و امتیازات کا پتہ دیتی اور قوموں کے درمیان اس کو ممتاز بناتی ہے تو پھر علم اللسانہ اس کے لیے شاہد عدل ہے کہ نزول قرآن کے وقت عربی ہی وہ زبان تھی جو عالی خیالات اور بلند افکار کے لیے موزوں، روحانی اور علوی تعبیرات کے لیے جاذب، دقیق مضامین کی ادار کے لیے مناسب اور باریک سے باریک فروق اور نازک سے نازک امتیازات کے لیے وسیع شکست الفاظ میں رفیع، اور فصاحت و بلاغت کلام میں بدیع، غرض زندہ زبانوں میں اپنی رفعت و شوکت اور وسعت و طلاقت میں ہمہ گیر اور لغوی مواد میں "ام اللسانہ" کہلانے کی مستحق تھی، اس لیے قرآن عزیز کا "عربی زبان" میں نزول گویا تمدنی اور ثقافتی اور عمرانی و لسانی حیثیت سے بھی اس کے عالم گیر و ہمہ گیر پیغام ہونے پر برہان محکم اور حجت مبرم ہے۔

حَمِّ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا جَعَلْنَاهُ

قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ اِس کو رکھا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم سمجھو۔

وَإِنَّ كُنُوزَ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ اِس کو یہ قرآن پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے۔

وَالرُّدْخُ الْأَوَّلِينَ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِنُكَلِّمَكَ اِس کو فرشتہ معتبر تیرے دل پر

مِنَ الْمُتَذَكِّرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ تاکہ تُوذراے والوں میں سے ہو صاف عربی

مُبِينٌ ۝ (شعراء) زبان میں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاهُ اِس طرح ہم نے اِس کتاب میں اُن کی قوم کی زبان میں

حُكْمًا عَرَبِيًّا (عہد) ”حکم عربی“۔
(نازل کی ہیں) اسی طرح ہم نے اماراتہ آن کو

الحاصل، قرآن کتاب ہے کہ میں ایسا نظام کامل ہوں کہ کائنات انسانی کے تمام دینی و دنیوی حوارج و حوادث کے لیے میرے احکام اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک انسان جن امور کا مکلف ہو سکتا ہے اُن سے متعلق میرے احکام حاوی اور سمبر گیر ہیں اس لیے مجھ کو صرف یہ نہ کہو کہ میں ”ذو حکم“ یا ”ذوالامر“ ہوں یا ”حاکم“ و ”امر“ ہوں بلکہ مجموعہ احکام الہی کا ایسا رفیع و وسیع سرمایہ ہوں کہ گویا سترائے ”حکم“ ہوں۔
روح | لیکن صرف اس قدر کافی نہیں ہے کہ میں ”حکم“ ہوں اس لیے کہ ”حکم“ تو ایک خاص طرزِ تعبیر کا نتیجہ ہے جو بُری اور اچھی دونوں صورتوں میں وجود پذیر ہوتا رہتا ہے تو کیا میری بھی یہی شان ہو؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ میرے احکام کا ہر ایک گوشہ اور ہر ایک شوشہ اپنے اندر روحِ حیاتِ سرمدی رکھتا ہے اور جوستی بھی اُس کے قبول کے لیے گوشِ حق نبوش اور قلبِ حق کیش رکھتی ہے اُس کی زندگی کے بیجاں شہ میں یہ احکام روحِ تازہ پھونکتے اور زندہ جاوید بنا دیتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ میرے نزول سے قبل کائنات انسانی کی انفرادی و اجتماعی زندگی اور حیاتِ دینی و ملی یا موت کا شکار ہو چکی تھی اور یا کشمکشِ موت و حیات کے ہاتھوں مرغِ بسمل بنی ہوئی تھی۔

ہندستان کا قدیم مذہب صرف رسم و رواج کا ایک بے روح ڈھانچہ تھا جس کے ہر رگ و ریشہ سے روحِ مسلوب ہو چکی تھی، توحید کی جگہ شرک نے لے لی تھی، خدا پرستی مسخ ہو کر اتار و اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی نذر ہو چکی تھی، معاشرت نے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اور جزا و سزا پر اعمال کو کردار کی جگہ نسب و نسل کے ساتھ وابستہ کر کے خود انسان کو انسان کا غلام بنا دیا تھا جو چھو اچھوت اور چھوت اچھوت کی آلودگیوں اور گھنڈے پن کی شکل و صورت میں نظر آرہی تھی، شوہر کی موت پر ایک عورت کو زندہ سستی ہونا پڑتا تھا، نکاح بیوگانِ حرام کاری کے مرادف

تھا، اور عورت ہر قسم کی ورثہ سے محروم تھی گویا انسانی حقوق سے محروم بے چارہ و مجبور تھی غرض الہیات و عبادات بوجھل اور پر مشقت رسوم اور قیودات سے جکڑے ہوئے تھے اور تمدن و معاشرت پر ایسی کڑی پابندیاں عائد تھیں، کہ انسانی حقوق تک پامال و برباد ہو چکے تھے۔

نصاری و یہود میں تقلید جامد اور رسوم ظاہری نے نہ صرف اخلاق و اعمال کو سنج کر دیا تھا بلکہ معتقدات و ایمانیات کو بھی شرک اور رسوم جاہلیت کے پردوں میں مستور کر دیا تھا۔
روما اور فلسطین کی تاریخ قدیم شاہد ہے کہ وہاں بھی انسانیت دو حصوں میں تقسیم نظر آتی ہے نہ غلام انسانوں میں شمار ہے اور نہ انسانی حقوق کا اُس سے کوئی واسطہ، عورت بھی مرد کی خواہشات کا کھلونا تھی اور بس خواہ وہ کنواری مریم کے تقدس کے نام پر نہ ہو یا قصور و محلات کی زیب زینت، رومن کیتھولک اور پرائسٹنٹ کی مہلک جنگوں نے مذہب کو خونریزی اور سفاکی بلکہ درندگی کا دوسرا نام دیدیا تھا حتیٰ کہ آزادی فکر کی جگہ جمود و خمود اور کورانہ تقلید نے لے لی تھی اور مذہب میں عقل و خرد اور دلیل و برہان ایک بے معنی بات ہو کر رہ گئے تھے۔

زردشتی مذہب کے نام پر ایران میں مانی اور مزدک نے وہ انار کی بپا کر دی کہ تہذیب و حیا نے شرم سے آنکھ بند کر لی، صاف اور صریح شرک و دہائی کے ساتھ عورت کا صرف عورت رہ جانا اور ماں، بہن، بیٹی کا حقیقی رشتہ مفقود کر دینا نالی اور انسانی حقوق میں فوضویت اور پادری پر آزادی دیدینا، اس تعلیم نے انسانیت کا کلا گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔

غور فرمائیے کہ اگر کسی معاشرہ کا اجتماعی نظام ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو جس میں عقل و فکر کی آزادی سلب کر کے اُس کی بنیادوں کو صرف رسوم اور خود ساختہ شرطوں اور پابندیوں کی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہے تو اہل دانش فیصلہ کریں کہ ایسے معاشرہ اور سماج کے اجتماعی نظام کا کیا حشر ہوگا، کیا اُس کی کوئی اینٹ بھی سیدھی اور راست کہی جاسکتی ہے؟ مگر اسلام سے قبل ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں کہ ایشیا و یورپ اور عرب و عجم میں کوئی ایک خطہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کا سماجی نظام جاہلی رسوم

اور باطل قیود و شروط کے جال پر الجھا ہوا نہ ہو اور آزادی فکر کو کسی صورت میں بھی کوئی مقام حاصل ہو سکا ہو۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دلیل و برہان کی جگہ ”پاپا“ ”برہمن“ اور ”موبد“ کی شخصیتوں نے لے لی اور انجیل، توراۃ، زبور، ادستا، وید کی حقیقی تعلیمات یکسر فراموش ہو کر ان کا نعم البدل رسوم جاہلیت قرار پائیں اور آہستہ آہستہ انہوں نے اس طرح مذہب اور دھرم کی شکل اختیار کر لی کہ اس کے خلاف وقت کے سچے مذاہب کی تعلیمات فنا کے گھاٹ اتر گئیں اور چشم بصیرت سے غور کرنے والی کسی سستی کو بھی یہ جرات نہیں ہو سکی کہ وہ آزادی فکر کے ساتھ حق کا اعلان کر سکے اور جس شخصیت نے بھی اس اقدام کی جسارت کی اُس کو بے دین اور ملحد و زندیق کا خطاب دیا گیا۔

تاریخ کے ابواب ماضی اگر اپنے نقوش میں کذب کی رنگ آمیزی سے پاک ہیں تو ان میں حقیقت نمایاں اور ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ قرآن نے اپنے پیغام کی بنیاد سراسر دلیل و برہان پر رکھی ہے اور جمود و خمود اور کورانہ تقلید و پابندی رسوم کی جہالت قرار دے کر صحیح آزادی فکر و آزادی رائے کا وہ دروازہ کھول دیا ہے جس کو ہزاروں برس ہوئے کہ مدعیان مذہب و ادیان نے دین و مذہب کے نام پر بند کر دیا تھا، چنانچہ یورپ میں لو تھر کی وہ آواز جو اصلاح کنیسہ کے نام سے گونجی اور جس نے تمام یورپ کو تاریکی اور جہالت سے نجات دلا کر ترقی کی راہ پر لگا دیا، اور ہندوستان میں شکر اچاریہ کی وہ صدا جو ناستکوں کے اتحاد اور بت پرستیوں کی بت پرستی کے خلاف بلند ہوئی یقیناً قرآن کی صدا پر باز گشت ہی کہی جاسکتی ہے، کیونکہ قرآن کی اس تعلیم حق کے علاوہ دنیا سے مذاہب و ادیان میں کوئی ایک بھی اس پکار سے آشنا نہیں تھا اور قرآن ہی کی گرج اور کڑک نے خفتہ عقلوں اور جو ابیدہ دماغوں کو بیدار کر کے ہوا کا رخ بدل دیا اور زمانہ کی باگ تارہ کی سے روشنی کی جانب موڑ دی۔

غرض کائنات انسانی کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ اجتماعی اور ملی حیات سے محروم ایک بے جان لاشہ اور جسم بے روح نظر آتا تھا، جدھر دیکھیے تاریکی اور ظلمت کا دور تھا اور ہر ایک طالب حق

غیبی نصرت و امداد کے لیے چشمِ براہ تھا کہ اچانک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور سرزمینِ حجاز میں
نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا اور اُن پر وحیِ الہی نے نزولِ اجلال کیا اور قرآن
نے نازل ہو کر کائنات کی پوری بساطِ اُلٹ دی اور عالمِ انسانی کے مُردہ لاشہ میں جانِ ڈال
دی۔ بے روح جسم کو روحِ حیات سے تازہ دم بنادیا اور ظلمت و تاریکی کے پردوں کو چاک
کر کے اس طرح تاباں و درخشاں کر دیا گویا آفتابِ عالمِ تاب نے طلوع ہو کر شبِ دیوگر کی سائی
ظلمتوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا ہے

وَكُنْ لَّكَ آدِحِينَ اِلَيْكَ اور اسی طرح ہم نے تمہاری جانب روح (قرآن)

مُرُو حَاقِّنْ اَمْرُنَا (شوری) کی وحی کی اپنے حکم سے

یعنی جس طرح بدن کے لیے روح ہے اُسی طرح قلب کے لیے بھی روح ہے اور اگر
اجسام بے روح "لاشہ" ہیں تو قلوب بے روح بھی "مردہ" ہیں اور اُن کے لیے قرآن ہی روحِ حیات
ہے۔ روحِ ابدی و روحِ سرمدی۔

یہ تو ہر زمانہ اور ہر دور میں نازل شدہ وحیِ الہی قلوبِ مردہ کے لیے روحِ تازہ ثابت
ہوئی ہیں تاہم "روحِ کامل" کا تشریف صرف قرآن ہی کو حاصل ہے اس لیے دیگر کتب سماویہ کے لیے
اگرچہ بہت سے اوصافِ عالیہ کا اطلاق ہوا ہے لیکن اُن کو روح کہہ کر نہیں پکارا گیا اور یہ قرآن
ہی ہے جس کو "روح" سے تعبیر کیا گیا کیونکہ بلاغتِ کلام کا تقاضا ہے کہ جب ایک ہی وصف
مختلف موصوف میں موجود ہو تو پھر اس کا اطلاق ایسے ہی موصوف کے ساتھ ہونا چاہیے جس میں یہ
صفت کامل و مکمل طور پر پائی جاتی ہو تاکہ امتیاز ہو سکے اور اُس کی عظمت و جلالت منصبہ شہود
پر آ سکے۔

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اگرچہ جبریل امین جو عبرانی الہیات میں ناموسِ اکبر کے نام سے
معروف ہیں اکی اہم ڈیوٹی ہی رہی ہے کہ وہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے پاس خدا کی
وحی پہنچاتے رہیں اور وہ برابر انبیاء و مرسلین سابقین کے دور میں یہ فریضہ ادا فرماتے رہے تاہم

ان میں سے کسی بھی الہامی کتاب اور الہامی صحیفہ کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے جبریل (علیہ السلام) کو "روح" کے لقب سے یاد نہیں فرمایا اور یہ صرف قرآن ہی کے لیے مخصوص قرار پایا کہ اُس کے نزول کے سلسلہ میں جب جبریل (علیہ السلام) کا ذکر آئے تو ان کو "روح" سے تعبیر کیا جائے چنانچہ شعر میں ہے "وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ" اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن کے "روح" ہونے کا اسی یہ کمال یا خصوصی امتیاز ہے کہ سورہ قدر میں بھی جبریل کو "روح" سے ہی تعبیر کیا گیا ہے "تَنْزِيلُ الْمَلَكِ وَرُوحٌ فِيهَا" اور یہ اس لیے کہ قرآن کے متعلق یہ بتایا جا چکا ہے کہ اُس کا نزول رمضان المبارک میں ہوا ہے سورہ بقرہ میں ہے "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ" اور یہ بھی ظاہر کیا جا چکا ہے کہ اُس کا نزول شب مبارک میں ہوا "خُذْ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَارَكَةٍ" اور وہ شب مبارک لیلۃ القدر ہے "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" تو ضروری ٹھہرا کہ جس ماہ میں اور جس شب میں قرآن عزیز کا نزول اولی ہوا ہے اُس کو ہر سال بطور یادگار منایا جائے اور ان تمام سعادتوں سے بہرہ اندوز ہوا جائے جو نزول قرآن کے وقت اُس کے مجد و شرف کے لیے مخصوص کی گئی تھیں تاکہ طالب حق اور جو یائے مجد و شرف اس سعادت کبریٰ سے محروم نہ رہے اور وہ تمام افضال و برکات جو سمت کر اس شب میں سما گئی تھیں ایک ایک ہو کر مردِ مومن کے قلب کا نور بن جائیں اور اُس کو حیات ابدی و سرمدی کی نعمت سے مالا مال کر دیں اور جب کہ قرآن کی ایک مخصوص صفت "روح" ہے اور اُس کے لانے والے خدا کے اپنی کو بھی اس خدمت کی بدولت "روح" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا گیا تو از بس ضروری ہوا کہ ہر سال جب بھی شب مبارک، شب قدر اپنی تمام رعنائیوں اور بے پناہ جمال آرائیوں کے ساتھ بقعہ نور بن کر آئے تو اس میں بے شمار اور ان گنت فرشتگانِ رحمت کے علاوہ خصوصیت سے "روح" جبریل (علیہ السلام) کا بھی اس صوبہ عالی کے ساتھ نزول ہوا اور "روح امین" "روح قرآن" کے ساتھ وابستہ ہو کر کائنات انسانی کے نیم مرؤ حیات اجتماعی میں روح پھونکنے کا اعلان کرے اور پکارتے کہ آج کی رات خدا کی رحمت نے "روح حق" کی یادگار منانے کے لیے مخصوص کر دی ہے کیونکہ اُس کا کلام بھی روح ہے اور لانے والا

پہنچی بھی روح“ پس کون خوش بخت و روشن سعادت انسان ہے جو آج کی شب اس ”نور علی نور“ کو مشعل ہدایت بنا کر دین و دنیا کی کامرانی و کامگاری حاصل کرے اور حیاتِ سرمدی وابدی کا جو یا یاسِ نامائیک کی موت پر قدم رکھ کر ”روح حیات“ تک پہنچ جائے۔

بلاغ | اسی لیے جب درد مند اور صالح قلوب کائناتِ انسانی کی ان توہرتوں ظلمتوں اور تاریکیوں سے گھبرا کر ”روح حیات“ کے طالب ہوئے اور انسانی فلاح و نجات کی چہار جانب تشنہ سامانی پر نظر کر کے آپ حیات کے لیے سر اسیمہ نظر آئے تو اس وقت قرآن ہی پیغامِ الہی بن کر سامنے آیا اور اُس نے ڈوبتے ہوؤں کو سہارا دیا اور وہ سب کچھ سنایا اور بتلایا جس نے ادیان و مل کی کائنات ہی کو بدل ڈالا اور مُردہ روحانیت کو حیاتِ تازہ بخشی، بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھائی اور وہ رومِ منزل کو صراطِ مستقیم پر لگا دیا، اُس نے گزشتہ قوموں کے عبرت ناک واقعات بیان کر کے ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر پیش کی، احکام دے کر انار کی کاسدِ باب کیا وعدہ و وعید پیش کر کے پاداشِ عمل کے عواقب سے آگاہ کیا، غرض پیغامِ بری کے اُن فرائض کو پوری طرح انجام دیا جو دینے والی ہستی کے نزدیک رشد و ہدایتِ عالم کے لیے از بس ضروری ہے اور ادا، فرض کے بعد یہ کہہ کر خدا کی حجت کو پورا کر دیا ”اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَنْتُمْ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا“

آج تاریخِ شاہد ہے کہ بلاشبہ اُس کا پیغام دُکھی دلوں کے لیے مرہمِ حیات، تشنہ کاموں کے لیے آبِ حیات، قنوطیوں کے لیے بشارت، گمراہوں کے لیے ہدایت، غلاموں کے لیے سبقِ حریت، احرار کے لیے درسِ موعظت، مظلوموں کے لیے عدل و نصفت، ظالموں کے لیے سرمایہٴ عبرت، غرض مجموعہ کائنات کے لیے رشد و ہدایت اور ”پیغامِ بشارت“ ثابت ہوا، چنانچہ اس حقیقت کو سورہ ابراہیم میں اس مختصر اعجازِ کلام کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔

هٰذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ وَ
یہ لوگوں کے لیے پیغام ہے اور تاکہ متنبہ ہو جائیں

لَیُنْذِرَ رُوْاِیْہٖ لَعَلَّہُمْ اَتَّقُوْا
اُس سے اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ہے، ایک ہے

إِلَهُ أَحَدًا وَلَيْدًا كَنَ
أُولَ الْأَكْبَابِ (ابراہیم)
اور تاکہ سوچ لیں عقل واسے۔

بیان | پھر قرآن کتاب ہے کہ میں ”بیان“ ہوں ”خفا“ نہیں ہوں۔ اس لیے کہ جب میں بلاغ (پیغام) ہوں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خفا اور ستر حقیقت کروں۔ یہیں جانتا ہوں کہ ”الحق مَثْرٌ“ حق کڑوا ہوتا ہے اس لیے میرا ”بیان“ ہونا ان قوموں اور ملتوں کے لیے تلخی اور ناگواری کا باعث ہو گا جن کے حالات ماضیہ اور واقعاتِ سالفہ خدا کے پیغام کے مقابلہ میں کشری اور تیزی سے جلو ہیں اور ساری داستانِ حیات بغاوت و سرکشی سے لبریز ہے بلکہ اُن کے لیے بھی باعثِ تکلیف ثابت ہو گا جو آج بھی خدا کی رشد و ہدایت کے مقابلہ میں ”صُمٌّ بُكْمٌ عُمْیٌ“ کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ”فَاسْتَجِبُوا أَلْعَنَى عَلَى الْهَدْيِ“ کو اسوہ بنائے ہوئے ہیں مگر میں قوموں اور جماعتوں کی خوشنودی و ناخوشی کے لیے نہیں ہوں اور نہ میں انسانی دماغوں کی کاوش ہوں کہ ماسوی اللہ کی رضا و غیر رضا کی بنیادوں پر اپنے پیغام کی نہاد رکھوں اور حق و صداقت کا کتمان و خفاء کر کے ”حقیقت“ کو بے حقیقت بنادوں۔ اس لیے میں ہر امر حق کے لیے ”بیان“ ہوں، احکامِ الہی کے لیے بیان ہوں، عقائد و ایمانیات کے لیے بیان ہوں اور اخلاق و اعمال سب ہی کے لیے بیان ہوں۔

کیا یہ امر مسلم نہیں ہے کہ ”الساکت عن الحق شیطان اخرس“ حق کے اظہار پر خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے ”بس جب یہ صحیح ہے تو پھر تم ایسے پیغام کے متعلق کیا تصور رکھتے ہو جو کم زور انسانوں کی جانب سے نہیں بلکہ قادرِ مطلق کی طرف سے ہے جو مرعوب اور خوف زدہ روحوں کی کیفیات کا ترجمان نہیں، بلکہ مالکِ الملک کی شہنشاہی سے وابستہ ہے اور کلامِ الہی ہے جو برتر و کتمان کے لیے نہیں آیا بلکہ ظہور و وضوح کے لیے نازل ہوا ہے اور ان ہی حقائق کے پیشِ نظر میری خصوصی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے ”بیان“ ہوں۔

وَهَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَ
اور یہ (قرآن) بیان ہے لوگوں کے لیے اور

مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ (آل عمران) ہدایت و نصیحت ہے متقیوں کے لیے۔

آیاتِ بینات بیان و وضوح کا یہی کرشمہ میری ہر ایک آیت اور ہر ایک جملہ سے عیاں اور نمایاں ہے اس لیے میں بھی ہوں اور بینات بھی اور آیاتِ بینات بھی ہوں اور ”بینہ“ بھی یعنی گو کائنات انسانی کی ہدایت کے لیے کتب سماویہ کا نزول ہوتا رہا اور انہوں نے ”ہدایت“ بن کر پیغامِ حق کا فرض انجام دیا لیکن ان سب میں یہ خصوصیت مجھ کو ہی حاصل ہے کہ معارفِ الہیہ اور احکامِ عملیہ کے متعلق جو کشفِ حقیقت اور وضوحِ بیان میں لے کر آیا ہوں یہ امتیاز دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے کہ نہ میری حقیقت میں کوئی التباس ہے اور نہ میرے احکام اور اوامر و نواہی میں کوئی ستر و خفا ہے، نہ استعارات و کنایات ہیں اور نہ اغلاق و معتمہ۔

بلاشبہ توراة ہدایت و نور ہے لیکن اس میں غوامض و مشکلات معانی کی اس قدر کثرت ہے کہ بعض جگہ اصل مسئلہ کی حقیقت تک مشتبہ ہو جاتی ہے، اس لیے ہدایت و حق کی وہ برقِ ضوئ افگن جو قرآن میں نظر آتی ہے نہیں پائی جاتی۔

اسی طرح انجیل بھی کتب سماویہ میں بلاشبہ نور و ہدایت ہے تاہم یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اُس کے مواعظ و احکام اور بصائر و امثال میں جو اغلاق اور ابہام ہے اُس نے بہت سے مقامات کے مفہیم کو خود محققینِ توراة پر مشتبہ کر دیا اور وہ حقیقتِ حال کے متعلق غلط روی میں مبتلا ہو گئے حتیٰ کہ بائبل نے ایک جگہ خود ہی یہ اقرار کر لیا ہے کہ ”مسیح نے فرمایا: میں ہر ایک بات تم سے نہ کہوں گا اور بہت سی باتیں ہیں جو کہنے کے لائق ہیں مگر وقت نہیں آیا کہ کہوں اور تمہارے پاس ”روحِ حق“ فارقلیط آئے گا جو تم سے وہ سب کچھ کہہ ڈالے گا۔“

نیر و انیال (علیہ السلام) کی کتاب میں ہے کہ یہ صحیفہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے صحیفہ ہدایت ہے مگر اس کے باوجود اُس کے اکثر مضامین رموز و اشارات کی ایک چستان ہیں جن کے سمجھنے کے لیے دماغی کاوشوں کو سخت صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی فیصلہ کن رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اور یہی حال موجودہ اوراقِ آویستا کا ہے۔

لیکن قرآن کے معانی و مفہیم کے سمجھنے سے متعلق نہ تو صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو تاریکی سے اسطہ پڑا اور نہ سلف صالحین اندھیرے میں حیران و سرگرداں نظر آئے بلکہ لغت عرب اور یاوراتِ زبان اور سیاق و سباق عبارت پر جو شخص جس قدر بصیرت رکھتا ہے قرآن اُن میں سے ہر ایک کے لیے ایک واضح بیان، ظاہر کلام، اور صاف و سادہ حقیقت بن کر ضرور انگن ہو۔ پس قرآن کا یہ دعویٰ حق ہے کہ وہ کتبِ سماویہ میں سب سے افضل و برتر ہے اور اس وصفِ خاص میں بھی ممتاز ہے کہ وہ ہدایت کے لیے ”آیاتِ بینات“ ہے اور امورِ الہیہ و روح و باطل کے امتیاز کے لیے ”آیاتِ تین المدی والفرقان“ ہے۔

شَہْرُ رَمَضَانَ الَّذِي
أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ
هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ
مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ (بقرہ)

مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن
ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیل
روشن راہ پانے کی اور حق و باطل سے جدا کرنے کی۔

(آل عمران)۔ صف۔

وَكَذَٰلِكَ أُنْزِلْنَآ آيَاتٍ
بَيِّنَاتٍ (حج)

اور یوں اتار ایم نے یہ قرآن کھلی باتیں۔

یونس، مریم، جاثیہ، سبا، نور، حدید، مجادلہ،

فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَاتٌ مِّن رَّبِّكُمْ
وَهُدًى وَذِكْرَتٌ (انعام)

سو آپ کی تمہارے پاس حجت تمہارے رب کی
طہرے اور ہدایت اور رحمت۔

متشابه | مسطورہ بالا امتیاز کو ہمیشہ نظر لا کر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر قرآن کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ ”بیان“ ”بینۃ“ ”بینات“ اور آیاتِ بینات ہے جس میں خفاء، رمز، اغلاق، اشتباہ، قطعاً موجود نہیں ہے تو پھر قرآن نے یہ کیوں کہا ہے کہ وہ ”متشابه“ ہے؟ اس لیے کہ قرآن نے ”متشابه“ کہا ہے ”متشابه“ نہیں کہا اور اگرچہ ان دونوں کا مادہ شب، ہ، ہے، تاہم دونوں کے معنی جدا جدا ہیں کیونکہ ”متشابه“ تو اس

صورتِ حال کا نام ہے جس میں کسی ایک جانب کا تعین نہ ہو سکے اور تردد و اضطراب اور قلق و انتشار اس کا لازمی نتیجہ ہے اور اس کے برخلاف متشابہ اس حقیقت کا نام ہے جس میں دو یا چند امور ایک دوسرے کے ساتھ ہم شکل و ہم صورت ہوں اور ان میں یکسانیت و ہم رنگی پائی جاتی ہو تو قرآن حکیم کتاب ہے کہ سیری تمام آیات، احکام، امثال و قصص، وعدہ و وعید، بیانِ حق و صدق مضار و منافع معاد و معاش، غرض حسن کلام اور صدق مضامین کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوی اور ہم رنگ ہیں اور جس طرح توام بچے اکثر ایک دوسرے کے ہم شکل و ہم شبیہ ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح میرے نظم و معانی کے تمام انواع مضامین و ادا میں بلیغ مشابہت پائی جاتی اور تمام و کمال یک رنگی ہویدا ہے اس لیے میرا ”بیان“ و ”بینہ“ ہونا میرے ”متشابہ“ ہونے کے خلاف نہیں ہے بلکہ مزید تائید و تقویت کا باعث ہے اور یہ بھی میرا ایک خصوصی امتیاز ہے۔

اللہ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ
كَتَبًا مُتَشَابِهًا

اللہ نے ہی اتنا سب سے اچھی بات

(قرآن کو جو ہے کتاب مشابہت رکھنے

والی۔

(باقی آئندہ)

علامہ ابن جوزی کی بلند پایہ کتاب

تلقیح فہوم اہل الاثر

فی

عیون التاریخ والتیسر

اتنے بڑے محدث کی ایسی مفید کتاب بالکل ناپید تھی۔ صرف ریاست ٹونک میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا بڑی محنت کے بعد اسے زیور طبع سے آراستہ کیا گیا اور اس طرح یہ قابل قدر کتاب وجود میں آئی۔ سیرت تاریخی میں اپنے رنگ کی عجیب غریب کتاب ہے جس کی خصوصیتوں کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتاب مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ اس میں بہت سی وہ باتیں مل جاتی ہیں جو سیرت تاریخی کی بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں یا تو ملتی ہی نہیں۔ ملتی ہیں تو بڑی دشواری کے بعد۔ قیمت صرف پانچ روپے اٹھانے

مکتبہ برہان دہلی قرویل باغ

اسباب کفر و جحود

جو قرآن مجید میں بیان ہے

تیسرا سبب۔ استکبار و استہزاء

از جناب ڈاکٹر میر ولی اللہ صاحب ایڈووکیٹ ایسٹ آباد

(۳)

کفر و جحود کے پہلے سبب یعنی تقلید آباء و اکابر وغیرہ اور دوسرے سبب یعنی اعراض کا ذکر ہو چکا
اس مضمون میں تیسرے سبب یعنی استکبار و استہزاء کا بیان مطلوب ہے، پہلے دو سبب اپنی ہمہ گیری کی وجہ
سے خطرناک ہیں، تیسرا سبب مجرمیت کے لحاظ سے ان دونوں سے زیادہ خطرناک ہے تقلید اعراض
کا مرتکب اتنا مجرم نہیں، جتنا استکبار و استہزاء کا مرتکب، تقلید اعراض کا مجرم ایک گونہ نادانستہ
طور سے شستی بے پرواہی اور غفلت کا شکار ہوتا ہے، لیکن استکبار و استہزاء کا مرتکب دیدہ و
دانستہ کفر و جحود کو ایمان و اقرار پر ترجیح دیتا ہے۔

تکبر اور ایمان کی دشمنی آگ اور روئی کی دشمنی ہے۔ ایک حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم) سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان اور تکبر ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ ابن مسعود سے روایت ہے کہ کہا کہ فرمایا رسول

صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل النار کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نہیں داخل ہوگا دوزخ

احد فی قلبہ مثقال حبۃ من میں کوئی ایسا شخص جس کے دل میں رائی کے دانہ کے

خود دل من ایمان دلا یدخل برابر بھی ایمان ہوگا، اور نہیں داخل ہوگا بہشت
 احد فی قلبہ شفا ل میں کوئی ایسا شخص جس کے دل میں رائی کے
 حبة من خود دل من کبر دانہ کے برابر بھی تکبر ہوگا۔ روایت کیا
 راہ مسلم مشکوٰۃ باب الغضب اسے سلم نے (بحوالہ مشکوٰۃ)
 والکبر الفصل الاول

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تکبر اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے
 حتیٰ کہ جس دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو، اس دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر نہیں
 ہو سکتا اسی طرح اگر کسی دل میں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی تکبر موجود ہو، اس دل میں رائی
 کے ایک دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہ سکتا۔

بظاہر بات بہت سخت ہے اور انداز بیان اس سے بھی سخت تر، یہی وجہ ہے کہ
 شارحین حدیث نے اس حدیث کی شرح میں تاویلیں کی ہیں، صاحب اشعة اللمعات نے لکھا ہے
 کہ جس شخص کے دل میں ذرہ بھرا ایمان ہو۔ وہ دوزخ میں (ہمیشہ کے لیے) داخل نہیں ہوتا۔ اور جس شخص
 کے دل میں ذرہ بھر تکبر ہو وہ (سابقین کے ساتھ) بہشت میں داخل نہیں ہوتا، مطلب یہ کہ جس
 آدمی کے دل میں تھوڑا سا ایمان بھی ہو، وہ کچھ عرصہ دوزخ میں رہ کر بہشت میں داخل ہو جائے گا۔
 ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہ سکتا اور جس آدمی کے دل میں تھوڑا سا تکبر بھی ہو، وہ جاتے ہی بہشت
 میں داخل نہیں ہو سکتا کچھ عرصہ ضرور دوزخ میں رہنا پڑے گا۔

یہ تعبیر ہر چند حدیث کے الفاظ کی ظاہری سختی کو دور کر دیتی ہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ
 میں اس تعبیر کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اگر اس حدیث کا یہی مطلب ہوتا تو ضرور ہے کہ الفاظ اور سبب
 اور طرز بیان اور ہوتا۔

حدیث کا پہلا حصہ تو بہر حال کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا، حدیث کے دوسرے حصے کا
 اگر یہ مطلب لیا جائے کہ جس شخص کے دل میں مستقل طور سے تکبر کا تھوڑا بہت مادہ موجود ہو۔ وہ

کبھی بہشت میں نہیں جاسکتا، تو اس حصے میں بھی کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ قرآن مجید میں بارہ مستکبرین کو جہنمی کہا گیا ہے۔ اور احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہے، یہ اور بات ہے کہ آدمی انسانی کمزوریوں کے زیر اثر گناہے ماسے کبر کا مرتکب ہو جائے، ایسا آدمی یقیناً بعد میں اپنے لیے پشیمان بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن جو شخص ایسا متکبر ہو، کہ تکبر اس کی فطرت ثانی بن چکا ہو، وہ ہرگز ایمان دار نہیں ہو سکتا اور کسی صورت میں بھی بہشت کا حق دار نہیں بن سکتا۔

تکبر سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اور اپنی صفات کو دوسروں کے مقابلہ میں ترجیح دے، دوسروں کو بنظر حقارت دیکھے۔ اپنے سے بظاہر کم درجے کے لوگوں کی بات کو ہنسی مذا میں اڑا دے، کلمہ حق کی تضحیک کرے اور اپنی صفات و کمالات پر اتراتا رہے۔

نسب پر تکبر ہر بات کی بنا پر تکبر ہو سکتا ہے۔ مثلاً جسمانی طاقت پر، قد و قامت پر، خوش وضعی، خوش اندامی پر، دولت پر، علم پر، اثر و رسوخ پر، کسی نوع کی سروری پر، قوم پر، خاندان پر، آبا و اجداد وغیرہ وغیرہ، لیکن سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ عام تکبر قوم، خاندان اور آبا و اجداد کی بنا پر ہوتا ہے، اقوام کی تقسیم کے لیے ہندو دنیا بھر میں بدنام ہیں۔ اسلام قومی تقسیم کو حد درجہ مذموم سمجھتا ہے۔ لیکن نہایت افسوس اور شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جہاں ہندو اس تقسیم کے ضرر رساں اثرات سے بہت حد تک مصون ہو چکے ہیں اور روزانہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہاں مسلمان اس لعنت میں بیش از بیش مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، یہ قصہ سچا ہے یا جھوٹا۔

لیکن مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت کا صحیح آئینہ بردار ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک پٹھان اپنے گاؤں کے مولوی صاحب کے پاس گیا اور پوچھا کہ ہمارے حضرت صاحب (یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) پٹھان تھے یا ہند کی۔ (پٹھان تمام غیر پٹھان اقوام کو ہند کی کہتے ہیں) مولوی صاحب نے کہہ دیا کہ ”خان صاحب آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں۔“ پٹھان نے جواب دیا کہ ”اگر آں جناب ہند کی ہوں تو (نمود باشر) ہم ان کا کلمہ پڑھنا چھوڑ دیں۔“

یاد نہیں کس صاحب نے کہا تھا لیکن کما ضرورت تھا کہ ہم اولیاء کے تذکروں میں بافت

نہ افسوں، مہل کاروں، خشت سازوں اور دیگر پیشہ وروں کے نام کثرت سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اہل بیت کے نام شاذ و نادر ہی ملتے ہیں، گویا ان صاحب کے نزدیک خدا رسیدہ ہونا صرف اہل بیت کا حق ہے، پیشہ وروں کا حق نہیں، یہ زمانہ جاہلیت کی وہی ذہنیت ہے جسے دور کرنے کے لیے اسلام نے اپنا پر از ور لکھ دیا تھا۔

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جاتی

کاندریں راہ فلاں بن فلاں چیز سے نیست

اسلام کی پیروی کا دعویٰ کر کے فلاں ابن فلاں کی بنا پر تکبر کرنا اسلام کا انکار کرنا ہے اور یہی تکبر بعض لوگوں کے لیے کفر و جحود کا باعث بن جاتا ہے۔

انسانی زندگی کی صبح اول ابھی دوپہر کے حدود میں بھی داخل نہ ہوئی تھی۔ کہ تکبر بر بنائے خاندان کی وجہ سے، انسان کے سامنے، ایک نامراد کے گھلے میں ابدی لعنت کا طوق ڈالا گیا، یہ انسان کے لیے ایک عظیم الشان اور ناقابل فراموش درس عبرت تھا۔ لیکن۔ سع وائے نہ یک بار کہ صد بار وائے، ہر حال انسان کہ اس نے بجائے عبرت حاصل کرنے کے اسی خطرناک تکبر کو اپنا خاصہ بنالیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ	اور پیدا کیا ہم نے تم کو اور صورتیں بنائیں تمہاری
فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۚ قَالَ مَا مَنَعَكَ آلَا	پھر کہا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو۔ پس سجدہ
تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۚ	کیا انہوں نے لیکن ابلیس نے نہ کیا۔ وہ سجدہ
قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ	کرنے والوں سے نہ ہوا۔ اشر نے اُسے کہا کہ
مِنْ طِينٍ ۚ	تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے منع کیا حالانکہ
	میں نے تجھے حکم دیا تھا، ابلیس نے جواب دیا
	کہ میں بہتر ہوں آدم سے۔ کیونکہ تو نے مجھے آگ
	سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے پیدا کیا۔

ایک اور مقام پر ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا
لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ
أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ
الْكَافِرِينَ ۝ (۲۱-۲۲)

اور جب کہا ہم نے فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ
کرو تو سجدہ کیا انہوں نے لیکن شیطان نے نہ کیا
نہ مانا اور تکبر کیا اور تھا کافروں سے۔

نسلی امتیاز پر تکبر کرنے کی وجہ سے کفر و جحود میں مبتلا ہونے کا یہ پہلا واقعہ ہے۔ شیطان
کی تقلید میں انسان نے بھی ”انا خیر منہ“ کہنا شروع کر دیا۔ اور قومی یا خاندانی امتیاز کی بنا پر دوسروں کو
حقیر اور ذلیل سمجھنے لگا۔ آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں فلاں قوم کا چشم و چراغ ہوں اور یہ فلاں قوم
کافر و سہ ہے۔ اس لیے مجھے اس پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ فی الواقعہ شیطان کے اس قول کو
دہرا رہا ہے کہ ”خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخُلِقْتَ مِنْ طِينٍ“ ہم سب کے لیے یہ غور کا مقام ہے کہ ہم اس
معاصلے میں شیطان کے نقش قدم پر تو نہیں چل رہے۔

انسان کا خاندان کی بنا پر تکبر کرنا شیطان کے تکبر کے مقابلے میں بہت زیادہ مذموم
ہے۔ کیونکہ شیطان تو پھر آگ سے پیدا ہوا تھا اور آدم اُس کے مقابلے میں مٹی سے پیدا ہوا
تھا۔ لیکن آدمی کا آدمی کے مقابلے میں تکبر کرنا مطلق بے معنی ہے کیونکہ تمام آدمی آدم کی اولاد
سے ہیں اور مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں سب سے اول ایمان لانے والے وہی لوگ
ہوئے ہیں جو ضعیف، مسکین اور دنیاوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کم حیثیت ہوتے تھے۔ اور
یہ بھی امر واقع ہے کہ ان ایمانداروں کو دیکھ کر امرا، رؤسا اور دوسرے صاحب وجاہت لوگ
محض اس تکبر کی وجہ سے کفر و جحود میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ ہم ایسے بے مایہ لوگوں کی جماعت
میں کیوں شریک ہوں۔

وَإِذَا مَثَلُ عَلَيْهِمْ أَیُّ شَأْنٍ یَنْتَهِیْ
اور جب پڑھی جاتی ہیں اُن پر ہماری روشن آیتیں

قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا
أَمْثَلُ الْقَرِيقَيْنِ خَيْرٌ
مَقَامًا أَحْسَنُ نَدْيًا ه ۝۱۳۰
تو کافر مومنوں کو کہتے ہیں کہ ان دو فریقوں میں
سے کون ہے بہتر مقام کے لحاظ سے اور
کون ہے بہتر مجلس میں۔

دو فریق یعنی مومن اور کافر۔ غریب مسلمانوں کو دیکھ کر امیر کافر اللہ تعالیٰ کی آیات بقیات سے محض اس
یے انکار کر دیتے تھے کہ ہم ان مسلمانوں کے مقابلے میں جاہ و ثروت کے لحاظ سے بلند تر مقام
پر ہیں اور مجالس میں ہم ان لوگوں سے زیادہ مغرر اور مکرم سمجھے جاتے ہیں۔ ہم ان کی جماعت میں
کیوں شریک ہوں۔

وَرَادَ اقِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَا
اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنْتُمْ مِّنْ
كَمَا اٰمَنَ السُّفَهَاءُ
اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلٰكِنْ
لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۰ (۱۳۰-۱۳۱)
اور جب کہا جاتا ہے انہیں کہ ایمان لاؤ جیسا
کہ اور لوگ ایمان لائے ہیں۔ تو جواب دیتے
ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ بے وقوف
لوگ ایمان لائے۔ خبردار ہو کہ یہ خود بے وقوف
ہیں۔ لیکن نہیں جانتے۔

عقل پر تکبر | یہ اپنے علم اور عقل پر تکبر ہے۔ اور اسی تکبر کی بنا پر یہ لوگ ایمان لانے سے منکر
ہو جاتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ دیکھو اور لوگ ایمان لے آئے۔ تم کیوں ایمان نہیں
لا تے۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ ایمان لانے والے لوگ ہمارے مقابلے میں کم علم اور کم عقل
ہیں ہم ان بے وقوفوں کی جماعت میں کیوں شریک ہوں حقیقت یہ ہے کہ یہ تکبر کرنے والے خود
بے وقوف ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

اپنی عقل پر تکبر کرنے والے لوگ نہ صرف دولت ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں، بلکہ اور کئی
فوائد سے بھی بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ لوگ کوئی بات سنیں گے تو اس پر محض اس لیے غور
نہ کریں گے کہ ہم کہنے والے سے زیادہ عقل مند ہیں۔ اس کی بات ہماری توجہ کی مستحق نہیں، کوئی
چیز پڑھیں گے تو اس پر تدبر نہ کریں گے۔ بدیں خیال کہ ہم خود سب کچھ جانتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا
مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَصْخَرُونَ - تحقیق وہ لوگ جو گنہ گار ہیں۔ اُن لوگوں پر جو ایمان
لائے سنتے تھے، اور جب گذرتے تھے اُن کے
وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ - پاس سے تو آنکھیں مارتے تھے۔ اور جب اپنے
وَأَذَانُفَلَبُّوا إِلَىٰ أَهْلِهِم مَّا نَكَلُوا
فَكَهَيْنَ - وَإِذَا سَأَلَ عَنْهُمْ قَالُوا
إِنَّ هَؤُلَاءِ لَفُصَّالُونَ - (۸۳-۸۴) کہتے تھے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں۔

یہ نامراد لوگوں کی عادت ہے، لوگوں پر ہنسنا، انہیں دیکھ کر آنکھیں مارنا، اور جاتے ہوئے
طرح طرح کی باتیں بنانا۔ یہ استہزا ان لوگوں کے لیے کفر و جحود کا باعث بن جاتا ہے۔
یہ روزانہ تجربے کی بات ہے کہ لوگ کوئی تقریر سن کر آئیں گے، یا کہیں وعظ کی مجلس سے
واپس آئیں گے، تو رستے میں رنگارنگ بیوہ تنقیدی کرتے تمسخر کرتے اور آنکھیں مارتے جائیں گے
کبھی بھول کر بھی جو کچھ سنا ہے اُس پر غور نہ کریں گے۔

دوزخ میں شکرتین | قرآن مجید کے اکثر مقامات سے معلوم ہوتا ہے، کہ اہل دوزخ کی اکثریت ان ہی
کی اکثریت | استکبار و استہزا کرنے والوں کی ہوگی، تقلید و اعراض کی وجہ سے گمراہ ہو جانے
والوں کے لیے تو پھر بخشے جانے کی گنجائش ہو سکتی ہے، استکبار و استہزا کرنے والے عفو و مغفرت کے
قطعا حق دار نہیں ہو سکتے، یہ لوگ بدترین قسم کے مجرم ہوتے ہیں۔

اس حدیث سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔

عن حارث بن دھب قال قال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
الّا أخبرکم باهل الجنة کل
ضعیف متضعف لو اقسو
علی اللہ لا یزکاة الا أخبرکم
حارث بن دھب سے روایت ہے کہ کہا کہ فرمایا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا میں تمہیں
اہل جنت کی خبر دوں۔ تمام ضعیف لوگ جنہیں
لوگ حقیر سمجھتے ہیں اگر وہ قسم کریں اللہ پر تو ضرور
سچا کرے اللہ اس کو۔ کیا میں تمہیں اہل دوزخ

بَٰهْلُ النَّارِ كُلُّ مُثَلِّجٍ جَوَاطِلٍ
کی خبر نہ دوں۔ تمام درشت طبع، بخیل اور تکبر
مُتَكَبِّرٍ۔ (متفق علیہ) کرنے والے۔

(مشکوٰۃ۔ باب الغضب الکبیر فصل اول)

یعنی اہل جنت کی اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جو کم حیثیت اور ضعیف ہیں اور جہنم لوگ
حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن خدا کے نزدیک ان کی اتنی قدر ہے کہ اگر وہ کسی بات پر
اصرار کریں تو خدا اُسے ضرور پورا کرے، اور اہل دوزخ کی اکثریت اُن لوگوں کی ہوگی جو درشت
طبع بخیل اور متکبر ہوں گے۔

یہی بات مندرجہ ذیل آیات قرآنی سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا
(دوزخی) کہیں گے کہ اے ہمارے رب !
وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ۔ رَبَّنَا
غالب آئی ہم پر ہماری بے نیستی اور ہم گمراہ قوم تھے
أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا
اے ہمارے رب نکال ہم کو اس سے (یعنی
فَإِنَّا ظَالِمُونَ۔ قَالَ اخْسَوْا
دوزخ سے) اگر ہم پھر ایسا کریں گے تو ظالم ہوں گے۔
فِيهَا لَا تُكَلِّمُونَ۔ إِنَّهُ كَانَ
خدا کے گا دور ہو دوزخ میں اور مجھ سے بات
فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ
نہ کرو۔ میرے بندوں میں ایک گروہ تھا جو کہتا
رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا
تھے کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے ہم کو
وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ
بخش اور ہم پر رحم کر۔ تو بڑا رحم کرنے والا ہے
الرَّاحِمِينَ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ
تم نے ان لوگوں سے تمسخر کیا حتیٰ کہ بھلا دی
سَخِرْنَا بِكُفْرِي الْاُنْسُوكُمْ ذِكْرِي
انہوں نے تمہیں میری یاد۔ اور تم اُن لوگوں پر
وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَصْحَكُونَ (۱۱۶-۱۱۷)
ہنستے تھے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ دوزخی اکثر وہی لوگ ہوں گے جو ایمان داروں پر ہنستے اور ان
کے ساتھ تمسخر کیا کرتے تھے، یہی استہزاء ان لوگوں کے کفر و جحود کا باعث بنا تھا

بَلَىٰ قَدْ جَاءُكَ إِلَيْنَا فَلَا تَبْتَ
يَهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ
مِنَ الْكَافِرِينَ . وَيَوْمَ
الْقِيَمَةِ رَٰى الَّذِينَ كَذَبُوا
عَلَى اللَّهِ وُجُوهَهُمْ مُّسْوَدَّةٌ
أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى
لِّلْمُتَكَبِّرِينَ . (۳۹-۴۰)

یوں نہیں۔ بلکہ آئیں تیرے پاس میری نشانیاں،
پس جھٹلایا تو نے ان کو اور تکبر کیا، اور تھا تو کافروں
سے۔ اور قیامت کے دن تو دیکھے گا اُن لیگوں
کو جو اشر پر جھوٹ بولتے ہیں کہ اُن کے منہ
کالے ہونگے، کیا نہیں ہے دوزخ میں متکبرین
کے لیے رہنے کی جگہ۔

عذاب دیکھ کر کافر طرح طرح کے عذر کریں گے، انہیں جواب میں کہا جائے گا کہ تم نے
خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا اور تکبر کیا، آج تمہارا کوئی عذر مقبول نہیں۔ پھر فرمایا کہ ان متکبرین کے منہ
کالے ہونگے اور دوزخ اُن کے رہنے کی جگہ ہوگی۔

قرآن مجید میں اکثر مقامات پر دوزخیوں کو اُن کا استکبار اور استہزایا دہلایا گیا ہے جس
سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جہنم کی اکثریت ان ہی متکبرین کی ہوگی۔

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُوْنِي
اَسْتَجِبْ لَكُمْ اَتًا
الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِي
سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ
اَخِيْرًا . (۴۰-۴۱)

اور کہا تمہارے رب نے کہ دعا کرو مجھ سے میں
تمہارے لیے قبول کروں گا، جو لوگ میری
عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جلدی داخل
ہوں گے دوزخ میں ذلیل ہو کر۔

معلوم ہوا کہ بعض بد بختوں کو خدا کی عبادت کرنے اور دعا کرنے سے اُن کا تکبر مانع
ہوتا ہے، یہ نامراد خدا کے آگے سر جھکانے کو بھی باعثِ عار سمجھتے ہیں، نعوذ باللہ من شرور
انفسنا، یہ شقاوت زدہ لوگ شیطان سے بھی زیادہ خبیث ہیں۔

الَّذِينَ كَذَبُوا بِالْكِتَابِ
وَهُ لَوْ جُحِلَّتْ لَهُمْ
کتاب کو اور اس چیز کو جس کے

دِيْمَا اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلًا فَاَنصَوْتَ ساتھ ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا۔ پس البتہ
 يَعْلَمُوْنَ اِذَا الْاَعْدَاۗءُ لِيْ فِيْ انہیں معلوم ہو جائے گا، جب ان کی گردنوں
 اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلِ میں طوق ہو گئے، اور زنجیریں، گھسیٹے جائیں گے
 يُسْحَبُوْنَ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي گرم پانی میں، پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔
 النَّارِ يُسْجَرُوْنَ . ثُمَّ قِيلَ پھر کہا جائے گا انہیں، کہاں ہیں وہ (معبود)
 لَهُمْ اَيُّ مَّا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ . جنہیں تم شریک کرتے تھے سوائے اللہ کے
 مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تَالِهًا اَصَلُّوْا وہ کہیں گے کہ وہ ہم سے کھوئے گئے۔ بلکہ ہم
 عَنَابِلُ لَّكَ نَكْنُ نَدْعُوْا تو اس سے پہلے (سوائے خدا کے) اور کسی
 مِنْ قَبْلِ شَيْءٍ اَكْذٰلِكَ کو پکارتے ہی نہ تھے، اس طرح گمراہ کرتا ہے اللہ
 يُضِلُّ اللّٰهُ الْكَافِرِيْنَ . ذٰلِكُمْ کافروں کو، یہ اس لیے ہے کہ تم زمین میں ناحق
 بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي خوش ہوتے تھے، اور اس لیے کہ تم اتراتے
 الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وِمَا كُنْتُمْ تھے، داخل ہو دو زرخ کے دروازوں میں ہمیشہ
 تَمْرَحُوْنَ . اُدْخِلُوْا الْاَبْوَابَ جَهَنَّمَ وہیں رہنے کے لیے، پس بُری ہے جگہ تکبر
 خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نَبَسَ مَٔتُوْى کرنے والوں کی۔
 الْمُسْكِرِيْنَ . (۴۰-۴۱ تا ۴۶)

مشرکین شرک میں اس لیے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے تکبر کی وجہ سے پیغمبروں کی تعلیم
 کو اور خدا کی کتابوں کو جھٹلاتے ہیں۔ پیغمبروں کے مقابلے میں اپنی دولت اور جاہ و ثروت پر
 اتراتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کرتے کہ ان کی موجودگی میں اور کوئی منصب رسالت سے سرفراز
 کیا جائے۔

ان آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کو پُر کرنے والے متکبر لوگ ہوں گے
 کیونکہ ان کے تکبر نے انہیں کفر و شرک میں مبتلا کر دیا تھا۔

إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الْأَشِيمِ درخت زقوم کا کھانا ہے گنہگار کا گلے ہوئے
كَأَلْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلِي
الْحَمِيمِ خَذُوهُ فَاعْتَلُوهُ إِلَى
سَوَاءِ الْحَمِيمِ ثُمَّ صُوبُوا فَوْقَ
رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ
خُذْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ

الْكَرِيمُ - (۴۷-۴۸-۴۹ تا ۴۹)

ان آیات میں جس ہولناک عذاب کا ذکر ہے اس کے مستحق وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو بہت معزز اور بہت بلند مرتبت سمجھتے ہیں اور جن کا کبر ان سے گناہ کراتا ہو اور ایمان لانے سے روکتا ہے، عذاب پر عذاب یہ کہ عین بوقت عذاب ان لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم تو بڑے معزز اور مکرم تھے، اب یہ لطف بھی اٹھاؤ۔

ذَلِكُمْ بِأَنكُمْ أَخَذْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ یہ اس لیے ہے کہ تم نے آیات اللہ سے ٹھٹھا
هَزُوا وَأَعْرَضْتُمْ عَنْ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا کیا اور دنیا کی زندگی سے تمہیں فریب دیا۔ آج
فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ
يُسْتَعْتَبُونَ - (۴۵-۴۶) کوئی عذر قبول کیا جائے گا۔

یہ خطاب ہے دوزخیوں سے، کہ تم کو دنیاوی وجاہت نے فریب دیا، اور اس غرور میں تم آیات الہی سے تمسخر کرتے رہے۔ آج تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہاری کوئی معذرت مقبول نہ ہوگی، قرآن مجید میں جا بجا دوزخیوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ تم دنیاوی دولت و ثروت کی بنا پر تکبر کرتے تھے۔ اور آیات اللہ سے استہزا۔

ذِكْرُكُمْ يُعْزِضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى
النَّارِ إِذْ هَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي
أَوْجُسِ دُنْيَاكُمْ كَمَا كَفَرْتُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ

اور جس دن بیش کیے جائیں گے کافر آگ پر (تو ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنی نیکیاں دنیا کی زندگی

حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ
مِهَا فَالْيَوْمَ تُجْرَدُونَ عَذَابُ
الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ
فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَمِمَّا
كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ (۲۰۰-۲۰۶)

”اَذہیتم طیباً انکم کی دو توجہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ تم نے دنیا میں کوئی نیک کام کیے بھی تھے۔ تو ان کا بدلہ تمہیں دنیا ہی میں دے دیا گیا تھا۔ آج تمہارے لیے صرف عذاب ہی دوسری توجہ یہ کہ تمہارے پاس دنیا میں مال و دولت اور جاہ و عزت وغیرہ کچھ اچھی چیزیں تھیں۔ تو تم ان سے دنیا میں ہی فائدہ اٹھا چکے۔ یہاں وہ چیزیں تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔

یہاں بھی قرآن مجید نے استکبار کو بغیر حق کہا ہے، بات بھی یہی ہے کہ انسان اپنی حقیقت اور حیثیت کو سمجھے تو اسے معلوم ہو جائے کہ تکبر کرنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں،

عیب است بزرگ بر کشیدن خود را وز جملہ خلق برگزیدن خود را
از مرد مکی دیدہ ببايد آموخت دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

(عبد اللہ انصاری)

باوجود یقین کے | قرآن مجید سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض نصیب لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں انکار کہ ان کے دلوں پر پیغمبروں کی تعلیم کی اور آیات اللہ کی حقیقت و صداقت روشن ہو جاتی ہے اور ایک حد تک وہ اس کی طرف مایل بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ان کا تکبر انہیں ایمان لانے سے روک دیتا ہے اور اس لیے وہ مدت العمر کفر میں مبتلا رہتے ہیں۔

وَإِذَا أَرَأَوْا لَكَ إِن يَخُذُوكَ
إِلَّا هُزُؤًا هَٰذَا الَّذِي بَعَثَ
اللَّهُ رَسُولًا - إِنَّ كَاذِبِينَ
اور جب تجھے دیکھتے ہیں تو تجھ پر تمسخر کرتے ہیں اور
بس (اور کہتے ہیں کہ) ”کیا یہی ہے جس کو خدا نے
پیغمبر بنا کر بھیجا۔ نزدیک تھا کہ یہ ہم کو ہمارے

عَنْ اِلَهِنَا لَوْلَا اَنْ صَبَبْنَا
عَلَيْهَا وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حَاجِنَ
يُؤَدُّنَ الْعَذَابَ مَنْ اَصْلُ
سَيِّئًا - (۲۵-۲۶) ہوا۔

شرع میں خطاب ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ کفار جب آنحضرتؐ کو دیکھتے
اور اُن کی باتیں سنتے تو اُن پر تسخر کرتے اور کہتے کہ دیکھو ہم پر خدا نے کس کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ کوئی شہر کا
رئیس اور دولت مند شخص ہوتا تو بات تھی۔ اس شخص کی کیا حیثیت ہے کہ یہ ہمارا پیغمبر بنے۔ یہ
ان بد بختوں کا تکبر تھا۔ جو اُن سے یہ باتیں کہلو انا تھا۔

دوسری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا
ان لوگوں پر اثر بھی ہو جاتا تھا اور وہ دل میں توحید کے قائل بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن اُن کا تکبر انہیں
ایمان لانے سے روکتا تھا، اور اس لیے وہ اپنے جھوٹے معبودوں کی پرستش محض ضد کی وجہ سے
نہیں چھوڑتے تھے۔

ثُمَّ جَاءَهُمْ اَيُّهَا مُبْصِرَةٌ
قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ -
وَبِحَدِّ وَاِبْهَاءِ اسْتَيْقَنَتْهَا
اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا اَنَّا نَظُرُ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُفْسِدِينَ - (۲۶-۲۷) پس دیکھ کہ مفسدین کا کیا انجام ہوا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چند نشانیاں (یعنی معجزات) دے کر فرعون
اور اُس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اور آنحضرتؐ نے ان لوگوں کو وہ نشانیاں دکھائیں، تو ان کے دلوں
کو ان نشانیوں کی صداقت کا یقین آگیا۔ لیکن تکبر کی وجہ سے انہوں نے ان معجزات کو جادو کہہ کر

ان کا انکار کر دیا۔
یہ شقاوت کی بدترین مثال تھی۔ آج اگر ہم بھی ٹھنڈے دل سے سوچیں تو معلوم ہو جائیگا
کہ بارہا ہم نے کئی ایسی نئی باتیں سنیں جن کی صداقت کا ہم کو یقین ہو گیا، لیکن ہم نے محض ضد اور تکبر
کی وجہ سے انہیں رد کر دیا۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک متکبر لوگ انبیاء علیہم السلام
کی تعلیم و تبلیغ سے اور آسمانی کتابوں سے بدیں وجہ مستفیض نہ ہو سکے کہ وہ ہمیشہ پیغمبروں کی
تحقیر کرتے رہے اور استکبار و استہزاء سے پیش آتے رہے۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي
لِيَلَاذَ هَٰؤُلَاءِ - فَلَمْ يَزِدْهُمْ
دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا - وَإِنِّي
كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِيَتَغَفَّرَ لَهُمْ
جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ
وَاسْتَغْشَوْا شِيَاءَهُمْ - وَاصْطَرُّوا
وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا

کپڑے اوڑھ لینے سے مراد یہ تھی کہ اس بات کا ہم پر اثر نہ ہو۔ ایک آدمی بات کرے
اور دوسرا کانوں میں انگلیاں ڈال لے اور کپڑے اپنے ارد گرد لپیٹ لے، تو یہ بھی بات کرنے
والے کی تحقیر اور اپنے تکبر کا اظہار ہے اور مسخر کرنا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ضد پر قائم رہنا یعنی کفر پر اصرار کرنا بتاتا ہے کہ ان
لوگوں کے دلوں پر پیغمبر کی تعلیم کا اثر ہو گیا تھا۔ لیکن محض ضد اور تکبر کی وجہ سے وہ ایمان نہ لائے

وَأَتَسْمِعُوا بِاللَّهِ جَهْدَ آيْمَانِهِمْ
لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ

اور انہوں نے اللہ کی قسم کھائی۔ اتنی سخت قسم،
کہ اگر آئے اُن کے پاس ڈرانے والا۔ تو وہ

أَهْدَى مِنْ إِيَّاهُ الْإِسْلَامُ هراست سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے اور
فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا ذَاقَهُمْ جَبَّ آيَاتُ أَنْ كَسَرَتْهُمُ وَاللَّهُ تَوَّالٍ لِي أَنْ كِي
إِلَّا نَفُورًا - اسْتَكْبَارًا فِي بَيْتِهِ بِيَرَارِي زِيَادَةً هَوَتْ - زَمِينَ مِثْلَ كَرْنِ أَوْرُبَرِي
الْأَرْضِ وَمَكْرُ السَّيِّئِ . تَجَوِّزِينَ كَرْنِ كِي وَجْهَ سَ -

دنیا ہمیشہ اس انتظار میں رہتی ہے کہ ع مردے از غیب بردن آید و کارے بکند۔ لیکن
تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی کوئی مرد خدا پیدا ہوا۔ تو اہل دنیا نے اس کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر اٹھا
نہ رکھی۔ صد ہا مردانِ خدا کو لوگوں نے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائیں اور صد ہا کو قتل کیا۔ اہل
زمانہ کی یہ روش صرف پیغمبروں اور دوسرے مذہبی راہنماؤں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ مختلف
علوم و فنون کے ہزار ہا استادانِ کامل بھی اسی سلوک کا شکار ہو گئے۔ ایسے تمام واقعات کی
ذمہ داری عموماً معاصرانہ حسد، تکبر اور بداندیشی کے جذبات پر ہی رہی ہے۔

يَحْسِرَةٌ عَلَى الْبَيَادِ قَايَا يَتَمَمُّنْ افسوس ہے بندوں پر۔ اُن کے پاس کبھی کوئی
رَمُولُ إِلَّا كَأَنَّهُمْ يَكْتُمُونَ رَمُولُ نہیں آيا کہ انہوں نے اس کے ساتھ

تسخیر نہ کیا ہو۔

(۳۶ - ۳۰)

انبیاء (علیہم السلام) | اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ لوگ استکبار
پرستہ استہزا سے پیش آتے رہے۔

وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْ بِرُسُلِ مَرْتُ تجھ سے پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی ٹھٹھا کیا گیا
تَبْلَاكَ فَخَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا ان میں سے ٹھٹھا کرنے والوں کو اُس چیز نے
مِنْهُمْ مَّا كَانُوا بِهِ گھیر لیا۔ جس کے ساتھ وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔

يَسْتَهْزِءُونَ (۶ - ۱۰)

یہ خطاب ہے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ کفار ان سے بھی تسخیر کیا کرتے
تھے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرت کی تسلی کے لیے کہتا ہے کہ یہ سلوک صرف آپ سے نہیں کیا جا رہا

بلکہ آپ سے پہلے بھی تمام پیغمبروں کے ساتھ متکبر لوگ یہی سلوک کرتے چلے آئے ہیں، اور مزید تسلی کے لیے یہ بھی کہا کہ ان لوگوں کا انجام دردناک ہوا۔ اور جس چیز سے انہیں پیغمبر ڈراتے تھے اور جس چیز سے وہ تمسخر کیا کرتے تھے آخر کار وہی چیز ان کو پیش آئی۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ اور جب آئے اُن کے پاس اُن کے پیغمبر
نَزَّ حُورًا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ روشن دلیلیں لے کر تو خوش ہوئے وہ اُس علم
وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ پر جو اُن کے پاس تھا۔ اور گھیر لیا اُن کو اُس
يَسْتَهْزِؤْنَ (۸۳-۸۴) چیز نے جس کے ساتھ وہ ٹھٹھے کرتے تھے۔

یہ مثال ہے اپنے علم اور اپنی عقل پر تکبر کرنے اور تکبر کی وجہ سے ہر نئی چیز پر استہزا کرنے کی۔ ذبیح انسانی آج تک اس لعنت میں مبتلا ہے۔ ہر آدمی اپنے علم اور اپنی عقل کو کامل سمجھتا ہے اور یہ گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اور آدمی اس سے عالم تر یا عاقل تر ثابت ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کوئی ایسی نئی چیز سن لیتے ہیں جو ہمارے علم یا ہماری عقل کے مسلمات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ تو ہم بغیر تامل و تدبر کے اس چیز پر مقدمہ لگا کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ علما کا حسد اور تکبر علم کی ترقی کے راستے میں سب سے زیادہ خطرناک رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيِّ فِي الْأَوَّلِينَ اور کتنے پیغمبر بھیجے ہم نے پہلی قوموں میں۔ اور
وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ جب بھی کوئی پیغمبر اُن کے پاس آتا تھا۔ وہ
يَسْتَهْزِؤْنَ - (۸۳-۸۴) اُس سے ٹھٹھا کرتے تھے۔

ان آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ متکبرین نے ہر نبی کا استقبال استہکار و استہزا سے کیا۔ ظالم انسان خدا کے مقابلے میں بھی تکبر کرتا ہے۔ پیغمبر اس کے تکبر سے کس طرح بچتے۔

ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ پھر بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی ہارون
بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ - إِلَىٰ فِرْعَوْنَ کو اپنی نشانیوں اور ظاہر معجزوں کے ساتھ۔
وَمَلَائِكَةٍ فَاسْتَصْبَحُوا فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف۔ پس

وَكَانُوا أَقْوَمًا عَالِينَ انہوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔ انہوں
فَقَالُوا إِنَّا نُوْثِرُ مِنْ لِبَشَرٍ يِّنِ نے کہا کیا ہم ایمان لائیں اپنی طرح کے درد آدمیوں
مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ پر۔ حالانکہ ان کی قوم کے لوگ ہماری بندگی کرتے
(۲۳-۲۵ تا ۲۷) ہیں۔

ان آیات سے چند درجہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بھائی فرعونوں کے پاس گئے تو آیات الہی اور
سلطانِ مبین کے ساتھ گئے۔ ان نشانیوں اور معجزات کو دیکھ کر کوئی آدمی اُن کا منکر
نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک آیت سے جو پہلے اسی مضمون میں لکھی جا چکی ہے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون
بھی اُن آیات اور معجزات کے دل سے منکر نہ تھے۔

(۲) فرعونوں کا انکار محض تکبر کی وجہ سے تھا انہوں نے کہا کہ موسیٰ اور ہارون ہماری طرح کو
دو آدمی ہیں اور آدمی بھی اُس قوم کے جو ہماری رعایا ہیں۔ ہم کیوں ان کو خدا کا پیغمبران کران پر
ایمان لے آئیں۔

تو دل خود را دے پنداشتی
جستجوئے اہل دل بگذاشتی

رومی

انسان کی یہ بڑی خطرناک کمزوری ہے کہ وہ ہر کسی کو اپنے برابر بلکہ اپنے کم تر سمجھتا ہے اور اسی لیے
وہ ہزار ہا فیوض و برکات سے محروم رہتا ہے۔
(۳) تکبر کرنا سرکش لوگوں کا کام ہے۔

(۴) قومِ مانا عابدون۔ یہ تو ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم یعنی بنی اسرائیل فرعونوں
کی رعایا تھے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ فرعون یا فرعونوں کی عبادت نہیں کرتے تھے یعنی اُن
کے عابد نہ تھے۔ باوجود اس کے کہا گیا کہ قومِ مانا عابدون۔

اس سے لفظِ عبادت کے معنوں پر روشنی پڑتی ہے اور ہماری حالت پر بھی۔ کیا

انگریز ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ ”لنا عابدوں“ پھر ہماری ”ایک نعبہ“ اور ”ایک ستعین“ کی حقیقت اور صداقت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

چناں دین و دنیا بہم دیگر ند
تو گوئی کہ در زیر یک چادر اند
(فردوسی)

توت پر اِنَّمَا عَادُ نَاسُ تَكْبَرُ وَ اِنِ
تکبر اَلْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ دَقَالُوا
مَنْ اَشَدُّ مَنَاقُزَةً اَوَّلَهُمْ
يَوْمَ اَنَّ اللّٰهَ الْكَافِي
خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ دَقَالُوا
بِاٰتِنَا يَحْجُدُ وَنَ (۱۵-۳۱)

پس جو تھے عاد، تکبر کیا انہوں نے زمین میں بغیر
حق کے۔ اور کہا کہ کون ہم سے قوت میں زیادہ
ہے کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا جس نے
انہیں پیدا کیا ان سے قوت میں زیادہ ہے اور
وہ ہماری آیات سے انکار کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ قوم عاد کے لوگ بڑے تداد اور طاقت ور ہوتے تھے، انہوں نے اپنی جسمانی
قوت پر تکبر کیا اور اس وجہ سے وہ آیات الہی سے کفر و جحود کے مرتکب ہوئے۔
قرآن مجید نے جا بجا تکبر کو بغیر حق کہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو گو وہ اپنی
صفات میں کتنا ہی کامل ہو، تکبر کرنے کا حق حاصل نہیں، قرآن کریم نے جا بجا آفرینش آدم اور
تخلیق بنی آدم کی تفصیلات اور مراتب کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے تاکہ انسان اپنی حقیقت
اور حیثیت پر غور کرے اور تکبر کرنے کی جرأت نہ کرے، مگر آدمی ہے کہ کبھی اپنی ماہیت کی طرف متوجہ
ہی نہیں ہوتا اور بات بات پر اتر اترتا رہتا ہے۔

آیات الہی سے ہمارے اندر اور ہمارے باہر چاروں طرف ہزاروں لاکھوں آیات الہی ہر وقت
تکبر اور استہزاء موجود رہتی ہیں، ہم میں سے اکثر تو ان آیات سے اعراض کرتے ہیں لیکن بعض شقاوت
زدہ انسان بوجہ تکبر کے استہزاء کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان آیات پر ہنستے اور ٹھٹھکے کرتے
ہیں۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ يَسْمَعُ
 آيَاتِ اللَّهِ تُنْزِلُ عَلَيْكَ نُورٌ يُّصِرُّ
 مُسْتَكْبِرًا كَانَتْ لَهُ أَلْسِنَةٌ
 نَبِّشِرُهُ بَعْدَ آيٍ إِلَيْهِ وَإِذَا عَلِمَ
 مِنْ آيِنَا شَيْئًا تَخَذَّهَا هُزُؤًا
 أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
 مُّهِينٌ - (۲۵-۲۷ تا ۲۹)

افسوس ہے ہر جھوٹ باندھنے والے گنہگار پر۔
 سنا ہے اللہ کی آیات جو پڑھی جاتی ہیں اس پر۔
 پھر اصرار کرتا ہے (کفر پر) تکبر کرتے ہوئے۔ گویا
 کچھ سنائی نہیں، پس اس کو دردناک عذاب کی
 خبر دے اور جب ہماری آیات سے کچھ معلوم
 کر لیتا ہے تو اس پر ہنسا کرتا ہے، ایسے لوگ
 ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

باوجود آیات اللہ کے سننے اور دیکھنے کے بعض آدمی محض تکبر کی وجہ سے کفر پر اڑے رہتے
 ہیں۔ تکبر یہ کہ ان آیات کا سننا والا ہماری ہی طرح کا آدمی ہے بلکہ ہم سے بھی کم حیثیت ہے۔ ہم اس
 کی بات کیوں مانیں، فی الواقعہ ایسے لوگ ہی دردناک اور رسوا کن عذاب کے مستوجب ہیں، تقلید
 اور اعراض کی وجہ سے گمراہ ہونے والے لوگوں کو اتنا سخت عذاب نہ ہوگا۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
 فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ذَٰلِكَ
 هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ - وَأَمَّا الَّذِينَ
 كَفَرُوا أَفَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُنْزِلُ عَلَيْكُمْ
 فَأَسْتَكْبِرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا
 مُّجْرِمِينَ (۲۵-۳۰ و ۳۱) تم سے۔

پس جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے انہیں
 ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا یہ
 کامیابی ہے ظاہر اور وہ لوگ جو کافر ہوئے۔
 (انہیں کہا جائے گا کہ) کیا تم پر میری آیات نہیں
 پڑھی جاتی تھیں۔ پھر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ
 تھے۔

یہ قیامت کے دن کا ذکر ہے۔ دوزخ میں داخل ہونے والے کافروں سے کہا جائے گا۔

کہ باوجود میری آیات سننے کے تم لوگ اپنے تکبر کی وجہ سے مجرم بنے رہے، قرآن مجید کے ایسے تمام
 مقامات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل دوزخ کی اکثریت مستکبرین کی ہوگی۔ تکبر فی الواقعہ شیطانی
 کام ہے اور شیطان تکبر کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رحمتِ خداوندی سے محروم ہو گیا۔ پس اگر انسان

آیات و احکام الہی کے مقابلے میں استکبار و استہزاء کا مرکب ہو تو اسے بھی اپنا انجام معلوم ہونا چاہیے

سَاوَرْتُ عَنْ آيَتِي الذِّينَ
يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ
وَأَنْ يَرْكُودَ أَكْلَ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُونَ
بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ
لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا
سَبِيلًا غَيْرَ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا
ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَ
كَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ (۱۴۶-۴) رب

قرآن مجید کی اس آیت میں نفسیات انسانی کا ایک عجیب نکتہ بیان ہوا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بد نصیب آدمی ایسے ہوتے ہیں جن پر کسی اچھی بات کا اثر نہیں ہوتا، بُری بات کو دوسرے ہی دیکھ کر اسے قبول کر لیتے ہیں۔ نیکی کی طرف اُن کی طبیعت کبھی مایل نہیں ہوتی لیکن بدی کی طرف بے تحاشا چلے جاتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی سرشت میں ہی نیکی کی طرف سے نفرت اور بدی کی طرف رغبت و دیوت کی گئی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ نامراد لوگ اپنی اس روش پر مجبور محض ہیں اور اسی روش پر یہ پیدا کیے گئے ہیں گو یا ایک گونہ انہیں اپنے اعمال و افعال کا ذمہ وار ہی نہیں سمجھا جاتا۔

سنسکرت کا ایک مقولہ ہے ”پنگہ سمارگ چارے۔“ کپتھ و ہارے تو جنگھالہ یعنی بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انہیں راہِ راست پر چلنا پڑے تو لنگڑے ہو جاتے ہیں اور غلط راستہ ہو تو اُن کی ٹانگیں لمبی ہو جاتی ہیں۔ یعنی بہت تیز چلنے لگ جاتے ہیں۔

آیت بالا میں انہی لوگوں کا ذکر ہے۔ کہا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ تمام تر آیات الہی کو بھی دیکھ لیں تو کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اگر انہیں سیدھے راستے پر چلنا پڑے تو چلنے سے انکار کر دیتے ہیں

لیکن اگر گمراہی کا راستہ دیکھ پائیں، تو فوراً اس پر چل پڑتے ہیں۔

اگرچہ شروع آیت میں کہا گیا ہے کہ ”میں اپنی نشانہوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا“ یعنی میں ان لوگوں میں یہ توفیق ہی نہ چھوڑ دوں گا کہ وہ میری نشانہوں سے فائدہ اٹھائیں اور صحیح راستے پر چلیں۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان لوگوں کی گمراہی کا باعث خدا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی گمراہی کا اصلی باعث بڑی وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے وہ باعث یہ ہے کہ

(۱) یہ لوگ آیات الہی سے غفلت کرتے ہیں یعنی اعراض کرتے ہیں، اُن کو دیکھتے ہیں اور اُن پر توجہ نہیں کرتے۔ اور بعض صورتوں میں

(۲) بغیر حق کے تکبر کرے ہیں اور اس تکبر کی وجہ سے آیات الہی کی تکذیب کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

(۳) اعراض اور تکبر اُن کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور اس طرح آیات الہی سے فائدہ اٹھانے کی طاقت اور توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ۔

(۴) یہ لوگ ہمیشہ غلط راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ اور صراطِ المستقیم کو کبھی اختیار نہیں کرتے۔

اسباب و نتائج کا یہ تسلسل ایک قانونِ الہی ہے۔ چونکہ یہ نتائج قانونِ الہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اس لیے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ نتائج خدا نے پیدا کیے ورنہ حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔

یہاں بھی آپ نے دیکھا کہ تکبر کو بغیر حق کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ایسا ہی آیا ہے۔ اس مضمون میں اس کی کئی مثالیں آپ پڑھ چکے ہیں۔ تکبر کے ساتھ بغیر حق کے تکرار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ، تکبر کسی صورت میں جائز نہیں۔

34081

وَإِذَا نُتِلَىٰ عَلَيْكَ فَلْيَنْصِتْ ۚ
مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا

اور جب پڑھی جاتی ہیں اس پر ہماری آیات تو
دہ تکبر کرتے ہوئے پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ گویا کہ اس نے

كَانَ فِي أذُنَيْكَ وَقَرَأْتَ فِيهِ
يَعَذَابُ الْيَوْمِ
(۳۱-۴)

کچھ سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کانوں میں بوجھ ہے۔ پس خوش خبری دے اس کو دردناک عذاب کی۔

بجاد لہ بغیر علم | ایک اور مقام پر ہے
إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ
اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ
فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرًا مَّا هُمْ
بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ
(۴۰-۵۶)

جو بگ جھگڑا کرتے ہیں اللہ کی آیات میں بغیر کسی ایسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو۔ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان کے دل میں تکبر ہے اور وہ اس تک پہنچنے والے نہیں پس خدا کی پناہ لے۔ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کے متعلق ہے جو بغیر علم اور دلیل کے آیات اللہ کے متعلق بحثیں کرتے ہیں۔ اور ان کو جھٹلاتے ہیں۔ ان کے اس طرز عمل کی وجہ ان کا یہ تکبر ہے کہ ان آیات کا سُنانے والا ہماری طرح کا ایک آدمی ہے۔ ہم اس کی پیروی کیوں کریں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ان کا یہ تکبر بے وجہ ہے۔ وہ بھی آیات کے سُنانے والے (یعنی پیغمبر) کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتے۔

ہم بسا اوقات کئی باتوں کو جو ہم سُنتے ہیں یا پڑھتے ہیں۔ محض اس لیے رد کر دیتے ہیں کہ کہنے والا یا لکھنے والا ہم سے بڑا آدمی نہیں۔ یہ تکبر ہمارا علمی ترقی کے راستے میں ہمیشہ سببِ راہ بن رہا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ
فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا
هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُبِينٍ
اور لوگوں میں کوئی آدمی ایسا ہوتا ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے بغیر علم کے بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے موٹر

ثَانِي عَظِيمٌ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ يَتَا هِيَ شَانِئَةٌ كُتَاكَ كُغْرَاهُ كَرَسَ

(سُورَةُ ۲۲ - ۹۸) (لوگوں کو) خدا کی راہ سے

شانہ موڑ لینا تکبر کی نشانی ہے۔ کئی آدمی کوئی بات سُنتے ہیں تو مُنہ بنا کر شانہ موڑ لیتے ہیں

اس سے بات کی اور بات کہنے والے کی تحقیر مراد ہوتی ہے۔

بعض آدمی خدا کی ذات میں بحث کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ ان کے پاس علم ہوتا ہے نہ

ہدایت نہ دلیل اور نہ کوئی کتابی سند۔ یہ لوگ بحث میں فریقِ ثانی کی اور اُس کی بات کی

تحقیر کرتے ہیں اور بس۔ یہ تکبر نہیں، ہادی اور مصلح کے مقابلے میں کیا جاتا ہے۔

توحید کا انکار | مشرکین بُت پرستی محض اس لیے نہ چھوڑ سکے کہ انہوں نے پیغمبروں اور
برہنہ و استکبار | ہادیوں کی تحقیر کی یہ اُن کے تکبر کا نتیجہ تھا۔

إِنَّا كَذَّبْنَاكَ بِأَنْتَ بَشَرٌ مِثْلُنَا نَحْنُ خَلْقُ الْبَشَرِ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ

اِنَّمَا كَانُوا إِدْرَاهِيلَ لَهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ وَيَقُولُونَ

أَيُّ الْتَّارِكُوا إِلَهَ الْبَشَرِ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ

بَشَرٌ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ

بَشَرٌ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ مِثْلُ بَشَرٍ

نبی کی تحقیر کی اور اُسے شاعر اور مجنون کہا۔ یہ ان کا تکبر تھا۔ اگر وہ متکبر نہ ہوتے تو نبی کی

بات پر غور کرتے۔ اور ایمان لے آتے۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ تمام ہادی، مجدد اور مصلح بھی اسی

سلوک کا شکار ہوتے رہے۔ علمی ذہن میں دیکھیے مختلف علوم و فنون کے کتنے محقق اُن معارف

و حقائق کے لیے جنہیں دنیا آج ہیج مانتی ہے متکبر انسان کے ہاتھوں اذیتیں اٹھا اٹھا کر مرے۔

إِلَهُكُمْ إِلَهُ وَاحِدٌ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ

مُنْكَرًا وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ - اور وہ تکبر کرنے والے ہیں۔ یقیناً اللہ جانتا ہے

لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا
يُسرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ إِنَّهُ لَا يُغِيبُ
الْمُسْتَكْبِرِينَ - وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ
مَاذَا أُنزِلَ رَبُّكُمْ قَالُوا سَاطِرُ
الْأَوَّلِينَ (۱۶-۲۷ تا ۲۸) ہیں اگلے لوگوں کی۔

جو لوگ توحید کو اور آخرت کو نہیں مانتے اُن کے دل اس لیے منکڑ ہیں کہ وہ متکبر ہیں اسی
لیے اللہ متکبرین کو پسند نہیں کرتا۔ یہ لوگ تکبر کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو شاعر اور مجنون اور ساحر
وغیرہ کے لقب دیتے ہیں۔ اور تکبر ہی کی وجہ سے خدا کی کتاب کو اساطیر الاولین کہہ کر پس پشت
ڈال دیتے ہیں۔

استکبار و استغناء جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے مستکبرین کے قوتِ فکر یہ عقلیہ تکبر پر اصرار
باعث سلبِ قویٰ کرنے کی وجہ سے سلب ہو جاتے ہیں اور اسی لیے اپنے علم اور عقل سے کچھ
فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

وَلَقَدْ عَلَّمْتُمُ النَّامُوسَ لَكُمْ
فَبَدَّلْتُمْ آلِهَاسَكُمْ سَمْعًا وَابْصَارًا
وَأَنْفِدَآءَ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ
وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَنْفِدُهُمْ
مِنْ شَيْءٍ لَّذَآكَ تَوَاصَوْا بِمُحَدِّثِينَ
الَّذِينَ خَفَىٰ بِهِمْ مَا كَانُوا بِآيَاتِ
يَسْتَهْزِئُونَ (۳۶-۳۷)

اور قدرتِ دی ہم نے ان کو اس چیز میں جس میں
تمہیں قدرت نہ دی۔ اور دیے ہم نے انہیں کان
اور آنکھیں اور دل (دماغ) لیکن ان کے کانوں
آنکھوں اور دلوں نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ کیونکہ
وہ جھگڑتے تھے آیاتِ اشریں اور گھیر لیا انہیں
اس چیز نے جس کے ساتھ وہ تمسخر کرتے تھے۔

یہ قوم عاد کا ذکر ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے تم سے زیادہ دولت و ثروت اور طاقت عطا کی
تھی، انہیں کان دیے آنکھیں دیں اور عقل دی۔ لیکن ان لوگوں کو نہ ان کے کانوں نے فائدہ دیا۔

نہ آنکھوں نے اور نہ قوائے عقلی و فکری نے۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کے مقابلے میں اپنی دولت و ثروت کی بنا پر تکبر کیا اور جن چیزوں سے وہ انہیں ڈرتے تھے اُن پر تمسخر کیا اور آیات اشریہ پر غور کرنے کی بجائے انہوں نے ان سے انکار کیا اور اُن کے متعلق جھگڑتے رہے لیکن آخر کار انہیں عذاب الہی نے آگھیرا۔

اَدَّٰلٰہٗ سَیِّدُوْۤا فِی الْاَرْضِ
فَیَنْظُرُوْۤا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کَانُوْۤا اَشَدَّ
مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارًا فِی الْاَرْضِ
عَمْرُوْہَا اَکْثَرُ مِمَّا عَمْرُوْہَا و
جَاۤءَتْهُمْ مِّنْ سُلُوْۤسٍ بِالْبَیِّنٰتِ
فَمَا کَانَ اللّٰہُ لَیْظِلِّہُمْ وَّلٰکِنْ
کَانُوْۤا اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ
ثُمَّ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ اَسَآءُۤا
السُّوْاۤی اَنْ کَذَبُوْۤا
بِآیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْۤا بِہَا
یَسْتَمْتَحِنُوْنَ۔ (۳۱-۱۰۹)

ان آیات میں چند درجہ نکات بیان ہوئے جو قابل غور ہیں۔

(۱) اولم سیروا۔ دنیا کی سیر ضروری ہے۔ کیونکہ تکمیل ایمان کے لیے اور وسعت نظر پیدا کرنے کے لیے جو تعلیم سیر سے حاصل ہوتی ہے وہ کسی استاد سے نہیں مل سکتی لیکن آنکھیں بند کر کے سیر کرنا بے سود ہے۔

(۲) کانوا اشد منہم۔ گزشتہ قوموں کی تاریخ کا مطالعہ ایک بہت بڑا درس عبرت ہے۔ جو

از دیاد ایمان کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

(۳) فاما کان۔ یہ اصل اصول ہے کہ انسان کے عقاید و اعمال کی ذمہ داری تمام تر خود اس پر ہے۔ خدا کسی آدمی کو نہ بالجبر مومن بناتا ہے اور نہ کافر نہ اچھا بناتا ہے اور نہ بُرا۔ اس لیے کہا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ بندے اپنی جان پر خود ظلم کرتے ہیں، جیسا کہ آپ پڑھ چکے۔ اپنی جان پر ظلم کرنے کے یہی تین ذریعے ہیں۔ پہلا تقلیدِ آباء و اکابر وغیرہ۔ دوسرا اعراض، اور تیسرا اشتکاء و استنزاء۔

(۴) ان لوگوں کے پاس پیغمبر بھی آئے اور آیاتِ بینات کے ساتھ آئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ کافر رہے اور بُرے کام کرتے رہے۔ وجہ تھی کہ انہوں نے تکبر کی وجہ سے آیاتِ الشریٰ کی تکذیب کی اور ان کی سنہی اڑاتے رہے۔ تکبر پر اصرار کرتے کرتے ان کی قوائمی فکر یہ جن کے ذریعے وہ آیاتِ الشریٰ سے فائدہ اٹھا سکتے تھے بالکل فنا ہو گئیں۔

معجزہ سببی کفار عموماً پیغمبروں سے طرح طرح کے معجزے طلب کرتے رہے۔ آیاتِ ذیل سے نکتہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ طلبی بھی تکبر کی وجہ سے تھی۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ مِنْ
الْمُرْسَلِينَ إِلَّا أَنْهُمْ لِيَاكُلُوا
الطَّعَامَ وَيَكْسُونَ فِي الْأَسْوَاقِ
وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً
أَتَصْبِرُونَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا
وَقَالَ الَّذِينَ يَرْجُونَ لِقَاءَنَا
لَوْلَا أُرِّلْ عَلَيْنَا الْمَسْكِينَةُ أَوْ
رَأَىٰ بَنَاتُنَا لَعَنَّا لَوْ أَفِي أَنْفُسِهِمْ
وَعَمَوْعَتُوا أَكْبَرًا (۲۵-۲۰-۲۱)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا
جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے
نہ ہوں اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کیلئے
آزمائش بنایا کہ کیا تم صبر کرتے ہو اور تیرا رب
دیکھنے والا ہے، جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں
رکھتے تھے انہوں نے کہا کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ
اتارے گئے یا ہم دیکھ لیں اپنے رب کو۔ تحقیق
لوگوں نے اپنے دلوں میں تکبر کیا اور سرکشی کی بڑی
سرکشی

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ شخص ہماری طرح کا ایک آدمی ہے، ہماری طرح کھانا کھاتا ہے اور ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ایسا آدمی خدا کا رسول کیسے ہو سکتا ہے، ہم کیوں اس کی پیروی کریں اور کیوں اس کی باتوں پر یقین کریں، یہ ان لوگوں کا تکبر تھا، کہ اپنے آپ کو پیغمبر کا ہم پایہ خیال کیا یہ پیغمبر کے مقابلے میں تکبر تھا، ان لوگوں نے خدا کے مقابلے میں بھی تکبر کیا اور اپنی پسند کی نشانیوں کا خدا سے مطالبہ کیا، کہ یا خود خدا ہمارے سامنے آئے یا کم از کم اپنے فرشتے ہمارے پاس بھیجے، کیونکہ ہم اپنی طرح کے ایک آدمی پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کی ان باتوں کو استبکار کہا اور بدترین قسم کی سرکشی، اگر یہ لوگ متکبر نہ ہوتے اور پیغمبر کی باتوں پر غور اور تدبر کرتے تو ضرور ایمان لے آتے کسی آدمی کی بات پر محض اس لیے غور نہ کرنا کہ یہ بھی ہماری طرح کا آدمی ہے، ہم سے طاقت میں زیادہ نہیں، ہم سے علم میں زیادہ نہیں، ہم سے دولت میں زیادہ نہیں، یقیناً تکبر ہے، اسی تکبر سے بے شمار آدمی گمراہ ہوئے اور بے شمار آدمی اپنے علم میں اضافہ کرنے سے محروم رہے۔

تکبر باعث از دیادگناہ

بعض بد بخت آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر تکبر کی وجہ سے نصیحت کا الٹا اثر ہوتا ہے صرف یہ نہیں کہ وہ تکبر کی وجہ سے نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہوتے بلکہ جس چیز سے انہیں ناصح منع کرتا ہے اس کا اور زیادہ ارتکاب کرتے ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ
أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ
فَحَسْبُ جَهَنَّمَ وَلَبِئْسَ
الْمِهَادُ

اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ ڈر اللہ سے، تو اس کو عزت گناہ پر لگا دیتی ہے۔ پس کافی ہے اس کے لیے دوزخ، اور یہ البتہ بڑا بھونا

ہے۔

المہاد - (۲۰-۲۰۶)

عزت سے مراد ہے اپنی عزت پر تکبر کسی منع کرنے پر جو ضد چڑھ جاتی ہے اور آدمی کہتا ہے کہ یہ کون ہے مجھے منع کرنے والا۔ اگر یہ نہ کہتا تو شاید میں یہ کام چھوڑ بھی دیتا۔ اب اس کو دکھانے

کے لیے میں پہلے سے بھی زیادہ یہ کام کر دوں گا۔ یہ ہے عزت کا موجب اثم بن جانا۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے میں (حسب استعداد) جہاں تک فائدہ اٹھا سکا۔ کفر و
جھوٹ کے ہی تین اسباب نظر آئے۔ یعنی
(۱) تقلید آباد اکابر و غیرہ۔
(۲) اعراض۔
(۳) اشتکبار و استہزا۔

میر ولی اللہ

ایبٹ آباد ۱۳۴۷ھ

فیض الباری (مطبوعہ مصر)

فیض الباری نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر اسلام کی مشہور ترین اور مایہ ناز کتاب ہے۔ شیخ الاسلام
حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ جو اس صدی کے سب سے بڑے محدث سمجھے گئے ہیں فیض
الباری آپ کی سب سے زیادہ مستند عظیم الشان علمی یادگار ہے۔ جسے چار ضخیم جلدوں میں دل آویزی و دل کشی
کی تمام خصوصیتوں کے ساتھ مصر میں بڑے اہتمام سے طبع کرایا گیا ہے۔ فیض الباری کی حیثیت علامہ مرحوم کے
درس بخاری شریف کے امالے کی ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص مولانا محمد بدیع عالم صاحب فقیہ ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑی قابلیت،
دیدہ بینی اور جانکاہی سے مرتب فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی تقریریں کے علاوہ فاضل مولف نے جگہ جگہ تشریحی نوٹوں کا
اضافہ کیا ہے جس کتاب کی افادی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ مکمل چار جلدوں کی قیمت سولہ روپے۔

مکتبہ برہان دہلی قہرول باغ

بچوں کی تعلیم و تربیت

اسلامی تعلیمات اور نفسیات کی روشنی میں

سید احمد

(۲)

ایک عام مغالطہ | اس سلسلہ میں ایک عام مغالطہ یہ ہے کہ لوگ بچپن کے زمانہ کو بے فکری اور محض کھلنے پینے کے دن سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں بچہ کی ہر ادا، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اور اُس کا ہر فعل خواہ وہ قابلِ تحسین ہو یا لائقِ مذمت، نظر انداز کر دینے کے قابل ہے اور اس لائقِ ہر کہ اُس پر توجہ نہ کی جائے۔ اس خیال کی بنا پر ان لوگوں کو بچہ کے حرکات و سکنات کی نگرانی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر اور سنِ شعور کو پہنچ کر خود اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے لگے گا اور بچپن میں خواہ کیسا ہی رہا ہو بہر حال وہ بڑا ہو کر اپنی حالت کو خود ٹھیک کرے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ خیال ایک شدید مغالطہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نفسیات کی روشنی میں دماغ اور اُس کے تاثرات کی کیفیت کو سمجھ لیا جائے۔ عصرِ حاضر کے علوم و فنون میں علم النفس کو بُری اہمیت حاصل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس علم کی وجہ سے انسانی دماغ اُن کے محرکات اور هیجات اور امیال و عواطف اور زندگی پر اُن کے اثرات سے متعلق جو کامیاب اور ٹھوس تحقیقات ہوئی ہیں وہ زندگی کو کامیاب بنانے کی راہ میں بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں اور یورپ اُن سے بڑا فائدہ اٹھا بھی رہا ہے۔

علمائے نفسیات دماغ کو برت کی اُس چٹان سے تشبیہ دیتے ہیں جو کسی سمندر کی سطح پر تیر رہی ہو۔ اس چٹان کا صرف دستوں حصہ نظر آتا ہے۔ باقی نوحہ پانی کے نیچے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آبِ دوزکشتی اور جہاز والے ان نوحہوں کو نظر انداز کر دیں گے تو اُن کا انجام بجز ہلاکت و بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

علاوہ بریں دماغ کو ایک اُس جزیرہ سے بھی تشبیہ دی جاسکتی ہے جو کسی سمندر کے وسط میں ابھر آیا ہو۔ ہم اُس میں درخت دیکھتے ہیں، پہاڑ کی سبز پوش چوٹیاں دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ جزیرہ کی کل کائنات یہی ہے۔ حالانکہ نہ ظاہر جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ اُس کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو سمندر کی موجوں کے دامن میں مستور ہے۔

جو مناظر ہم دیکھتے ہیں، جو آوازیں ہم سُنتے ہیں اور جو خوشبوئیں اور مختلف ذائقے جن کا ہم اپنی قوتِ شامہ اور قوتِ ذائقہ کے ذریعہ ادراک کرتے ہیں، اسی طرح وہ اندرونی اور باطنی کیفیات و احساسات جو کبھی ہم کو مسرور کر دیتے ہیں اور کبھی مغموم۔ وہ خیالات و جذبات جو ہماری شعوری طاقتوں میں پہچان اور حرکت کا باعث ہونے میں۔ ان سب کا تعلق ہمارے شعوری دماغ سے ہے جس کو ہر عاقل بالغ جانتا ہے۔ لیکن دماغ کے شعوری حصہ کے علاوہ ایک بڑا حصہ غیر شعوری بھی ہے جس کو شخص نہیں جانتا۔ مگر اُس کے اکثر اعمال و افعال، اس کی پسند اور ناپسند اور اُس کے دوسرے امیال و عواطف اکثر و بیش تر اُس کے غیر شعوری دماغ کے تاثرات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ جدید علم النفس اس غیر شعوری دماغ پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ اس طرز فکر کے علمائے نفسیات میں ڈاکٹر فرائد (Sigmund Freud) کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔

اس کے دو ہم عصر اڈلر (Adler) اور یونگ (Jung) اگرچہ اعمالِ انسانی کے بنیادی محرک کے بارے میں اُس سے شدید اختلاف رکھتے ہیں اور فرائد سے بالکل ہی الگ ایک نئے نظریے کے حامل ہیں۔ تاہم جہاں تک غیر شعوری دماغ کی اصل حقیقت اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت کا تعلق ہے، تمیوں ایک ہیں اور اسی وجہ سے ان کو گہری نفسیات

والے (Depth Psychology) کہتا ہے۔

غیر شعوری دماغ | یہ غیر شعوری دماغ ہے کیا؟ مختصر لفظوں میں اس کی تعریف اس طرح کی
کیا ہے؟ | جاسکتی ہے کہ یہ نتیجہ ہوتا ہے ذاتی اور نسلی تجربات کا تفصیل یہ ہے کہ ہم

کو اپنی زندگی میں مختلف اور متضاد حوادث اور واقعات سے سابقہ پڑتا ہے اور اس سابقہ کی
وجہ سے ہمارے ذہن و دماغ پر مختلف قسم کی کیفیتیں اور صورتیں طاری ہوتی ہیں جن سے کبھی
مسرت حاصل ہوتی ہے اور کبھی غم کبھی خوف اور ڈر پیدا ہوتا ہے اور کبھی امید اور حوصلہ کبھی
کسی چیز کو پسند کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے اور کبھی ہم دل میں اُس سے نفرت اور کبیدگی محسوس کرتے
ہیں۔ جب یہ واقعہ گزر جاتا ہے تو عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ کے باعث جو کیفیت
یا جو تاثر پیدا ہوا تھا وہ بھی گزر گیا اور ختم ہو گیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

روزمرہ کے مشاہدات اور جو اس خمسہ کے ذریعہ مختلف تجربات سے انسانی ذہن و
دماغ پر جو کیفیات پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک کیفیت تو وہ ہے جس کا تعلق دماغ
کے شعوری حصہ سے ہے۔ یعنی وہ شخص اُس کیفیت کا شعور رکھتا ہے۔ اسے اُس کا ادراک
حاصل ہے اور وہ کیفیت اُس کی قوت حافظہ یا حس مشترک کے خزانہ میں پہنچ کر محفوظ ہو گئی ہے
اور دوسری قسم کیفیت کی وہ ہے جس کا شعور خود صاحب کیفیت کو نہیں ہوتا وہ یہ سمجھتا ہے کہ
واقعہ کی وجہ سے جو تاثر اُس پر پیدا ہوا تھا۔ واقعہ کے ساتھ وہ بھی ختم ہو گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ
وہ تاثر ختم نہیں ہوتا آخر لمحہ حیات تک باقی رہتا ہے۔ اور زندگی کے مختلف شئون و احوال پر اثر انداز
ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ایک دو نہیں بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

کچھ دن ہوئے میرے ایک فاضل دوست نے جو خود نفسیات کے فاضل اور ڈاکٹر
ہیں اور جو گذشتہ جنگ میں مختلف مقامات جنگ پر رہے ہیں بتایا کہ جب کبھی انہیں یہ معلوم ہوتا
تھا کہ کس لگ لگ گئی ہے تو انہیں بڑا خوف محسوس ہوتا تھا، اس پر وہ خود حیران تھے کہ آخر اجرا
کیا ہے۔ آتش زدگی سے بھی زیادہ ہول ناک اور سنگین واقعات ہو جاتے تھے مگر انہیں کوئی تاثر نہیں

ہوتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ انہوں نے خود تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کیا تو معلوم ہوا کہ بچپن میں ایک دفعہ اُن کے مکان کے پڑوس میں ایک سینما ہاؤس میں زبردست آگ لگ گئی تھی اور اس کی وجہ سے تمام گھر والوں کو سخت پریشانی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا

زمانہ حال کے ایک فاضل نفسیات پروفیسر مٹھو (A.V. Matthew) لکھتے ہیں ”جو کچھ ہم نے کیا ہے یا جو کچھ زمانہ ماضی میں ہم پر گذر رہا ہے ہم اُسے یاد نہیں رکھتے۔ لیکن بہر حال ہم جو کچھ بھی ہیں وہ نتیجہ ہے ہمارے تمام گزشتہ تجربات کا۔ بسا اوقات ہم اپنے پچھلے تجربات کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی انہیں ہم کو یاد بھی دلاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ ہم اُن کو یاد ہی نہیں کرتے بلکہ ہم پوری قوت سے اُن کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ہیں پیش نہیں آیا۔ اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ یہی وہ فراموش کردہ تجربات ہیں جنہوں نے ہم کو آج وہ بنایا ہے جو ہم نظر آتے ہیں اور یہی وہ ٹھلائے ہوئے تجربات ہیں جو ہمارے اپنے ذاتی غیر شعوری دماغ کی تشکیل کرتے ہیں۔“

یہ ٹھلائے ہوئے تجربات علمائے نفسیات کی خاص اصطلاح میں دو قسم کے ہوتے ہیں جن میں سے ایک کو وہ (Repressed thoughts) کہتے ہیں۔ اور دوسرے کو (Suppressed thoughts)۔ اردو میں ان دونوں کا ترجمہ دبائے ہوئے یا روکے ہوئے خیالات ہوگا۔ لیکن اصطلاحاً ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جن خیالات کو ہم خود بخود نظر انداز کر دیتے ہیں اور اُن کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیتے وہ (Repressed thoughts) کہلاتے ہیں اور اس کے برعکس جن خیالات کو ہم ٹھلانے اور فراموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کو (Suppressed thoughts) کہا جاتا ہے۔ گویا پہلی قسم میں مکمل بے شعوری ہوتی ہے اور دوسری قسم میں بے شعوری کے ساتھ کچھ نہ کچھ شعور بھی ضرور ہوتا ہے۔

The Child and his upbringing ch. I

یہ دہے ہوئے یا روکے ہوئے خیالات ہر انسان کے غیر شعوری ذہن کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں، سب کے سب اس قابل نہیں ہوتے کہ ایک صاحب شعور و فہم انسان اُن کا برملا اظہار کر سکے۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ہمیشہ تر خیالات و محسوسات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ تنہائی میں بھی اُن کا تصور کر کے شرماتا ہے۔ لیکن بہر حال یہ محسوسات و تجربات زندگی میں مختلف شکلوں اور صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ فرامیڈ۔ اڈلر اور نیگ کے نزدیک ان کا سب سے زیادہ مظاہرہ خواب میں ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ان ہی کو أَحْلَامٌ مِّنْ خُوابٍ یعنی خواب ہائے پریشان کہا گیا ہے۔

تحلیل نفسی کا عمل کرنے والے اصحاب جب کسی مریض کے غیر شعوری ذہن کا پتہ چلانا چاہتے ہیں تو مریض کے خوابوں کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ خواب کے علاوہ بیداری کے عالم میں بھی ایک ساہر نفسیات کو غیر شعوری ذہن کے بہت کچھ مظاہر نظر آسکتے ہیں۔

منظومہ دماغی | اس سلسلہ میں ایک لفظ (Complex) ہے جو عام طور پر کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں ہم اس کا ترجمہ دماغی الجھاؤ یا کشمکش دہنی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے مراد واضح نہیں ہوتی۔ ایچ۔ سی۔ ملر نے اپنی مشہور کتاب نفسیات جدیدہ اور والدین (Child Psychology) کے باب میں غیر شعوری اور دماغی ماحول پر بحث کی ہے۔ دماغی الجھن (Complex) کی تشریح ایک مثال کے ذریعہ اس طرح کی ہو کہ فرض کرو ایک خیال جس کو مثلاً ایم اے (x) کہہ سکتے ہیں کسی سبب سے دماغ کے شعوری حصہ کے لئے درد انگیز اور تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا خیال ہے کہ جب کبھی اس کا گذر ہمارے دماغ میں ہوتا ہے تو ہمیں کچھ نہ کچھ درد و کرب کا احساس ضرور ہوتا ہے اب یہ خیال دوسرے اسی قسم کے خیالات کی طرح چند اور تخیلات کے مجموعہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ خیال درد انگیز ہے اس لیے ہم اس کو دہانے اور گھٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس خیال کے ساتھ جو دوسرے خیالات مربوط اور وابستہ تھے وہ بھی گھٹے جاتے ہیں اور اب

وہ دماغ کے شعوری حصہ سے منتقل ہو کر غیر شعوری حصہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس طرح خیالات کا یہ پورا مجموعہ ایک عام ناخوش گوار ربط و وابستگی کا مرقع بن کر رہ جاتا ہے۔ پس جب تک ان خیالات کا تعلق دماغ کے شعوری حصہ سے رہتا ہے ان کو خیالات (Ideas یا Sentiments) کہتے ہیں اور جب یہ ایک عمل ذہنی کے ماتحت شعوری حصہ سے منتقل ہو کر غیر شعوری حصہ میں آتے ہیں تو ان خیالات کا یہ مجموعہ Complex کہلاتا ہے جس کو دماغی وہم یا ذہنی الجھن سے آپ اردو میں تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ دماغی وہم بہ ظاہر بہت معمولی سی اور ناقابل اعتنائے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ امیال و عواطف کی تشکیل و تعمیر میں اور حادثات و اطوار کے ہموار و استوار کرنے میں اس کا بہت بڑا دخل ہے۔

آپ نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ کسی خاص رنگ یا شکل و صورت سے خواہ وہ بذات خود کتنی ہی بے ضرر اور معمولی ہو غیر معمولی طور پر خوف کھاتے یا نفرت کرتے ہیں گے آپ منطقی اور عقلی دلائل کے ذریعہ لاکھ سمجھائیے کہ اس چیز سے ڈرنا یا نفرت کرنا نہایت نامعقول بات ہے۔ وہ خود بھی اقرار کریں گے کہ ہاں دلیل تو ہمارے پاس بھی نہیں۔ لیکن آخر میں کہیں گے یہی کہ معلوم نہیں کیوں! اس رنگ یا اس چیز سے ڈر بہت ہی لگتا ہے یا ہمیں اس سے شدید نفرت ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے ڈر یا نفرت کی وجہ معلوم نہیں ہے۔ لیکن ایک تحلیل نفسی کا ماہر دماغ کے غیر شعوری حصہ کا مطالعہ کر کے بتائے گا کہ یہ لوگ کس قسم کے وہم (Complex) کا شکار ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو ایک حقیر سی چیز سے خوف لگتا ہے یا وہ اس سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

یہ دماغی الجھاؤ عجیب و غریب چیز ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی کوشمہ سازیاں انتہائی حیرت انگیز ہیں۔ ڈاکٹر سکند فرائیڈ (۱۸۳۹-۱۸۵۶) نے جب پہلے پہل غیر شعوری ذہن اور اس کا کرب کا انکشاف و اعلان کیا تو عام دستور کے مطابق لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اور اس کے نظریہ کے

ساتھ تسخیر کیا۔ لیکن اُس نے ان لوگوں کی ذہن پر دانہ کی۔ چالیس سال تک برابر وہ اپنے تجربات و مشاہدات سے لوگوں کو آگاہ کرتا رہا۔ آخر کار جہاں تک فرائڈ کے بنیادی نظریہ کا تعلق ہے دنیا نے اُس کی صداقت کو تسلیم کر لیا۔ اور آج حال یہ ہے کہ جدید نفسیاتی مباحث کی ساری بنیاد ہی اُس پر قائم ہے۔

کوپٹن مکنزی نے *Compton Mackenzie* نے اپنی کتاب *Rich Relatives* (میں غنیمی رجحانات سے متعلق دماغی ابھھاؤ کی بعض بڑی دلچسپ مثالیں نقل کی ہیں جن کو پڑھ کر ہمارے آج کل کے بعض نوجوان اگر یہ کہہ بیٹھیں کہ ”ارے دل یہ تو تیری داستان معلوم ہوتی ہے“ تو کچھ عجب نہیں۔ جب کوئی شخص پاگل ہو کر اول فول بکنا شروع کر دیتا ہو یا خواب میں سوتے سوتے بڑبڑانے لگتا ہے یا تیز بخار کے عالم میں اسے ہذیان شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت اُس کا غیر شعوری ذہن اپنے بند خزانہ کا منہ کھول دیتا ہے اور وہ ایسی اُن کہی اور ”اُن بچھی“ باتوں کا اظہار کر جاتا ہے جن کو اگر آپ بعد میں اُسے یاد بھی دلائیں تو وہ ہرگز اُن کا اتنا واقف نہیں کرے گا۔

تین سال کی بات ہے۔ میرا ایک عزیز کالج کی چھٹیوں میں شدید گرمی کے موسم میں دہلی آیا اور میرے گھر آکر مقیم ہوا۔ بد قسمتی سے چند روز بعد وہ پاگل ہو گیا۔ اُسے انگریزی بولنے کا بہت شوق تھا عالم جنون میں وہ گھنٹوں انگریزی میں بولتا رہتا تھا۔ اور اس طرح اُس نے اپنے بچپن سے لے کر نوجوانی تک کے ایسے ایسے رنگین واقعات و تاثرات بیان کر دیے کہ اگر میں چاہتا تو اُن کی مدد سے اُس کا ایک افسانہ حیات مرتب کر سکتا تھا۔ بہت کچھ علاج معالجہ کے بعد وہ اچھا ہو گیا تو میں نے اُس کو زمانہ جنون کی کہی ہوئی بعض باتیں یاد دلائیں۔ جن پر اُسے شرم تو بہت آئی۔ مگر وہ اُن کا اقرار نہ کر سکا اور مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ بھائی! آپ جانتے ہیں ایک

Depth Psychology and Education by

Prof: A.V. Mathew Page 5.

پاگل آدمی کی باتوں کا اعتبار ہی کیا ہو سکتا ہے؟

میں یہ جانتا ہوں کہ اُس نے کار کرنے میں کتنی صنعت سے کام نہیں لیا واقعی جو باتیں اُس کی زبان سے نکلیں وہ اُس کی قوتِ واقفیت میں موجود نہ تھیں مگر ساتھ ہی مجھ کو اس کا یقین ہے کہ اُس نے جو کچھ کہا وہ ایک زمانہ کے خود اُس کے اپنے تجربات اور تاثرات تھے جن کو اُس کے دماغ کے غیر شعوری حصہ نے عقل و ہوش کے پردہ داروں کی آنکھیں بند دیکھ کر زبانِ جنون سے بیباک ادا کر دیا تھا۔

ماحول کے اثرات | یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ معلوم کرنا چاہیے کہ علماء نفسیات کی تشریح کے مطابق یہ غیر شعوری ذہن ایک بڑی حد تک بچپن میں بلکہ پانچ سال کی عمر میں ہی تشکیل پاتا ہے۔

ایک ننھا ننھا سا بچہ اس قابل نہیں ہوتا کہ زبان سے اپنے دل کی بات کہہ سکے۔ اُسے جب کوئی چیز مانگنی ہوتی ہے تو وہ ملتجیانہ نگاہوں سے ماں باپ کو دیکھنے لگتا ہے اور اگر ماں باپ کو اس پر بھی توجہ نہیں ہوتی تو وہ رونام شروع کر دیتا ہے۔ اسے کھانے پینے اور بول و براز کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ اس کا رگاہ ہست و بود کے عام رسم و رواج سے بالکل بیگانہ ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ یہاں سردی سے کیوں رکھنا چاہیے اور گرمی کی اذیت کو کس طرح دور کیا جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں اور رسوم و آداب سے مکمل طور پر بے گانہ اور اجنبی محض ہونے کے باوجود وہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اُس کے اثرات قبول کرنے کی اُس میں بڑی صلاحیت اور پوری استعداد ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ اپنے ماحول میں دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے اُس کے نقوش و تاثرات سب اُس کے دماغ کے غیر شعوری حصہ کے صفحہ قسط اس پر مرتب ہوتے رہتے ہیں اور پھر یہ تاثرات اُس کے تمام اعضا اور قوی پر اثر انداز ہو کر اُس کی آئندہ عملی زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ تیار کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بچہ بڑا ہو کر وہی

۱۰ Psychology and Principles Education . P. 91.

زبان بولتا ہے جو اُس کے گھر میں بولی جاتی ہے اور اسی لب و لہجہ سے بولتا ہے جس لب و لہجہ سے گھر کے لوگ بولتے ہیں۔ اُس کے معتقدات اُس کے طور و طریق، اُس کے کھانے پینے کے آداب سب وہی ہوتے ہیں، جن کو وہ اپنے ماحول میں دیکھتا اور محسوس کرتا رہا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ بچوں میں نقل کرنے کی عادت بہت ہوتی ہے۔ یہ عادت کیوں ہوتی ہے؟ محض اُس تاثر کی وجہ سے جو انہیں اپنے ماحول سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں حال ہی کا ایک واقعہ ذیل نجی کا باعث ہوگا۔

گزشتہ موسم سرما میں صحرائے شام سے ایک انسانی بچہ پکڑا گیا جس کو اس اعتبار سے ہرن کا بچہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُس کی پرورش صحرائے ہرنوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک عورت نے اُس کو اچھی طرح پہچان کر کہا کہ ”یہ میرا بچہ ہے“ اُس نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں دمشق اور بغداد کے درمیان صحرا کو اونٹ کے ذریعہ عبور کر رہی تھی کہ بچہ گم ہو گیا۔ میں نے اُس کی تلاش میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن ناکام رہی۔ بچہ آج کل ہسپتال میں مشہور معالجوں کے سپرد ہے وہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اُس کی بربریت ختم ہو اور وہ انسانوں میں رہ کر انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا سکھ جائے۔

ہرنوں میں پرورش پانے کی وجہ سے ایک انسانی بچہ کے امیال و عواطف کتنے بدل گئے ہیں؟ اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہوگا کہ اسی اطلاع میں مذکور ہے: ”یہ بچہ اب بھی گھاس کھا کر خوش ہوتا اور ہرنوں کی ہی طرح حرکت کرتا ہے اور اُن ہی کی طرح بولتا بھی ہے۔ تاہم کچھ نلے پر بادل ناخواستہ کچا گوشت یا دوسری سنیریاں کھا لیتا ہے۔ کسی بچی ہوئی چیز پر منہ نہیں ڈالتا۔ کبھی کبھی آدمیوں کی طرح بولنے کی بھی کوشش کرتا ہے مگر زبان صحیح لب و لہجہ پیدا نہیں کر سکتی۔“

گرفتاری کے بعد سے یہ بچہ زیادہ موٹا ہونے لگا ہے اور وزن بقدر ستر پونڈ بڑھ گیا ہے۔ تین مرتبہ وہ ہسپتال سے نکل بھاگا اور بمشکل ہاتھ آیا۔ ایک بار دو موٹر گاڑیوں نے اُس کا تعاقب

کیا۔ اس کی رفتار میں میل فی گھنٹہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی دوڑ سکتا ہے۔ بہر حال کوشش کی جارہی ہے کہ اس کو کسی طرح انسان بنالیا جائے۔
(آج کل۔ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۷۶ء)

اس خبر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ماحول بچہ کے بنانے یا بگاڑنے میں کتنا دخل رکھتا ہے۔
قدیم علمائے اخلاق میں ایک گروہ تھا، جو اخلاق کو ناقابل تغیر و تبدل بتاتا تھا۔ فلاسفہ یونان میں جالینوس نے دو مختلف نظریوں کے درمیان اعتدال کی راہ پیدا کرنے کی کوشش کی تو اتنا کھسکا کہ دنیا میں بعض لوگ بالطبع اہل خیر ہیں اور بعض بالطبع اہل شر اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں خیر و شر دونوں کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن فلسفہ اخلاق کا طالب علم جانتا ہے کہ یہ مسلک نہایت کمزور ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ قدیم فلاسفہ یونان جو ارسطاطالیس کی ہم نوائی کرتے تھے کہتے تھے کہ تعلیم و تادیب کے ذریعہ اثر و اثر بھی اخیار ہو سکتے ہیں۔

جدید فلاسفہ مغرب کا ایک گروہ جو نظریہ کردار کا حال پر (Behaviourist) وہ بھی اسی کا قائل ہے کہ کردار پیدا کیا جاتا ہے اور کسی سبب کا سبب ہوتا ہے۔ وہ محض اتفاقی نہیں ہوتا۔

اس بنا پر ایک بچہ کی تعلیم و تربیت کے لیے سب سے مقدم یہ بات ہے کہ جس ماحول میں وہ پرورش پا رہا ہو اُسے درست رکھا جائے اور ہرگز یہ خیال نہ کیا جائے کہ اگر بچہ طبعاً شریر ہے تو ایک اچھا ماحول اُسے کیوں کہ بہتر کر سکے گا۔ اس سلسلہ میں یہ لطیفہ دلچسپی سے سنا جائے گا کہ نفسیات کی ایک کتاب (The Problem Child) کے مصنف (A. S. Neil) نے کتاب کو مکمل کر لینے کے بعد جب اُس کے پروف پڑھنے شروع کیے تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے اپنی کتاب میں بچوں کی مشکلات پر بحث کی ہے۔ لیکن شکل

لے Depth Psychology and Education ch. I

کوئی بچہ کی تو ہوتی ہی نہیں۔ جو کچھ بھی دشواری ہوتی ہے وہ ماں باپ کی ہوتی ہے کہ وہ اسے کس ماحول میں تربیت دیتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے غلط کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ پانچ سال بعد *The Problem Parent* کے نام سے اُس نے ایک اور کتاب تصنیف کی۔

خود قرآن مجید کی تصریحات و نصوص سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان میں نیک اور بد ہونے کی طبعی استعداد موجود ہوتی ہے اور اُس کا کیر کڑیا کردار ماحول کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ ارشاد ہے۔

فَالْهَمَّهَا فَجُورَهَا
وَتَقْوَاهَا (الشمس)
اشر نے نفس انسانی میں فحور اور تقویٰ دونوں کا
الام کر دیا ہے۔

ماحول کی اثر انگیزی کا قویء عالم ہے کہ انسان تو انسان غیر ذوی العقول پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ قرآن کی آیت ذیل میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاةً
يَاذُنَ رَبٍّ وَالَّذِي نَجِثَ
لَا يَخْرِجُ إِلَّا ذَلِيلًا (النرا)
اور پاک زمین اپنے رب کے حکم سے سبزیاں
اگاتی ہے اور خراب زمین میں نکلتی چیز کے علاوہ
کچھ اور نہیں اُگتا۔

علاوہ بریں ایک صحیح حدیث سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے کہ بچہ کے بنانے یا بگاڑنے میں اُس کے ماحول کو کس قدر دخل ہوتا ہے۔ حدیث یہ ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
ما من مولود الا يولد فطرته
الفطرة فابواه يهودونه او
يُنصِّرانه او يمجسانه
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بچہ ایسا
نہیں ہے جو فطرت پر پیدا نہ ہوتا ہو۔ پھر اُس کے
ماں باپ اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی کرتے
ہیں یا مجوسی۔

(المشکوٰۃ۔ باب یمان بالقد)

حدیث کے ان لفظوں کو پیش نظر رکھ کر اب ذرا مشہور عالم نفسیات ینگ کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ فرمائیے۔

”بچہ کی نفسیاتی زندگی کا بہت ہی تھوڑا حصہ آزاد ہے، درحقیقت یہ بہت کچھ براہ راست والدین سے ہی حاصل شدہ ہوتی ہے۔“

ایک حدیث میں ہے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے ایک بچہ کے جنازہ پر تشریف لے جانے لگے تو حضرت عائشہؓ بولیں ”اے رسول اللہ! یہ بچہ تو جنت کی چڑیا ہو گا کیوں کہ اس نے تو کوئی گناہ کیا ہی نہیں“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”اور اس کے سوا کیا! اللہ نے جنت کے اہل پیدا کیے ہیں اور وہ اپنے آبا کے اصحاب سے ہی جنت کے اہل پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے دوزخ کے اہل پیدا کیے ہیں اور وہ صلب پدر سے ہی دوزخی پیدا ہوتے ہیں۔“ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی بچہ کے ایمان و کفر کے متعلق جزم و یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ان دونوں میں وہ اپنے والدین کے ہی تابع ہوتا ہے۔

اہل علم بے خبر نہ ہونگے کہ یہ حدیث اور اسی مضمون کی بعض اور احادیث متکلمین و محدثین اسلام کے درمیان ایک عظیم نزاع کا باعث ہوئی ہیں اور اس مسئلہ پر کہ ایک بچہ کافر اگر مر جائے تو وہ جنت میں جائے گا یا دوزخ میں ایک عرصہ تک معرکہ آرائی رہی ہے۔ حالانکہ بات بہت معمولی سی تھی۔ حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر کوئی بچہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا اور بلوغ سے پہلے ہی مر گیا تو وہ جنت میں جائے گا اور اس کے برخلاف کافر کا بچہ دوزخ میں بھیجا جائیگا۔ کیونکہ جنت اور دوزخ کا استحقاق احکام شرعیہ سے مکلف ہونے کے بعد ہوتا ہے اور ایک بچہ جب ابھی مکلف ہی نہیں ہے تو اس کی نسبت استحقاق جنت و جہنم کا کوئی سوال ہی کیوں کر ہو سکتا ہے۔

اصل چیز یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس ارشادِ گرامی میں صرف اسی ایک حقیقت
 کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ بچہ کے مسلم یا کافر ہونے میں ایک بڑا دخل اس کا بھی ہے کہ اُس کے
 ابا باپ کیسے ہیں۔ وہ جس قسم کے ماں باپ کی گود میں پرورش پائے گا آئندہ چل کر ویسا ہی
 ہوگا۔ اس سے ہرگز کوئی بحث نہیں کہ اس وقت اُس کا حکم کیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ ینگ نے بھی اپنے ایک لکچر میں اسی حقیقت کو اس طرح بیان
 کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ”جس طرح ایک بچہ جب اپنی ماں کے رحم میں ہوتا ہے تو اُس وقت
 وہ خود عملاً کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی ماں کے جسم کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے اور اُس کی حالت تمام تر ماں
 کی حالت پر ہی موقوف ہوتی ہے۔ اسی طرح بچپن کے اوائل میں ایک بچہ کی نفسیاتی زندگی
 (Psyche) بہت بڑی حد تک مادی نفسیاتی زندگی پر ہی موقوف ہوتی ہے اور پھر
 مادہ ہی چوں کہ اس فضا کے پیدا کرنے میں باپ بھی ماں کا شریک ہوتا ہے اس بنا پر بچہ کی نفسیاتی
 زندگی ماں اور باپ دونوں کی نفسیاتی زندگی کا جز ہو جاتی ہے۔

غور کیجئے حدیث میں اور ینگ کے بیان میں صرف معنوی مشابہت ہی نہیں
 طرزِ تعبیر بھی قریب قریب یکساں ہے۔ اسی وجہ سے ینگ کے ایک شارح نے ینگ
 کے ان الفاظ کو الہامیانہ (Intuitive) اور شاعرانہ (Poetic) کہا ہے۔

(باقی آئندہ)

تبصرہ

حقائق الاسلام حصہ اول۔ از جناب مولوی حافظ محمد سرور صاحب کوہاٹی۔ تقطیع خورد
ضیامت ۲۲ صفحات۔ کتابت و طباعت متوسط۔ قیمت پچاس پتہ دفتر جماعت اسلامیہ
نزد محلہ جمعہ خاں شہر کوہاٹ۔ صوبہ سرحد۔

لائق مصنف نے مسلمانوں کی عام ربوں حالی اور ان کے عملی و اخلاقی انحطاط سے متاثر
ہو کر انہیں صحیح معنی میں مسلمان بنانے کی غرض سے چار حصوں میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہے
جس کا پہلا حصہ ہمیں بغرض تبصرہ موصول ہوا ہے۔ اس کتاب کے تمام مباحث کالت لباب اور
دار بحث یہ امر ہے کہ اصل اسلام اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ کا نام ہے۔ اگر یہ چیز معدوم ہے تو
خواہ کوئی شخص زبان سے اپنے آپ کو کیسا ہی مسلمان کہے وہ مسلمان نہیں ہے

جہاں تک اعمال و اخلاق کی اہمیت و ضرورت کا تعلق ہے کوئی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا
انبیائے کرام کی بعثت اور ان کی تعلیم و ارشاد کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ وہ لوگوں میں اتباعِ ہدایت کے بجائے
حکم خداوندی کے امتثال و تعمیل کا جذبہ پیدا کریں اور دراصل یہی امتثال و تعمیل اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ
فاضلہ کا دوسرا نام ہے لیکن اس میں غلو کر کے یہ کہنا مسلکِ صحیح کے خلاف ہے کہ ایمان اور عمل ایک ہی
حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ اس بنا پر اگر عمل ہے تو ایمان بھی ہے اور اگر عمل نہیں ہے تو ایمان بھی نہیں
ہے (ص ۱۴۱) مصنف نے ایک آدھ جگہ نہیں بلکہ بار بار اور بڑے زور کے ساتھ اپنے اس خیال
کو دہرایا ہے کہ قیامت میں جس چیز کو تو لا جائے گا وہ کوئی اسلامی عقیدہ نہیں ہوگا بلکہ اعمال و اخلاق
ہوں گے۔ (ص ۱۳۶) جیسا کہ لربا ب علم کو معلوم ہے یہ مسلک حوارج کا ہے کہ ان کے نزدیک فقدانِ عمل
فقدانِ ایمان لازم آتا ہے۔ احادیث سے قطع نظر قرآن مجید کی بہت سی آیات ہیں جن میں فقط ایمان

کا ذکر ہے اور عمل کا نہیں۔ اُن سے خواجہ کے اس عقیدہ کی قطعی تردید ہوتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ایمان اور عمل جس طرح نفع ایک نہیں ہیں شرعی اصطلاح کے مطابق بھی دونوں بعینہ ایک نہیں۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور عمل کا خواجہ سے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ بغیر عمل کے ایمان بہت ہی مضحکہ اور کمزور ہو جاتا ہے اور اس بنا پر بدعہ کے لیے قرآن میں جو وعیدیں مذکور ہیں وہ بھی قیامت میں اُس پر مرتب ہونگی لیکن بایں ہمہ یہ سمجھنا کہ عمل کے بغیر ایمان مطلقاً پایا ہی نہیں جاتا قرآن مجید کے نصوص صریحہ کے بالکل خلاف ہے ورنہ پھر منافق، فاسق اور فاجر وغیرہ یہ سب الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں اور دنیا میں صرف دو ہی طبقات رہ جاتے ہیں ایک مومن اور دوسرا کافر اپنے اس بنیادی خیال کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں مصنف نے علمائے سلف اور احادیث کے ساتھ اُن کے اعتناء و اہتمام پر بھی بہت لے دے کی ہے اور اس کو ہی مسلمانوں کے انحطاط کا سبب بتایا ہے حالانکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط کا اصل باعث احادیث کے ساتھ اعتناء و اہتمام اور ایمان و عمل کے درمیان تفریق نہیں بلکہ عملاً قرآنی تعلیمات سے روگردانی اور انحراف ہے ورنہ یہ ظاہر ہے کہ کوئی حدیث اسی نہیں بتائی جاسکتی اور کسی امام کا کوئی ایسا قول پیش نہیں کیا جاسکتا جس سے ایک بدعمل انسان کو اپنی بدعہ کیلئے کوئی سہارا مل سکے۔ رہیں بہانہ جو طبیعتیں تو وہ جس طرح احادیث اور ائمہ کے اقوال کا سہارا لے سکتی ہیں قرآن کی آیات کو بھی اپنے حق میں توڑ ڈھونڈ سکتی ہیں اور ایمان و عمل کے ایک ہونے کے بعد بھی بدعہ کر سکتی ہیں۔ بہر حال مصنف نے جس جذبہ سے یہ کتاب لکھی ہے وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے اور اس میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جن سے مسلمان عبرت و بصیرت اور نپید و معظت حاصل کر سکتے ہیں۔

مولانا محمد علیؒ کے مرتبہ، پروفیسر محمد سرور تقطیع خور و ضخامت ۲۴۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عامر۔ پتہ ادارہ ادبیات نو لاہور۔

یورپ کے سفر } مولانا محمد علی مرحوم اُن اکابر قوم میں سے تھے جن کے قلم سے نکلی ہوئی ایک ایک سطر اُن کی موت کے بعد قومی سرمایہ کی حیثیت سے محفوظ رکھی جاتی ہے۔ مولانا نے یورپ کا سفر چھ مرتبہ کیا تھا، اس کتاب میں ان سفروں کے متعلق خود مولانا کے خطوط اور بعض تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔

مولانا کی تحریر کی خصوصیت یہ تھی کہ بہت پر قلم تھے اور جوبات لکھتے تھے بے لاگ ہو کر لکھتے تھے

چنانچہ ان خطوط میں وہ کہیں جہاز کے ساتھیوں کا تعارف عجیب انداز میں کر رہے ہیں کبھی وہ مصر میں وہاں کے ارباب سیاست سے ملتے ہیں تو اسلامی اخوت اور عالم اسلام کے حالات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ یورپ میں کبھی وہ برطانوی مدبرین کے سامنے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کے معاملات رکھتے ہیں اور پھر اُن کی طرف سے سر دھری اور بے اعتنائی دیکھتے ہیں تو اس پر سخت رنجیدہ ہوتے ہیں۔ کبھی انہیں یورپ کی عیاشی و فحاشی پر پیش آتا ہے اور کبھی وہ بچوں کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ کفر زار یورپ میں ہونے کے باوجود نماز کا اور حلال و حرام کا براہ خیال رہتا ہے۔ پھر اپنی بیماری اور اُس کے اشتداد کی داستان سنانے لگتے ہیں تو ایک ایک بات تفصیل سے لکھتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ ان خطوط اور تحریروں سے مصر اور ہندوستان کے سیاسی حالات، یورپ کی معاشرت، برطانوی مدبرین و ارباب اقتدار کی خود سری وغیرہ کے علاوہ خود مولانا کے اخلاق و عادات، اسلامیت، جذبہ عمل و ایثار، ظرافت و شوخی طبع ہمدردی بنی نوع انسان اور شگفتہ مزاجی و وسیع المشربی سے متعلق بہت اچھی اور مستند معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

ان میں سے بعض سفروں کے متعلق علی گڑھ منتقلی اور کامریڈ کی جلدوں میں خود مولانا کے قلم کے لکھے ہوئے جو حالات بکھرے پڑے ہیں اگر کوئی صاحب اُن کو بھی شائع کر دیں تو بڑا کام ہو۔ بہر حال زیر تبصرہ کتاب موجودہ نا تمام حالت میں بھی بہت دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

۳۲۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعر مجلد ۷
اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب
جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ
پیش کیا گیا ہے قیمت ۳۰۰ روپے مجلد للعر

خلافت راشدہ۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں
عہد خلفائے راشدین کے تمام قابل ذکر واقعات
صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں
قیمت ۳۰۰ روپے مجلد للعر

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ ۳۰۰ روپے
مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغت قرآن
پر بے مثل کتاب ۳۰۰ روپے مجلد للعر

سرایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا مختصر ششہ
درفتہ ترجمہ قیمت ۳۰۰ روپے

اسلام کا نظام حکومت۔ صدیوں کے قانونی مطالب
کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطہ حکومت کے
تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت
چھ روپے مجلد سات روپے۔

خلافت بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے
بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ۳۰۰ روپے مجلد للعر

۳۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت
جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، انداز
بیان دلکش قیمت للعر مجلد ۷

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی
قیمت للعر مجلد ۷

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعر مجلد ۷
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی۔

قیمت ۳۰۰ روپے مجلد للعر
۳۴۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت

کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین
اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت
مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور

اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح
کیا گیا ہے قیمت ۳۰۰ روپے مجلد ۷

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور فاطمہ الانبیاء
کے حالات مبارک کا بیان قیمت ۳۰۰ روپے مجلد للعر

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر قابل مطالعہ کتاب
صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ۷

نیچر ندوۃ المصنفین دہلی قبول باغ

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین و صلی

(۱) محسن خاص :- جو مخصوص حضرات کم و کم پانچ سو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات تدریک جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین :- جو حضرات کمپیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطہ نظر پر نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین :- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احتیاء :- نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے اجابیں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

- (۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔
- (۲) غریبی علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ موزوں ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں
- (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں منائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابل اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

- (۴) جواب طلب امور کے لئے ۱۔ کالٹ یا جوابی کالڈ بھیجنا ضروری ہے۔
- (۵) قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع حصول ٹک) فی پرچہ ۸
- (۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

موری محمد اویس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید : نا پریس دہلی میں طبع کر اگر دفتر رسالہ برہان دہلی قبول بلغہ و شائع کیا

۴۲۳
فردوسی

مُصَنِّفِینِ دینی کا علمی و دینی کام ہونا
مَدَوۃُ اَیۡینِ

بُرکات

مرتب
سعید احمد بک آبادی

مطبوعات ندوة المصنفین دہلی

ذیل میں ندوة المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محنین و معاونین اور اجار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

غلامان اسلام :- پچھتر سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت چھ مہلہ ہے	مسئلہ اسلام میں غلامی کی حقیقت مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جن میں ضروری اصلاح بھی کئے گئے ہیں قیمت تین مہلہ
اخلاق اور فلسفہ اخلاق :- علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصول اخلاق اور انواع اخلاق اور فلسفہ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت چھ مہلہ ہے	تعلیمات اسلام اور سچی اقوام اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت چھ مہلہ ہے
مسئلہ قصص القرآن حصاول :- جدید ایڈیشن ندوة المصنفین کی مایہ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت چھ مہلہ ہے	سوشلزم کی بنیادی حقیقت باشرکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منقل کیا گیا ہے قیمت تین مہلہ
بین الاقوامی سیاسی معلومات :- یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت چھ مہلہ	ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ
وحی الہی :- مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مہلہ ہے	مسئلہ بنی عربی صلعم و تاریخ ملت کا حصول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت چھ مہلہ
تاریخ انقلاب روس :- ٹرائسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت چھ مہلہ	فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور بحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے اس موضوع پر اپنے رنگ کی بمثل کتاب قیمت چھ مہلہ ہے

برہان

شمارہ (۲)

جلد ہینزدہم

فروری ۱۹۴۷ء مطابق ربیع الاول ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

۶۶	سعید احمد	۱ نظرات
۶۹	جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی	۲ قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے۔
۸۱	پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے۔	۳ حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ
۱۱۳	سعید احمد	۴ بچوں کی تعلیم و تربیت
		۵ ادبیات۔
۱۲۳	جناب روش۔ صدیقی	ایشیا
۱۲۶	ح۔ م	۶ تبصرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات

تاریخ میں ایشیا کو یورپ پر ہمیشہ سرداری اور فوقیت رہی ہے بڑی بڑی تہذیبوں اور تمدنوں کے چشمے
 یسین پھوٹے علوم و فنون کے جہین اسی کی ہمزمین پر کھلے۔ مذاہب عالم کی داغ بیل یسین پڑی انبیاء کرام کی
 ولادت و بعثت کا گوارہ ہونے کا شرف اسی خطہ ارضی کو حاصل ہوا۔ نطقی اعرابی اور ذہنی ہندی اسی ٹکڑے
 کے ڈھلے ہوئے سکے تھے جنہوں نے تہذیب و ثقافت کے بازار میں بڑا نام پایا۔ عظیم الشان سلطنتوں
 اور حکومتوں کی بنیاد یسین پڑی۔ آسمانی کتابوں کا مہبط یسین تھی۔ یورپ نے مذہب اور خدا کی معرفت
 کا سبق اسی کی دس گاہ میں پڑھا۔ علم کی روشنی اسی کے چراغ سے لی۔ تہذیب و تمدن کی دولت و نعمت
 اُس کو اسی کے خزانہ سے ملی۔ جہاد زندگی میں جن آلات و اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب اسے ایشیا
 کے کارخانہ سے ہی دستیاب ہوئے۔ لیکن یورپ نے ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی ایک مستقل انفرادیت
 قائم کر لی اور دوسری جانب اقوام ایشیا شمشیر و سناں کو خیر باد کہہ کر طاؤس و رباب میں مشغول ہو گئیں
 نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کو علوم و فنون، تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور سیاسی طاقت ہر اعتبار سے
 دنیا پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہو گیا۔ اور ایشیا اپنے حریف پنج شکن کی تاب مقاومت نہ لاکر اُس کا محکوم
 بن گیا۔

لیکن چونکہ یورپ کا تصور زندگی نسلی اور قومی تھا جس میں انسانیت عامہ کے لیے کوئی گنجائش
 نہیں تھی اس لیے اُس نے ایشیا کو محکوم بنا کر اسے لوٹنا کھسوٹنا اور ہر اعتبار سے تباہ کرنا شروع کر دیا
 ایشیائی اقوام ایک عرصہ تک "شیرنی افرننگ" پر اس درجہ فریفتہ رہیں کہ انہوں نے چنگیزی افرننگ
 کو بھی برداشت کر لیا اور کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ آخر کار پہلی جنگ عظیم نے اُن کی آنکھ کھولی
 اور اُن کو یہ محسوس ہوا کہ اُن کی تاریخ ماضی کیا ہے اور اب وہ کیا ہو کر رہ گئی ہیں یہ احساس برابر ترقی کرتا رہا
 یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جگر کا ناسور بن کر پھوٹ پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ ہر جگہ اضطراب

دبے چینی دیکھ رہے ہیں۔

مصر کے لوگ اس کا نتیجہ کر چکے ہیں کہ مصر اور سوڈان دونوں کو ایک کر کے برطانوی افواج کو وہاں سے نکال کر رہیں گے۔ فلسطین کا عرب عہد و پیمان کر چکا ہے کہ وہ اپنے ملک کو غیروں کے اثرات سے یک سر پاک و صاف کر دیگا۔ شرق اردن اور ترکی میں رازدارانہ گفتگو ہو چکی ہے۔ انڈونیشیا نے آزادی حاصل کر لی لی۔ انڈونیشیا فرانسیسی تغلب و استبداد کی زنجیروں کو پاش پاش کر دینے پر تلا ہو رہا ہے۔ ہندوستان اور برما دونوں آزادی کے دروازہ پر دستک دے رہے ہیں اور اب کوئی دن جاتا ہے جب کہ علی بابا چالیس چور کا یہ طلسمی دروازہ سم سم کھل کر رہے گا۔

اس سلسلہ میں یہ ضروری تھا کہ ایشیائی اقوام ایک دوسرے سے قریب ہوں اور ان میں اپنی مشکلات کے یکساں ہونے کے باوجود جو بعد و افتراق پیدا ہو گیا تھا اسے دور کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس راہ میں بھی ہندوستان نے ہی سب سے پہلے قدم اٹھایا اور تمام ایشیائی ملکوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ یہ کانفرنس اگلے مہینہ ہندوستان کے دار السلطنت نئی دہلی میں بڑے اہتمام و انتظام کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اخبارات میں اب تک جو اطلاعات چھپی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کانفرنس میں افغانستان، ایران، عراق و فلسطین، شام، افریقہ، مصر، ترکی، چین، انڈونیشیا وغیرہ ہر ایشیائی ملک کے نمائندے شریک ہونے ہندوستان آ رہے ہیں اور ان سب نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ ہر ایک یہ کانفرنس جس طرح سیاسی اعتبار سے بڑی اہم ہے۔ ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے بھی اس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ سیاسی میدان کے ساتھ ساتھ اب ایشیا پر حقیقت بھی پوشیدہ نہیں رہی ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کے ہیٹلاب نے اس کو اپنے مخصوص کلچر اور ثقافت و تہذیب سے بہت دور کر کے اسے معاشرتی اور روحانی اعتبار سے کس درجہ تباہ حال کر دیا ہے۔ ایشیائے مختلف گوشوں میں اس وقت جو محرمیں چل رہی ہیں اگر ان کا غمگین نظریہ سے جائزہ لیا جائے تو بآسانی اس تہذیبی شعور و احساس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اقوام ایشیا میں جیسا کہ اباب خبر و نظر پر محقق نہیں ہے مسلمانوں کو خاص امتیاز حاصل ہے وہ اگرچہ گزشتہ دو سو برس کی سیاسی انحطاط و تزلزل کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ان کی تہذیبی اور ثقافتی یادگاریں آج بھی تازہ و

کے ہر اق میں تابندہ روشن ہیں۔ اُن کا نظام زندگی ہمہ جہت کامل و مکمل ہے اور اس میں بدرجہ اتم ایک بین الاقوامی نظام حیات بننے کی صلاحیت ہے۔ رنگ و نسل کا فرق، اقتصادی غارت گری، انسانی حقوق کا غصب و غلبہ غرض وہ تمام مصائب و آلام جن سے آج دنیا کی تمام کمزور قومیں دوچار ہیں اور جن کا کامیاب حل تلاش کرنے کے لیے بے چین و مضطرب ہیں۔ اسلام میں ان سب کا اطمینان بخش حل پہلے سے موجود ہے اس بنا پر جی چاہتا ہے کہ اس ایشیا ناک کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی سب سے زیادہ نمایاں ہے اور وہ عہد ماضی کی طرح پھر ایک مرتبہ بقیہ اقوام ایشیا اور اُس کے درمیان سے تمام عالم کو راست بازی اور حقانیت کی روشنی دکھاسکیں۔ اس کانفرنس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو عوام اور علماء کرام کو خصوصاً یہ کوشش کرنی چاہیے کہ زندگی کے اسلامی نقطہ نظر کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیبی اور کلچرل وحدت قائم کریں جو دنیا کی موجودہ تباہ حال قوموں کے لیے حتمی و آبدی ثابت ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اسلامی ممالک کے نمائندے باہم متفق و متحد ہو کر شرکاء کانفرنس کو اپنے اصول زندگی اور نظام حیات سے قولاً و عملاً متاثر کر سکیں۔ بہر حال اسلامی ممالک سے روابط پیدا کرنے اور اس طرح اتحاد اسلامی کی طرح ڈالنے کے لیے مسلمانان ہند کے واسطے یہ بہت اچھا موقع ہے اور ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

گزشتہ ماہ کا الم ناک سانحہ دارالعلوم دیوبند کے قدیم تراویح حضرت مولانا عبد السمیع صاحب کی وفات۔ مولانا مرحوم کئی ماہ سے علالت کے امتداد و اشتداد کی تکلیفیں اٹھاتے تھے، بالآخر اصراف المظفر کو ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم حضرت مولانا بیباں سید صغیر حسین صاحب کے مخصوص ہم سبقوں میں تھے اور بزرگوں کی خوبیوں اور خصوصیتوں کے جامع، بڑے، باد صبح، بڑے با اخلاق، بڑے سادہ مزاج اور دارالعلوم کے اساتذہ میں بعض اوصاف کے لحاظ سے بے عدیل، بے شبہ۔ پیرائے سالی اور غیر معمولی نقابست کے باوجود جب درس دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کوئی تازہ دم اور بلند آواز مدرس پرے شوق و انہماک کے ساتھ طلبہ سے مصروف و مخاطب ہے۔ مولانا کا طرز تعلیم عام فہم بھی تھا اور دل پذیر بھی پڑھاتے پڑھاتے بہت سی کتابوں کے حافظ ہو جاتے تھے۔ اُن کے ملازمین آج بھی بڑے مدرس بھی ہیں اور با کمال مصنف و دانشور اور بھی۔ ندوۃ المصنفین کے تفریبات نامائے بڑے رفقا بزرگ آپ سے شرف تلمذ حاصل کر کے تفریق عالمی مرحوم کے مراتب بلند فرمائے۔ ہمیں اس حادثہ عظیم میں مولانا مرحوم کے اکلوتے صاحبزائے مولوی عبدالاحد صاحب دارالعلوم دیوبند کو دلی ہمدردی ہے اور ہم اُن کے شریک غم ہیں، امید ہے مولوی صاحب

قرآن اپنے متعلق کیا کتاب ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی

(۶)

احسن الحدیث | آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس کتاب کے اوصاف و خصائص اور امتیازات وہ ہوں جن کا ذکر سطور بالا میں تفصیل سے ہو چکا ہے تو اُس سے بہتر دوسرا کوئی کلام یا دوسری کوئی بات کیسے ہو سکتی ہے؟

کیونکہ اگر یہ صحیح ہے کہ کسی کلام کی عظمت و جلالت مشکلم کی شخصی عظمت و جلال سے وابستہ ہوتی ہے اور ہر ایک طرف سے وہی چھلکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے تو پھر تم ہی فیصلہ کرو کہ کلام الہی کا مقام کیا ہونا چاہیے اور جس کتاب اور کلام کی نسبت ذات خداوندی سے ہو اُس کو کس منقبت سے یاد کرنا چاہیے۔

وہ جب دورِ ماضی کے واقعات بیان کرتا اور اُن کے ذریعہ موعظت و عبرت کے درس دیتا ہے، وہ جب اوامر و نواہی سے متعلق خطاب کرتا ہے اور قبول و عدم قبول، وعدہ و وعید کو سناتا ہے، وہ جب کتب سماویہ کی تصدیق اور ہمین بن کر اُن کے نسخ و تخریف کا اعلان کرتا ہے، وہ جب اپنے اعجاز کو پیش کر کے پیروان مذاہب و ممل کو چیلنج کرتا ہے، وہ جب غوامض دسراٹر سے پردہ اٹھا کر حقائق کی روشنی میں ماضی اور مستقبل کے درمیان رشتہ اتحاد کو واضح اور ظاہر کرتا ہے تو چشم بصیرت افروز اور قلبِ عبرت آموز ایک لمحہ کے لیے بھی یہ کہنے میں جھجک محسوس نہیں کر سکتے کہ لاریب قرآن "احسن الحدیث اور بہتر بات" ہے اور اس کے امتیازات و خصوصیات کا مقابلہ دنیا کی باتیں، حکمتیں، احکام و مواعظ تو کیا کر سکتیں کتب سماویہ

میں سے بھی کوئی کتاب اور کوئی صحیفہ اس کے برابر نہیں رکھا جاسکتا۔
وہ احسن الحدیث ہے اس لیے کہ کوئی بات اپنی ادارہ اور تبصیر میں اُس کے خُسنِ اعجاز کو نہیں پہنچتی۔ اس لیے کہ کوئی کلام اُس کے غیر متبدل نظم و معانی کے علو اور بلندی کو نہیں پہنچتا۔
اس لیے کہ کوئی کتاب اُس کی موعظت و عبرت آموز نصیحت کے میعار کا مقابلہ نہیں کر سکتی،
اس لیے کہ صحیفہ غیب و شہود کے فیصلے اُس سے بہتر نہیں اور اُس کی ہمسری کرنے سے عاجز و درماندہ ہیں۔ اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ آفتابِ درخشاں کی طرح منور ہے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ۔

مثانی | قرآنِ عزیز یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ بری امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ میں "مثانی" ہوں "مثنی" لغت میں "دو۔ دو" کا مفہوم ادا کرتا ہے گویا کوئی بات اگر مکرر کہی جائے یا کوئی کلام اگر دہرایا جائے تو اُس پر "مثنی" بالتشدید کا اطلاق ہوا کرتا ہے اور قریب قریب اسی مفہوم کو "مثنی" بالتخفیف ادا کرتا ہے اور اعادہ و تکرار کا مطلب لیا جاتا ہے۔ پس قرآنِ عزیز اس لیے مثانی ہے کہ اُس کے اکثر و بیش تراکام اور مواعد و قصص، عبرت و نصیحت اور دل نشینی و دل پذیری کی خاطر مکرر اور بار بار دہرائے گئے ہیں اور علم النفس کے ماہرین کو اعتراف ہے کہ پسند و نصیحت کے مضامین کو دہرانا اور اُن کا بار بار اعادہ کرنا مقصدِ موعظت و بصیرت کے لیے نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری ہے۔

اور اگر یہ معنی لیے جائیں کہ اس کتاب میں خدائے برتر کی ثناء و منقبت کا پہلو تمام کتبِ سماویہ پر فائق و افضل ہے نیز اس کی بلاغت و فصاحت کا اعجاز گویا متکلم کی رفعتِ قدر و جلالتِ شان کی ثنائیں رطب اللسان ہے تو بھی قرآن اس مفہوم کے پیشِ نظر بلاشبہ "مثانی" ہے اور اس صورت میں اس کو "مثنیہ" بمعنی "ثناء" کی جمع تسلیم کرنا ہوگا۔

غرض ادارہ و تبصیر ہوا یا بندش نظم و الفاظ، مقامِ ہم و مطالب ہوں یا معانی و مقاصد ہر حیثیت سے قرآنِ حکیم "مثانی" ہے اور یہی اس کے اعجازِ کلام کے متعدد دلائل و براہین میں سے

روشن برہان ہے، اس لیے کہ جب وہ کسی واقعہ ماضی پر عبرت و بصیرت کے لیے روشنی ڈالتا ہے یا جب وہ کسی امر دنی کا اعلان کرتا ہے یا معاش و معاد کے سلسلہ میں کوئی فیصلہ سناتا ہے تو باوجود اس امر کے کہ ایک ہی واقعہ، ایک ہی حکم، ایک ہی مثال اور ایک ہی فیصلہ ہوتا ہے تاہم وہ اُن کو معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح مختلف طریقوں سے بیان کرتا ہے کہ ہر ایک مقام اپنی جگہ مستقل اور ضروری نظر آتا ہے اور کسی ایک جگہ کے متعلق بھی بے محل اور غیر مستحسن ہونے کا تو ذکر ہی کیا ہے غیر ضروری کہنے کی جبارت نہیں کی جاسکتی اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جس نہج اور جس اسلوب سے اس کا ایک جگہ ذکر ہوا ہے وہی اس کے لیے موزوں سے موزوں تر تھا اور اُس کی تکرار زیادہ سے زیادہ تلاوت و شیرینی کا باعث ہوتی ہے نہ کہ ملال و دل تنگی کا اور قند مکر کا اس سے بہتر نمونہ دنیا آج تک پیش نہیں کر سکی پس اگر اس لحاظ سے بھی اس کو "مثالی" کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی سماوی کتاب کی تلاوت کیجیے الفاظ کتاب کو ایک سے زیادہ مرتبہ تلاوت کرنے کے بعد اُس کے مسلسل پڑھتے رہنے کا ذوق پیدا نہیں ہوتا اگر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ معتقدانہ عشق و محبت کے پیش نظر اُس کے مطالب و مفاہم کے لحاظ سے ہو سکتا ہے لیکن قرآن عزیز کا نظم الفاظ اپنے اندر وہ جاذبیت رکھتا ہے کہ ایک نا سمجھ بچہ اور غریبی زبان سے ایک ناواقف شخص بھی جب اُس کو تلاوت کرتا ہے تو اُس کے ذوق تلاوت کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ بار بار خمار آلود انسان کی طرح پڑھتا اور حظ وافر حاصل کرتا ہے کیا اچھا کہا ہے کسی حکیم و دانائے قرآن کے متعلق یہ جملہ کہ "دنیا میں ایسی شے جس کی ادا کا شیریں سے شیریں نظم بھی مقابلہ نہ کر سکتی ہو قرآن ہو؟"

اللَّهُ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ اللہ نے اتاری بہتر بات، کتاب آپس

كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانٍ تَقْشِيرُ میں ملتی ادھرائی ہوئی بال کھڑے ہوتے ہیں

مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ اُس کی جلد پر اُن لوگوں کے جو ڈرتے

رَبِّهِمْ (زمر)

ہیں اپنے رب سے۔

بعض علماء اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن عزیز میں سورہ فاتحہ بھی شامل ہے اور اس کا جزر ہے اور وہ بار بار نمازیں دہرائی جاتی ہے اس لیے قرآن کو بھی ”مثانی“ کہا جانا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (حجۃ)

ذکر ہم نے دی میں تجھ کو سات آیتیں

المثنائی وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (حجۃ) وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا۔

بشیر و نذیر | قرآن حکیم جب کہ الہامی کتاب اور کلام الہی ہے اور وہ کائنات کی رشد و ہدایت کے لیے نسخہ کیمیا اور اکسیر اعظم ہے تو رشد و ہدایت کا فطری تقاضہ ہے کہ وہ ”بشیر“ بھی ہو اور ”نذیر“ بھی، کیونکہ کوئی ہدایت، ہدایت نہیں ہو سکتی جب تک وہ احکام الہی کے امتثال پر بشارت نہ سناتی ہو اور منہیات کی جانب رغبت پر عذاب الہی سے نہ ڈراتی ہو دراصل مذہب ہی ایسی پونجی ہے جو انسان کا اُس کے خالق و مالک کے ساتھ صحیح ارتباط پیدا کرنا اور آثار حقیقی کا بندوں کے ساتھ حقیقی تعلق قائم رکھتا ہو۔ وہی انسان کو نیک کرداری پر اجر کی بشارت دے کر نیک بناتا اور بد کرداری پر خوف و عذاب کی نذارت سن کر بدی سے باز رکھتا ہے۔ وہی یہ بتلاتا ہے کہ یہاں ہر عمل کسی نتیجہ کے ساتھ مربوط ہے اور ہر ایک کردار اپنے ثمرہ اور نتیجہ سے منسلک ہے۔ یہاں پاداشِ عمل کے قانون سے غافل ہو جانا ہلاکت اور اس کو ہمیشہ نظر رکھ کر زندگی کی متریں طے کرنا عقل و فطانت ہے۔ اس لیے نیکی اور بدی ایسے شجر ہیں جن کے پھل ایک دوسرے سے متضاد ہی وجود پذیر ہو سکتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ نیکی کے شجر پر بدی کا پھل اور بدی کے درخت پر نیکی کے پھول اُگ آئیں۔ اگر آگ کا کام گرمی پہنچانا ہے اور پانی کی ڈیوٹی خشکی کا فائدہ دینا تو بدی کے ذریعہ باغِ جہنم کی توقع کرنی اور نیکی کے بیج سے نارِ جہنم کے پودے کا انتظار کرنا اہلِ خرد کا کام نہیں ہے۔

یہی وہ حقائق ہیں جن کے ذکر کا نام بشارت و نذارت ہے اور ان حقائق کے پیش کرنے والے کو ”بشیر“ و ”نذیر“ کہتے ہیں چنانچہ یہ خدمت انبیاء و رسل کی زبانِ وحی ترجمان بھی

ادا کرتی رہی ہے اور وہ کتبِ سماویہ بھی جو خدا کی ہدایت و رشد اور دعوتِ حق کے لیے نازل ہوتی ہیں۔

پس قرآن کتنا ہے کہ جس طرح مجھ سے پہلے خدا کی کتابیں بشیر و تذہیب کر آئی ہیں اسی طرح میں بھی بشیر و تذہیب ہوں، فرق صرف اسی قدر ہے کہ مجھ سے قبل کتبِ سماویہ کا نزول خاص خاص ملکوں اور قوموں کے لئے رہا ہے اور میں قانونِ کامل، پیغامِ مکمل بن کر رہتی دنیا تک تمام کائناتِ انسانی کے لیے نازل ہوا ہوں اور میرا یہ امتیاز تمام صفاتِ عالیہ کے اندر جاری و ساری ہے اور میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اسود و احمر اور ابیض و اصفر سب ہی کے لیے بشیر و تذہیب ہوں۔

میں یہی اعلان کرتا ہوں کہ اعمال اور جزائرِ اعمال کے درمیان کو عقلی اور فطری رشتہ لازم و ملزوم قائم ہے تاہم یہ رشتہ علت و معلول کا رشتہ نہیں ہے کہ اندھی فطرت اور بے شعور قدرت کے ہاتھوں قائم ہے اور ان کے مرتب و ناظم کے ارادہ و اختیار کو اس بارہ میں قطعاً کوئی دخل نہیں بلکہ مرتبِ ناظم کتنا ہی غلط ٹھہرے اس کے برعکس مذہب اور دین کا پیغام حق اس شہادتِ کبریٰ کا بھی اعلان کرتا ہے کہ یہاں عمل اور پاداشِ عمل کا معاملہ گو قانونِ قدرت کے زیر اثر کار فرما ہے تاہم یہ قانونِ فطرت اور پنچر پر منحصر قانونِ قدرت اس برتر ہستی کے یہ قدرت کی گرفت میں ہے جو بے قید قدرت کے ساتھ ساتھ ارادہ و اختیار بے چون و بے چگون کی بھی مالک ہے اس لیے اس درگاہ میں دیر تو یہ بھی واجب ہے اور ہر لمحہ یہ بشارت ٹوٹے ہوئے دلوں اور گناہ پر مشر مندہ عاصیوں کے لیے مرہم کا کام دیتی ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے
عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا	اے میرے وہ بندہ جو (گناہ کر کے)
مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ	اپنے نفسوں پر حد سے گزر گئے ہیں
يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا	خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ

بلاشبہ اشر نام گناہوں کو بخش دیتا ہے

(زمر)

بلاشبہ وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے

اور نیکو کار انسانوں کو ڈراتا ہوں کہ کہ کہیں نیکو کاری پر نمازاں اور مغرور نہ ہو جانا کہ ساری نیکی برباد ہو کر شعلہ نار کا ذخیرہ نہ بن جائے۔

هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ

وہ تم کو خوب جانتا ہے جب اُس نے

مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجْنَاءٌ

تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب تم

فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ فَلَا تُرْكَوْا

اپنی ماؤں کے پیٹوں میں چھپے نہ ہو

أَنْفُسُكُمْ هُوَ أَعْلَمُ

تو اپنے آپ کو پاک نہ کہو، وہ خوب

بِمَنِ اتَّقِهِ ۝ ۳۳

جانتا ہے جو متقی ہے۔

اور ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی واضح کرتا ہوں کہ ثواب و عقاب کا یہ تعلق چونکہ نیک و بد اعمال کے ساتھ وابستہ اس لیے تعلق قانونِ فطرت کے پیشِ نظر صحیح اور درست ہے لیکن یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اعمال کا تعلق اپنے ثمرات کے ساتھ حقیقی نہیں بلکہ صاحبِ ارادہ و اختیار ہستی کے قائم کر دینے پر ہے کہ اُس نے یوں ہی فیصلہ کیا ہے اور اس طرح قانون بنادیا ہے لہذا جنت و جہنم اور ثواب و عقاب کا حقیقی تعلق اُس کے اپنے فضل و کرم سے وابستہ ہے اور جنت و جہنم اُس کی رضا و عدم رضا کا ثمرہ و علامت ہے معلول نہیں۔ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ پس یہی وہ حقیقت ہے قرآنِ عزیز جس کا اس طرح اظہار کرتا ہے

كِتَابٌ فَصَّلْتُ آيَاتُهُ

ایک کتاب ہے کہ جدا جدا کی گئی

قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ

میں اُس کی آیات قرآن ہے عربی

بَشِيرًا وَنَذِيرًا

زبان کا سمجھ والوں کے لیے خوشخبری

سنانے والا اور ڈرتانے والا۔

مبارک اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ جو کتاب ہدایت و سعادت کا پیام، فلاح و نجات کی رہنمائی، معاش و معاد کی رہبر، بند و موہ عظمت کا ذخیرہ، حکمت و حکم کا مخزن، قصص و امثال کا معاد، خطاب حق کا مبلغ، دعوت الی الحق کا مناد، نیکی و بدی کی بشیر و نذیر ہو اُس سے زیادہ اور بہتر کون سی کتاب ہو سکتی ہے اور حب سرمدی اور ابدی نجات کا سوال درمیان میں آجائے تو قرآن کے ماسوا کس کو پیش کیا جاسکتا ہے؟ قرآنی کتاب ہی اگر ”مبارک“ نہ کہلائے تو پھر اس موقر لقب اور معزز خطاب کا استحقاق کس کو پہنچ سکتا ہے؟ بلاشبہ قرآن حکیم مبارک کتاب ہے اور حب کہ اُس کی نازل کرنے والی مقدس ہستی خود صاحب برکت و سعادت ہو ”تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ“ اور جس کا نزول مبارک رات میں ہوا ہو ”إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ“ تو پھر وہ کلام کیوں ”مبارک“ نہ ہو۔

هَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ
فَاتَّبِعُوهُ
یہ کتاب ہے ہم نے اُس کو اتارا
ہے مبارک پس تم اس کی پیروی
کرد

(انعام)

مناوی | نداء، پکار، صدا، اُس آواز کا نام ہے جو غافلوں کو ہشیار، خوابیدہ کو بیدار، اور بے پرواہ انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ قرآن بھی اس مفہوم کے پیش نظر پکارنے والے کی پکار، صدائے خوش ہنگام اور نداء از خواب گراں خیز ہے وہ صوت ہادی ہے اور برق باطل سوز، وہ رعد حق ہے اور صدائے دل آویز، اس صدائے دلکی دلوں کو تسکین دی، بہروں کو شنوا، اندھوں کو سوجا کھا اور گونگوں کو گویا بنا دیا۔

یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی آواز بے شک صحرا میں ایک پکارنے والے کی پکار تھی مگر بنی اسرائیل کی بھٹکتی ہوئی بھڑوں کے لیے، یسوع مسیح کی صدا یقیناً صدائے حق تھی مگر فریسیوں، صدوقیوں، اور اسرائیلیوں کے لیے۔ نداء موسیٰ بلاشبہ صوت ہادی تھی لیکن فرعونوں اور یہودیوں کے لیے لیکن قرآن کی ایک ہی رعد آسا اور برق مثالی صدا آنے

سارے عالم کو جگا دیا اور تمام کائنات میں اپنی صوت ہادی سے تہلکہ ڈال دیا اور ہر سمت اور ہر گوشہ میں اقدار عالم کو زیر و زبر کر دیا۔

نہیں وہ دھول کی آواز نہیں ہے کہ تنہی دامن ہو اور نہ وہ رعد کی کڑک ہے کہ شنوا کو بہرہ بنادے اور نہ وہ برق چشمک زن ہے کہ بصارت و بصیرت کو بے نور کر دے اور نہ وہ صحرائیں پکارنے والے کی صدا ہے کہ بے اثر ہو کر رہ جائے بلکہ وہ نثار حق ہے، صوت ہدیٰ ہے، صدائے خدا ہے، اس لیے حق کی سر بلندی، ہدایت کی سربراہی اور اعلیٰ کلمۃ اللہ کی آبیاری اُس کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں۔

کامرانی اُس کے دامن کو چومتی اور کامگاری اُس کے قدموں پر نثار ہوتی ہے اور ”اَنْتُمْ الْاَعْلٰی کُنْ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنٰیْنَ“ کا اعلان کر کے اپنے فداکاروں کے لیے معراجِ فلاح و نجات کا تمغہ بخشی اور تاجِ علو عطا کرتی ہے۔

یہ جو کچھ کہا گیا اور کہا جا رہا ہے لفظی صفا آرائی اور تعبیری زیب و زینت و زیبائی نہیں ہے بلکہ ناقص اور در ماندہ الفاظ و عبارت میں اصل حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ مبالغہ تو کجا حقیقتِ ثابتہ کے رخ روشن کی صحیح تصویر بھی نہیں حقیقت تو بلاشبہ اس سے بھی بلند و ارفع ہے۔

رَبَّنَا اِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا

يُنَادِيَنِي لِئَلَّا يَمُنَ اَنْ اُمِنُوْا

بِرَبِّكُمْ فَاْمَنَّا

(آل عمران)

اے پروردگار! بلاشبہ ہم نے پکارنے

والے کی پکار کو سنا جو ایمان کے لیے

ہے۔ وہ یہ کہ اپنے پروردگار پر

ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان

لے آئے۔

یہ صحیح ہے کہ ”منادی“ سے ذاتِ قدسی صفات (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی مراد ہے مگر اس کے باوجود قرآن کو ”منادی“ کہنا اشکال کا موجب نہیں ہے اس لیے کہ منادی کی

نذار حق جب کہ "ایمان برب العلمین" ہے تو اس نذار کا مصداق جس طرح پیغمبر خدا کی شخصیت ہو سکتی ہے اُن طرح وہ کتاب بھی اس کا مصداق بن سکتی ہے جس کو کلام الہی کہہ کر پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) امت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور جو اپنے اعجازِ بلاغت و فصاحت اور معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ راہِ ہدایت و سعادت کی جانب پکار پکار کر ہم گم کردگانِ راہ کو راہِ مستقیم سے روشناس کراتی ہے۔

علم پھر اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کے تمام کار و بار اور ہر قسم کے معاملات و امور کا مدار دو حقیقتوں پر ہوتا ہے ایک علم اور دوسری عمل۔ اس لیے کہ اگر علم حاصل ہے مگر عمل مفقود تو وہ "علم" تعطل اور بے کاری کی نذر ہو جائے گا اور اگر عمل موجود ہے مگر "علم" سے محرومی ہے تو وہ عمل کیسے مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا بلکہ موجب نقصان و خسران بن جائے گا تو یوں کہیے کہ دنیا کے امور کی گاڑی کے یہ دو پیٹے ہیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی موجود نہ ہو گا تو گاڑی کا چلنا معلوم؟ پس اسی طرح دینی امور اور روحانی معاملات بھی ان ہی دو حقیقتوں کے اشتراک سے وابستہ ہیں اور ان دونوں کی صحت و سقم پر روحانی اور دینی امور کے صحت و سقم کا دار و مدار ہے۔

تو اب یہ دعویٰ بے دلیل نہ ہو گا کہ روحانی سعادت اور سرمدی فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے کائناتِ انسانی کے لیے مسطورہ بالا دونوں حقیقتوں کا خلاصہ اور عطر عطا کر دیا ہے اور ان ہی ہر دو حقیقتوں کا نام مذہب کی اصطلاح میں قرآن اور اسوۂ حسنہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ قرآن علم ہے اور اسوۂ حسنہ عمل اور ان ہی کا مجموعہ سعادتِ ابدی اور فلاحِ سرمدی، جتنے لیے کفیل ہے۔

اس حقیقت کا بیان ان الفاظ میں بھی کیا جاسکتا ہے کہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے تمام انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو تصدیقِ نبوت و رسالت کے سلسلہ میں جو بھی معجزات عطا ہوئے وہ سب کے سب عملی تھے۔ مثلاً یونس، عیسا، عیسیٰ، موسیٰ

دم قیسی، ناقہ صالح (علیہم السلام) اور اسی طرح کے دوسرے معجزات علمی معجزات تھے اور اس بنا پر ان انبیاء علیہم السلام کے بعد یا ان کی زندگی ہی میں اپنا مقصد پورا کر کے ختم ہو گئے اور اگرچہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بہت سے علمی معجزات دیے گئے مگر ان سب کے برعکس آپ کو قرآن ایسا معجزہ عطا ہوا جو علمی ہے اور اسی وجہ سے وہ ابدی و سرمدی پیغام ہے جس کے ختم اور فنا ہو جانے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

غرض وہ خدائے برتر کا معجز کلام کائنات جن و انس کی فلاح دارین کا مکمل نظام علوم و معارف کا گنجینہ، اتقان و اذعان کا خزینہ، حیات سرمدی کا سرچشمہ اور نجات ابدی کا ضامن ہے اور یہ صرف اس لیے کہ وہ ”علم“ ہے۔

وَلَیِّنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۡهُمْ
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۡءَكَ مِنْ
الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذَا الْمَسَّ
الْظَّالِمِیْنَ ہ (بقرہ)

اور اگر تم نے ان کی خواہشوں
کی پیروی کی بعد اس کے کہ تم کو
پہنچ چکا ”علم“ تو بے شک تم بھی
بے انصافوں میں ہو گئے۔

فَمَنْۢ حَاجَّكَ فِیۡهِ مِنْۢ
بَعْدِ مَا جَاۡءَكَ مِنَ الْعِلْمِ
(آل عمران)

پھر جو جھگڑا کرتے ہیں تم سے اس
قصد میں بعد اس کے کہ آپہنچا تھا
پاس ”علم“ (بھی خبر)

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤهُ حُكْمًا
عَرَبِیًّا وَّلَیِّنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۡهُمْ
بَعْدَ مَا جَاۡءَكَ مِنَ الْعِلْمِ
مَا لَكَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ مِنْۢ شَیْءٍ وَّ

اور اسی طرح ہم نے اتارا یہ کلام
حکم عربی زبان اور اگر تم ان کی خواہش
کے مطابق چلے بعد اس کے کہ تم
کو ”علم“ پہنچ چکا تو کوئی نہیں تیرا

لَا وَاۡقُ ہ (رعد)

حمایتی اور بچانے والا اشرے۔

عدل [لیکن کسی کتاب یا دستور کو اگر صرف یہی شرف حاصل ہو کہ وہ ”علم“ ہے تو مقصدِ رشد

وہدایت کے لیے یہ کافی نہیں ہے اور تشنہ آب بقا کی سیرابی اور تسکین کا باعث نہیں ہو سکتا تا وقتے کہ یہ بھی ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ”عدل“ پر مبنی ہے اور جو علم یقین اور اذعان و ایقان اُس نے ہم کو عطا کیا ہے اُس کا ہر ایک فیصلہ اُس کی ہر ایک ترغیب و ترہیب اُس کی ہر ایک تعلیم افراط و تفریط دونوں سے جدا سراسر ”عدل“ ہے۔

علماء لغت جب ظلم و عدل کے معنی بیان کرتے ہیں تو ”وضع اشیٰ فی غیر محلہ۔ کسی شے کو اُس کے حقیقی مقام پر نہ رکھنا“ کو ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور ”وضع اشیٰ فی محلہ۔ ہر شے کو اُس کے حقیقی مقام پر جگہ دینا“ عدل کہلاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اگر قرآن یہ نہ بھی کہتا کہ وہ ”عدل“ ہے تب بھی اس لیے عدل ہوتا کہ وہ عدل سے حکیم و خبیر کا کلام ہے جو ظلم کے ہر ایک شائبہ سے دور اور پاک ہے لیکن قرآن نے صرف اس عقلی استدلال ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس سے آگے صاف اور صریح الفاظ میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھا کہ قرآن کلام الہی ہے، اور بلاشبہ وہ ”عدل“ بھی ہے۔

اور یہ تو بارہا کہا جا چکا ہے کہ ان جیسے مقامات پر قرآن اسم فاعل کے صیغے استعمال نہیں کرتا بلکہ صفت کے صیغہ کو ترجیح دیتا ہے اس لیے کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ وصف اُس کے اندر بدرجہ تمام و کمال موجود ہے اور اس طرح موجود ہے کہ گویا موصوف اور صفت کے درمیان دوئی کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ اور اس مقام پر تو خصوصیت کے ساتھ اس لیے بھی اُس نے ”عادل“ کی جگہ ”عدل“ کے ساتھ تعبیر کیا کہ یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ قرآن اگر صرف عادل ہوتا اور عدل نہ ہوتا تو یہ کہنے کی گنجائش رہتی کہ کسی عادل اور منصف کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی بھی حالت اور کسی بھی وقت میں عدل کے خلاف نہیں کر سکتا یا نہیں کہہ سکتا کیونکہ بہت سے عادل گاہے نادانستہ ہی عدل کے خلاف کہہ گزرتے یا کر گزرتے ہیں۔ تاہم چونکہ اُن کے اندر یہ وصف اکثر و بیش تر موجود پایا جاتا ہے اس لیے اُس کو عادل ہونے سے خارج نہیں کیا جاتا۔

مگر قرآن حکیم چونکہ وہ عادل نہیں ہے کہ جس کا وصفِ عدل کبھی دانستہ یا نادانستہ اُس سے جدا ہو جاتا ہو بلکہ اُس کا ہر ایک فقرہ اور ہر ایک جملہ عدل ہی عدل ہے تو اس لیے ضروری ہوا کہ اُس کو "عادل" نہ کہا جائے بلکہ "عدل" کہا جائے تاکہ ہر ایک شخص باسانی یہ سمجھ جائے کہ قرآن کے دائرہ میں عدل، قرآن ہے اور قرآن، عدل ہے گویا لازم و ملزوم میں انفکاک و جدائی ممکن ہے لیکن قرآن اور عدل کے درمیان مفارقت محال اور ناممکن ہے اسی لیے قرآن عزیز نے بڑی اہمیت مگر معجزانہ اختصار کے ساتھ اس حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ اور تمہارے پروردگار کی بات

صِدْقًا وَعَدًا (الانعام) پوری سچی ہے اور انصاف کی

غرض جو بات یا جو حقیقت نقص و خام کاری سے پاک، افراط و تفریط سے بالاتر، بے محل و بے موقع ہونے سے بلند و بالا اور ہر حیثیت سے اعتدال و انصاف گیر ہو اُس کا نام "عدل" ہے اور یہی ہے وہ عدل جس کو اس آیت میں قرآن حکیم کی صفت ظاہر کیا گیا ہے اور یہی صفت اس کی دلیل ہے کہ قرآن ابدی پیغام اور سرمدی قانون ہے کیونکہ بقا و اصلاح کے قانون کا تقاضا ہے کہ جب کوئی شے اپنی جگہ چھوڑ دے اور بے محل ہو جائے تو گویا اُس نے جگہ نہیں چھوڑی اور بے محل نہیں ہوئی بلکہ اُس نے اپنے فناء کے پیغام پر دستخط کر دیے اور وہی شے بقا و دوام کا مقام حاصل کر سکتی ہے جو ہر حیثیت سے با محل، کامل، تام، صادق، اور عادل ہو۔ اور جس میں یہ تمام صفات یک جا جمع ہوں تو وہ صادق و عادل ہی نہیں ہے بلکہ "صدق" و "عدل" ہے اور بقا و دوام اور حیاتِ مدام کی سمد و رفیق۔

(باقی آئندہ)

حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ

از

جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی، ایم، اے

محمد شاہ کی دلی ہے۔ زوال و انحطاط کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔ قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے۔ سکھ اور مرہٹے ہر طرف لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں۔ نادر شاہ کا قتل عام اسی سرزمین پر ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار بچکیاں لے رہا ہے اور دم توڑنا ہی چاہتا ہے جس دور کی ابتدا، ایک دایلمنٹش کی رزم آرمیوں سے ہوئی تھی وہ آج محمد شاہ کی رزم آرمیوں اور ہنگامہ ہائے ناؤ نوش میں ختم ہو رہا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے۔

آنحضرت کو بتاؤں میں تقدیر اہم کیا ہے
شمس و سناں اول طاؤس و رباب آخر (اقبال)

اس سیاسی بدامنی اور اخلاقی پستی کے زمانہ میں اللہ کے کچھ بندے درس و تدریس کے کام میں مشغول ہیں، ہوا تیز و تند ہے لیکن وہ اپنا چراغ جلا رہے ہیں طوفان امنڈتا چلا آرہا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتے اور اپنے کام میں اسی طرح مشغول ہیں۔ دہلی میں جس کا عالم بقول حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے یہ تھا۔

بہا مدارس لو طاف لبصیرہا لکھتے عینہ الالاعی علی الصحیف
جس طرف نکل جائے، اس میں مدارس نظر آئیں گے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگا۔ (شاہ عبدالعزیز)

دور سے ایسے ہیں جو اس وقت دلی کی جان ہیں۔ ایک مدرسہ رحیمیہ جس میں دربار ولی اللہی سچ رہا ہے اور ایک زبردست انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ اور دوسرا جمہوری دروازہ کا مدرسہ جس میں دکن کا ایک نو عمر عالم کسی روحانی اشلے پر آقا قاسم گزیریں ہو گیا ہے۔ تقریباً نصف صدی قبل اس نوجوان کے والد کو دہلی کے ایک مشہور بزرگ نے دکن میں تبلیغ و اصلاح کے کام کے لیے بھیجا تھا۔ آج اُس کا یہ فرزند علم و عرفان کی شمع جلانے کے لیے دکن کو چھوڑ کر دہلی چلا آیا ہے دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کچھ کر اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں۔ اس کی جتوں میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا ہے وہ اسی کا ہو جاتا ہے جب حدیث کا درس دینا شروع کرتا ہے تو سننے والوں پر ع

فتاد ساسدہ در سوجہ کوثر و تسنیم

کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

یہ شاہ فخر الدین صاحب ہیں ان کے والد شاہ نظام الدین صاحب اورنگ آبادی حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب دہلوی کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ تھے اور ان ہی کے حکم کے مطابق وہ دکن چلے گئے تھے۔ اس مضمون میں ان ہی کے حالات سے بحث کرنی ہے

ولادت | شاہ فخر الدین صاحب کی ولادت باسعادت ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء کو بمقام اورنگ آباد ہوئی۔ جب حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب کو اپنے عزیز مرید شاہ نظام الدین کے تولد فرزند کی خبر پہنچی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ فخر الدین نام تجویز کیا۔ اے اور اپنا طبقہ خاص نو مولود کے لیے

یہ وہی مدرسہ ہے جس کی نسبت مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم لکھتے ہیں اس مدرسہ میں چھوٹے چھوٹے مکان بن گئے ہیں، چوہان کسان وغیرہ غریب لوگ رہتے ہیں۔ یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ (شاہ ولی اللہ) کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نماز پڑھتے تھے۔ اب چونکہ یہ کل جائداد رائے بہادر لالہ شیو پر شاہ صاحب کی ہے اس لیے اس مغل پر مدرسہ رائے بہادر لالہ ام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے "تاریخ دار الحکومت دہلی" ج ۲ ص ۱۶۷) فاعقبوا وایا اولی الزبصار (برہان) ۱۷ مناقب فخریہ (قلمی) ص ۷۷ اس کتاب کا ذکر میں نے اکتوبر ۱۹۷۷ء کے برہان میں کیا تھا میں اپنے محترم بزرگ جناب قاضی جمیل احمد صاحب نظامی نیاری کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اندازہ کرم اس کتاب کا نسخہ (باقی ص ۳۳)

عنایت فرمایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس بچے کے شاندار مستقبل کی بشارت دی۔ ایک مجلس میں خود شاہ فخر الدین صاحبؒ نے اس کا ذکر اس طرح فرمایا۔

”حضرت شیخ بعد تولد من رقعہ کہ برائے حضرت صاحب قبلہ نوشتہ بودند چنانچہ تا

حال آں رقعہ ہمیشہ است برائے من بسیار بشارات و الفاظ زیادہ تر از رتبہ

من نوشتہ اند و بہ تصدیق کلمہ ایساں حق تعالیٰ بر من رحمت کردہ است“ ۱۷

شاہ صاحبؒ نے اس مکتوب میں یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ لڑکا شاہ جہاں آباد میں ہدایت و ارشاد کی شمع روشن کرے گا ۱۸

شاہ فخر الدین صاحبؒ کے چار بھائی اور ایک بہن تھی۔ ایک بھائی حقیقی تھے باقی سب

علائی۔ بڑے اور حقیقی بھائی کا نام محمد اسماعیل تھا ۱۹ باقی تینوں بھائیوں کے نام غلام معین الدین

غلام بہار الدین، غلام کلیم اللہ تھے۔ بڑے بھائی خواجہ کامگار خاں تھے ۲۰ مرید تھے۔ باقی تینوں بھائی شاہ فخر الدین صاحبؒ سے بہت تھے۔ ۲۱

شاہ فخر الدین صاحبؒ کے بڑے بھائی بہت سادہ لوح اور نیک طینت ۲۲ اور تھے۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ فرمایا کرتے تھے۔

”برادر کلان من بسیار سادہ بود و مرا بہ لفظ ملایا ذکر و نہد، بر این جہت کہ ایساں اکثر

بہ تماشا مشغولی شدند و ہم این ذوق داشتند من اکثر کم حاضر می شدم مرا

ملای گفتند“ ۲۳

(بقیہ) مجھے عنایت فرمایا۔ اس مضمون کی تیاری میں اس کتاب سے بہت مدد ملی ہے۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ (قلمی) ص ۱۰۶ یہ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کا مفوظ ہے اور اُن کے ایک مرید سید نور الدین حسینی فخری نے سب کیا ہے میرے پیش نظر قلمی نسخہ کا سنہ کتابت ۱۳۴۲ قمری ہے۔ ۲۴ مناقب فخریہ۔ ص ۸ ۲۵ شجرۃ الانوار مصنف۔

رحیم بخش۔ میں اُن کا نام عماد الدین خاں لکھا ہے۔ اور محمد اسماعیل نام کو غلط بتایا ہے۔ ۲۶ یہ حضرت شاہ نظام الدین صاحبؒ کے مرید اور خلیفہ تھے انہوں نے اپنے پیر کے مفوظات ”حسن الشائل“ کے نام سے مرتب کیے ہیں۔

۲۷ مناقب فخریہ۔ ص ۹۔ ۲۸ فخر الدین صاحبؒ۔ ص ۱۰۰

شاہ فخر الدین صاحب کو اپنے بہن بھائیوں سے بڑی محبت تھی اپنی بہن کو اما کہا کرتے تھے بڑے بھائی کا جب انتقال ہوا تو نہایت رنجیدہ اور غمگین ہوئے۔

سلسلہ نسب | حضرت شاہ فخر الدین صاحب کا سلسلہ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی کے اور لقب واسطہ سے حضرت صدیق اکبرؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ نے اپنے سلسلہ حدیث میں اپنے آپ کو صدیقی لکھا ہے۔ آپ کی والدہ جن کا نام سید بیگم تھا حضرت سید محمد گیسو دراز کے خاندان سے تھیں۔

حضرت شاہ فخر الدین صاحب کا لقب ”حب الہی“ تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آپ نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لقب سے مخاطب کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا۔

تسلیم | شاہ فخر الدین صاحب کی تعلیم نہایت اعلیٰ پایہ پر ہوئی تھی۔ اُن کے والد شاہ نظام الدین خود بڑے ذی علم بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے اس بیٹے کی جس کے شاندار مستقبل کے متعلق حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب بشارت دے چکے تھے۔ تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ اور اس زمانہ کے نہایت ہی مشہور علماء سے اُن کی تکمیل تعلیم کرائی۔ حضرت شاہ نور محمد صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ فخر الدین صاحب نے نہایت ہی بلند پایہ بزرگوں سے تحصیل علوم کیا تھا۔

۱۰۷ (دلی) ۱۰۸ (ایضاً ص ۶۰ دلی) سے تکرار سیر الاولیاء از گل محمد احمد پوری۔
 ۹۴۔ مناقب فخریہ ص ۵۔ شجرۃ الانوار، از رحیم بخش (دلی) یہ چھپتہ سلسلہ کی مکمل تاریخ ہے اور کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا مصنف حضرت شاہ فخر الدین صاحب کا مرید ہے۔ میرے پیش نظر جو نسخہ ہے اس کا سنہ کتابت ۱۲۸۱ھ ہے۔ اس کتاب کے لیے میں اپنے محترم بزرگ جناب مولوی حکیم عبدالرب صاحب نظامی خلیف حضرت مولانا علیم محمد حسن صاحب کا ممنون احسان ہوں کہ اُن کی عنایت سے مجھے اس کے مطالعہ کا موقع ملا۔

۱۰۸ تکرار سیر الاولیاء۔ مناقب فخریہ ص ۴

۱۰۹ تکرار سیر الاولیاء۔ ۱۰۸ ایضاً ص ۱۰۹

آپ نے فصوص الحکم، صدرا، شمس بارغہ، وغیرہ کتابیں میاں محمد جان سے پڑھی تھیں میاں محمد جان بڑے جید عالم تھے۔ اُن کو حضرت محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف پر بہت عبور تھا۔ اور اُن کے فلسفہ کے پورے ماہر استاد تھے۔ یہ انہوں نے شاہ فخر الدین صاحب میں بھی امام اکبر کے فلسفہ کا درک پیدا کر دیا۔ ایک زمانہ میں شاہ فخر الدین صاحب نے ابن عربیؒ کے فلسفہ وحدت وجود کی تشریح میں ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ امام اکبر کے باریک نکات کو عوام خاطر خواہ طریقہ پر نہ سمجھ سکیں گے اور پھر شائع کو بدنام کرنا شروع کر دیں گے، اپنے ارادہ سے باز رہے۔ ۱۷

علاوہ ازیں شاہ فخر الدین صاحب نے کتاب ہدایہ اپنے عہد کے دوسرے عظیم فکر تہمت بزرگ اور عالم حضرت مولوی عبد الحکیم صاحب سے پڑھی تھی۔ مولانا عبد الحکیم صاحب اپنے زمانہ کے مشہور فقیہ تھے۔ ان کا توکل اور علمی تبحر دونوں مشہور تھے۔ تکلمہ میں لکھا ہے۔

”بزرگے خوب عالم بود..... در علم فقہ تمام ہمارت داشت وہم توکل

بدرجہ اتم بود“ ۱۸

اُن کے زہد و توکل کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات پا جامہ تک اُن کے پاس نہ ہوتا تھا اور ایک ”نیمہ“ میں گذر اوقات کرتے تھے۔ ایسے بزرگوں کی صحبت سے ظاہر ہے کہ شاہ فخر الدین صاحب کو کس درجہ استغنا اور توکل کا سبق ملا ہوگا۔

شاہ فخر الدین صاحب نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ نظام الدین صاحب سے بھی کچھ کتابیں پڑھی تھیں۔ شرح وقایہ، مشارق الانوار، اور نفحات الانس اُن ہی سے پڑھیں ان تمام درسی کتابوں کے علاوہ شاہ صاحب نے دیگر علوم و فنون سے بھی واقفیت حاصل کی۔ طب اور تیر اندازی کے متعلق کتابیں پڑھیں۔ فنون سپاہ گری میں انہوں نے کافی ہمارت حاصل کی۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے:-

۱۷ تکلمہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۰۶ ۱۸ فخر العالیین ص ۷۷، ۷۸ تکلمہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۰۷-۱۰۸

”ذات پاک کہ جامع جمیع علوم و فنون اند و درین فن دہیاد گری اہم ہمارے نام

داشتند“ ۱۷

بیعت | آپ کے والد ماجد آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور آپ کی اصلاحِ باطن کی جانب خاص توجہ فرماتے تھے۔ چنانچہ بچپن ہی میں آپ کو اپنا مرید کر لیا تھا۔ ۱۸ شاہ نظام الدین صاحبؒ کے انتقال کے وقت شاہ فخر الدین صاحبؒ کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔ باپ نے قاضی کریم الدین کے ذریعہ سے (کہ نسبت خویشی بہ آں جناب داشت۔ ص ۱۰) اپنے عزیز بیٹے کو قریب بلایا اور دیر تک اپنے سینہ مبارک سے جو آئینہ سے بھی کہیں زیادہ بہتر تھا چسپاں رکھ کر اپنی تمام باطنی نعمتیں بیٹے کے سینہ میں منتقل کر دیں اور اُس کے بعد آپ کی روح پر فتوحِ عالم قدس کی طرف پرواز کر گئی۔ ۱۹

شاہ فخر الدین صاحبؒ نے ابھی تکمیلِ علوم نہیں کی تھی۔ باپ کے مرنے کے تین سال

بعد تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۰

شکریں ملازمت | تعلیم سے فراغت پانے کے بعد، باپ کے سجادہ پر بیٹھنے کے بجائے آپ نے شکریں ملازمت کر لی۔ لیکن دوشی فطرت کا تقاضا تھا۔ اس لیے اس کو کسی طرح نہ مال سکتے تھے۔ اگر دن تیغ و سنان کی جھنکاروں میں گذرتا تھا تو رات رکوع و سجود میں۔ مناسبتِ فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر الدین صاحبؒ تمام تمام رات خیمہ میں عبادت کرتے رہتے تھے۔ آپ کو اس زمانہ میں اخفاءِ حال کی سخت فکر رہتی تھی اب انتہائی سخت ریاضت اور محنت کرتے تھے لیکن کسی کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی جو لوگ آپ کی ظاہری حالت کو دیکھتے تھے وہ کبھی اس بات کا گمان بھی نہیں کر سکتے تھے کہ یہ شخص اس قدر روحانی مراتب طے کر چکا ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ آخری زمانہ میں اپنی سابقہ ریاضتوں کے متعلق فرمایا۔

”من در ایام سابقہ محنت در مشغولی ہم بسیار کردہ ام“ ۲۱

۱۷ مناقب فخریہ ص ۲۱ ۱۸ فخر الطالبین ص ۱۱۲ ۱۹ مناقب فخریہ ص ۱۰ ۲۰ ایضاً ص ۱۱۲ ۲۱ فخر الطالبین ص ۱۲

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ آپ نے آٹھ سال تک رات دن مشقتیں اٹھائی تھیں۔
 لشکر میں آپ نظام الدولہ بہادر ناصر جنگ اور بہت یار خاں کے ساتھ رہتے تھے۔
 مناقب فخریہ میں لکھا ہے :-

”بہ صحبت نواب نظام الدولہ ناصر جنگ عم مغفور راقم غصی اللہ عنہ و بہت یار
 خاں غفر اللہ اوقات بسر بردند و فوج کشی ہا و شمشیر زنی ہا نمودند و صوم دانمی
 در اں حالات می داشتند“ لکھ

لشکر میں گو آپ نے اپنے کمالات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ جب شہرت
 زیادہ ہوئی تو لشکر کو چھوڑ کر اورنگ آباد پہنچ گئے۔

اورنگ آباد میں | اورنگ آباد پہنچ کر شاہ صاحب اپنے والد کے سجادہ مشیخت پر جلوہ افروز
 قیام ہوئے۔ اس زمانہ میں بھی آپ کا یہ اصول رہا کہ حتی المقدور اظہار حال سے
 گریز فرماتے اور اپنے روحانی کمالات کو پوشیدہ رکھتے۔ لیکن جس خانقاہ اور سجادہ سے آپ متعلق
 تھے وہاں اس کا اخفا کرنا آسان نہ تھا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کو آپ کے کمالات باطنی اور ریاضی
 شاقہ کا علم ہوا اور ساتھ ساتھ عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھنا شروع ہو گیا۔

”روز بروز شہرت در افزائش شد۔ آن حضرت دیدند کہ تمام ملک دکن
 اشتہار شد۔ خواستند کہ بجائے دیگر عزم فرمایند و ستر حال را بجال دارند“ لکھ

لیکن اورنگ آباد چھوڑنا بھی اُن کے لیے آسان نہ تھا۔ جب وہاں سے روانگی کا ارادہ کرتے
 تو دل میں یہ خیال آتا کہ یہاں میرے والد اور مرشد کا فرار ہے۔ آخر کس طرح اس کو چھوڑ کر چلا جائے
 اس خیال کے بعد پھر ارادہ نسخ کر دیتے اسی کشمکش میں تھے کہ ایک رات کو آپ نے
 خواب میں اپنے والد شاہ نظام الدین صاحب کو یہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا۔ یہ
 شہ اقلیم قفرم بے خودی تخت رواں است نہ چوں فرہاد فردورم نہ چوں محبوں زندگار

لکھ فخر الطالبین ص ۱۱ لکھ مناقب فخریہ ص ۱۱ لکھ تملہ سیر الاولیاء ص ۱۰۹ لکھ ایضاً ص ۱۱

مولانا دہم کے اس شعر سے کچھ استقلال پیدا ہوا

بند بگسل باش آزاد اے پسر

چند باشی بند سیم و بند ز ر

دہم گاتے ہوئے ارادہ میں کھنگلی پیدا ہو گئی۔ آپ نے اورنگ آباد کو خیر باد کہنے کا تہیہ کر لیا۔ دہلی روانہ ہوئے | ایک دن آپ اپنے دو ملازم قاسم اور حیات کے ساتھ اورنگ آباد سے پیادہ پانچ کھڑے ہوئے۔ یہ سلسلہ کا واقعہ ہے۔ اس سفر کا حال نظام الملک نے فخریہ النظام میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ دہلی میں ایک بڑھیا نے آپ کو اپنے بیان ٹھیرایا یہاں مکان کے قریب ایک بت خانہ تھا۔ ہندو بھی آپ سے عقیدت مندی کا اظہار کرنے لگے۔ یہاں سے چلے تو قطب صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے اور وہاں کی مسجد میں متکف ہو گئے۔ پھر اپنے سلسلہ کے دیگر بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہوتے ہوئے حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب کے مزار پر پہنچے۔ شاہ کلیم اللہ صاحب کے فرزند نہایت محبت سے پیش آئے تین دن تک ان کے ہمان رہے اس کے بعد کٹرہ پھیل میں ایک حویلی کرایہ پر لے لی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے

”آں حضرت در کٹرہ پھیل حویلی بہ کرایہ گرفتہ دآں مکان بہ قدم ایں گلبن رعنا
رشک افزائے گلزار شدہ در اں محل شغل تدریس در پیش کردند“

یہاں بیعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ دور دور سے لوگ آپ کی خدمت میں آنے لگے۔ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کا بیٹا اور شاہ کلیم اللہ دہلوی کے سلسلہ کا بزرگ دہلی میں

۱۷ مناقب فخریہ ص ۱۶۱ تکملہ سیر الاولیا ص ۱۰۹ فخر الطالبین ص ۱۲۱
۱۸ ”سنہ یک ہزار و یک صد و شش ہجری بود کہ آں حضرت بدولت اقبال داخل شاہ جہاں آباد
شدہ بودند“ ۱۹ مناقب فخریہ ص ۱۰۱، تکملہ سیر الاولیا ص ۱۰۹۔ ”فخریہ النظام“ دستیاب نہ ہو سکی۔
۲۰ مناقب فخریہ ص ۱۸ ۲۱ ایضاً ص ۲۰ شجرۃ الانوار میں اس کٹرہ کا نام بھویل لکھا ہے۔
۲۲ مناقب فخریہ ص ۲۰

غیر معروف نہیں رہ سکتا تھا۔ دہلی کے باشندے دونوں بزرگوں سے عقیدت و ارادت رکھتے تھے۔ یہیں قیام کے زمانہ میں شیخ نور محمد صاحب ہماروی جنہوں نے اٹھارویں صدی میں سلسلہ چشتیہ کو پنجاب میں پروان چڑھایا، آپ کے حلقہ مریدین میں شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ حافظ محمد قاسم جو بادشاہ شاہ عالم کے امام جماعت تھے ان کے مرید ہو گئے، مزار حسین اکبر آبادی جو فنون سپاہ گری میں یگانہ روزگار تھے کھج کر آپ کے قدموں میں آگئے اور مرید ہو گئے۔

پاک ٹن کا سفر | دہلی آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ شاہ فخر الدین صاحب نے پاک ٹن کا سفر کیا۔ دکن سے روانگی کے وقت انہوں نے جمیر شریف میں قیام کیا تھا۔ دہلی میں اپنے سلسلہ کے سب بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہو چکے تھے۔ بابا صاحب کی خدمت میں حاضری نہ ہوئی تھی۔ اس لیے پاک ٹن کا ارادہ کیا۔ پاک ٹن کا یہ سفر جس طرح سے پورا کیا وہ عقیدت و ارادت کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ نے یہ تمام سفر پیادہ پاٹے کیا اور ذوق و شوق کے اس عالم میں کہ پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں لیکن چلے جا رہے ہیں جب بالکل ہی مجبور ہو جاتے ہیں تو ٹھہرتے ہیں اور آبلوں پر ہندی لگاتے ہیں۔ ابھی پورا آرام نہیں ہوا تا کہ پھر چل پڑتے ہیں۔

شاہ نور محمد صاحب اس سفر میں آپ کے ہمراہ تھے۔ پاک ٹن سے کچھ دور ایک گاؤں میں رات کو دونوں ٹھہر گئے۔ صبح ہوئی تو شاہ نور محمد صاحب نے اپنے مرشد کو نہ پایا۔ تلاش کیا تو صرف نعلین مبارک پڑی ہوئی ملیں۔ بہت تشویش ہوئی آخر بڑی جستجو کے بعد پتہ چلا کہ آپ پاک ٹن پہنچ چکے ہیں اور بابا صاحب کے احترام میں اپنی نعلین اس گاؤں میں چھوڑ گئے تھے۔

پاک ٹن میں شیخ محمد یوسف صاحب سجادہ نشین تھے انہوں نے نہایت محبت کا برتاؤ کیا۔ شاہ فخر الدین صاحب مزار کے قریب ایک حجرہ میں ٹھہر گئے اور مشغول ہو گئے۔ یہاں ہر شب کو ایک نماز

رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے۔

پاک پٹن سے جب واپسی ہوئی تو راستہ میں فرمانے لگے کہ دکن کی طرف سے دل میں کچھ تشویش سی پیہ ہو رہی ہے۔ چند ہی دن میں معلوم ہو گیا کہ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ جن سے شاہ صاحب کو رومانی تعلق تھا شہید کر دیے گئے۔

دلی کی واپسی پر شاہ صاحب کچھ دن کٹرہ پھیل میں رہتے اس کے بعد اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں تشریف لے گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔
درس و تدریس | شاہ فخر الدین صاحب نے اجمیری دروازہ کے باہر کے مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اجمیری دروازہ کا یہ مدرسہ امیر غازی الدین خاں فیروز جنگ کا بنوایا ہوا تھا۔ اس مدرسہ میں بیٹھ کر آپ نے حقائق و معارف کے وہ دریابھائے کہ بقول مصنف مناقب فخریہ:-

”..... سینہ ہائے کنوز حقائق و دلہائے معاون معارف گشت بختگان

بیدار و بے ہوشاں ہوشیار گشتند و بے خبراں با خبر و بے اثراں با اثر گردیدند، دل

مردگان زندہ، دل زندگان سہل شدند، بازار عشق و محبت الہی گرم شد و در ہائے ذوق

و شوق موجلے زد۔ ۵

آپ حدیث کا درس دیا کرتے تھے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا ذکر آپ کے درس کے سلسلہ میں متعدد جگہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاص طور سے احادیث کا بھی درس دیتے تھے۔ اس مدرسہ کا نظام کچھ اس طرح تھا کہ شاہ صاحب جن لوگوں کو حدیث کا درس دیتے تھے وہ مدرسہ کے دوسرے طالب علموں کو معقول و منقول کی تعلیم دیتے تھے۔ سید احمد کے ذکر میں لکھا ہے۔
 ”خود صحیح مسلم در جناب اقدس تلمذ می کنند و در خدمت حدیث مشغول اند۔ و

۱۔ تکریر لادبیا۔ ص ۱۱۲۔ مناقب فخریہ ص ۲۴-۲۳۔ ۲۔ مناقب فخریہ ص ۲۵۔ ۳۔ ایضاً

۴۔ ملاحظہ ہو ”ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں“ از مولوی ابوالحسنات ندوی ص ۲۸-۲۷۔ ۵

مناقب فخریہ ص ۲۷۔ ۶۔ فخر الطالبین ص ۲۲-۳۱-۳۲ وغیرہ مولانا سید عبدالحی صاحب نے (باقی ص ۱۱)

درس کتب معقول و منقول پر شاگردان می دہند و شب و روز مصروف بہ حکم

مولانا در تعلیم و تعلم“ لے

بعض خاص شاگردوں کو حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ ابتدائی کتابیں بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ میر بیچ الدین کو جو آپ کے بہت عزیز شاگرد اور مرید تھے آپ نے میزان سے لے کر صحیح بخاری تک پڑھائی تھی۔ ایک مرتبہ آپ کتاب سفر السعادتہ کا مطالعہ فرما رہے تھے اس کے بعض مقامات حاضرین کو بھی سناتے جاتے تھے۔ سناتے سناتے فرمانے لگے۔

”دریں ایام دل می خواہ کہ ایں کتاب را بہ شخصے از یاران درس گویم۔ میر بیچ الدین

خود بخاری می خواند و سید احمد صحیح مسلم، بکر باید گفت“ لے

آپ کے اس سوال پر مصنف مناقب فخریہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔

رمضان کے ہیسنہ میں علوم درسی کی تعلیم بند رہتی تھی۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا

درس حدیث جاری رہتا تھا۔ آخری دس دنوں میں یہ بھی موقوف ہو جاتا تھا کیونکہ شاہ صاحبؒ ان دنوں میں مشغول ہو جاتے تھے۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ کے اس مدرسہ میں دور دور سے طلباء آتے تھے۔ اکثر مشہور

مریدین آپ کے اس مدرسہ کے طلباء ہی تھے۔ آپ کی تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر باطنی اصلاح کا رنگ غالب تھا سلوک کی تعلیم اس نصاب اور اس درس کا خاص حصہ تھی۔

حضرت شاہ عبدالرحمن صاحبؒ لکھنوی جب تحصیل علم کے لیے دہلی آئے تو سب سے پہلے شاہ

فخر الدین ہی کے مدرسہ میں پہنچے اور شاہ صاحبؒ سے علوم ظاہر کی تحصیل کی درخواست کی

شاہ صاحبؒ نے جواب دیا جمعیت خاطر کے ساتھ باقی کتابوں کو پڑھ لو علم حاصل ہو جائے گا

۱۹۱۹ء (۱۲۷۹ھ) اس دور میں ہندوستان کا جو نصاب تعلیم متعین کیا ہے اس میں حدیث میں صرف مشکوٰۃ المصابیح کا نام ہے

(الندۃ فروری ۱۹۱۹ء ص ۱۱۲) شاہ فخر الدین صاحبؒ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اور بخاری بھی بعض

مدارس میں پڑھتے تھے۔ مناقب فخریہ ص ۳۲۔ لے فخر الطالبین ص ۳۱۔ لے ایضاً ص ۳۱

لے ایضاً ص ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ایضاً ص ۴۸۔ ۴۹

لیکن چونکہ یہاں سلوک اور علم باطن کے درس و تدریس پر زور زیادہ دیا جاتا تھا۔ اگرچہ نیک اس وقت مولانا کو علم ظاہر کی طرف رغبت زیادہ تھی اس لیے کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد وہ رام پور چلے گئے۔

جس زمانہ میں شاہ فخر الدین صاحب اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں درس و تدریس میں مشغول تھے دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب کا مدرسہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ شاہ فخر الدین صاحب کے مدرسہ میں تصوف کا رنگ غالب تھا اور سلوک و علم باطن کی طرف زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کے مرتب (شاہ عبدالرحیم) کے مدرسہ میں احسان و سلوک کے ساتھ ساتھ علم ظاہر پر خاص زور دیا جاتا تھا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک زبردست انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

علمی ذوق | شاہ فخر الدین صاحب نے نہایت اعلیٰ علمی ذوق پایا تھا۔ بہت سا وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ کتابوں کا بے حد شوق تھا۔ حدیث بھی کہ اگر قرض بھی ہاتھ آجاتی تھیں تو لے لیتے تھے۔ آپ کا ایک نہایت عمدہ کتب خانہ تھا۔ فخر الطالبین میں لکھا ہے۔

”مگر کتب ہمارا کہ حضرت صاحب بسیار دوست می دارند و اگر قرض ہم بدست

آید خریدنی فرمایند بفضل الہی انکوں کتاب خانہ بسیار در سر کار است“ ۲۳

کوئی نہ کوئی کتاب آپ کے سامنے رہتی تھی۔ کبھی حدیث بیان فرماتے رہتے کبھی عوارف المعارف سناتے۔ ۲۴ فوائد الفوائد سے تو اس قدر عشق تھا کہ ہر وقت سینہ سے لگی رہتی تھی۔

اخلاق | حضرت شاہ فخر الدین صاحب کا اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو جب تک اس کی مدد نہ کرتے چین نہ پڑتا کسی شخص کو رنجیدہ یا ملول نہ ہونے دیتے تھے۔ ہر آنے والے کی دل جوئی کرتے تھے اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ آپ کے پاس سے کوئی شخص رنجیدہ خاطر نہ جائے آپ کے

اخلاق سے دشمن تک متاثر ہوتے تھے لوگ آپ کی جان لینے کی فکر میں جاتے لیکن جب آپ سے ملتے تو بقول مصنف مناقب فخریہ

اسے برتر از سپہرومہ و مہر جاہ تو

گردن کشاں سخن تیر نگاہ تو نہ

آپ اپنے اخلاق سے لوگوں کو گرویدہ کرتے تھے۔ ایک افغانی آپ کی خانقاہ میں آیا اور آپ پر حملہ کیا۔ خدام نے ہاتھ پکڑ لیے۔ آپ نے فرمایا ہاتھ چھوڑ دو اور پھر اپنا سر مبارک زمین پر ڈال کر فرمایا ”ما حاضریم ہرچہ بخاطر شہادت بکنید“ کہ وہ شخص اس وقت شہید ہو کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد نو آدمیوں کو اور اپنے ساتھ لایا۔ اس کو دیکھتے ہی آپ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا ”صاحب بخیر و عافیت“ ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ اخلاق کا وہ ہتھیار جو پہلی بار اچھا ہوا لگا تھا اپنا کام کر گیا اور ان لگوں نے ”سنگ ہائے حویلی“ پر اپنے سر اور پیر کوٹ کوٹ کر معافی مانگی۔

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر الدین صاحب ہر بڑے چھوٹے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ علالت اور امراض شدید میں بھی آپ اسی طرح آنے والے کا استقبال کرتے۔ کہ مصیبت میں ہر شخص کی دست گیری کے لیے تیار رہتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بیٹے جب پریشانی میں مبتلا تھے تو آپ نے اپنی حویلی میں رکھا۔ لکھا ہے۔

”فرزند ان شاہ ولی اللہ مغفور را در آغوش منصفیان سلطانی از حویلی علیحدہ ساختہ

حویلی را بہ صبط آوردہ بودند آن حضرت بہ حویلی مبارک جادادند و غم خواری فرمودند

و حویلی مذکور را از جناب سلطان بہ ایشان دہانیدند و با عزت و اکرام در آں جا

رہانیدند“

۱۰ مناقب فخریہ ۱۰ ۱۱ و ۱۲ کہ ایضاً ص ۳۱ ۱۳ ایضاً

لوگوں کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے۔ اگر کسی غریب کے یہاں کوئی تقریب یا غمی ہوتی تو کئی کئی بار تشریف لے جاتے اور اپنے مریدین و معتقدین کو ہدایت فرماتے کہ وہ وہاں جائیں تاکہ ”خاطر او مطنن شود و غم ازین تفقات کرمانہ بر طرف گردد“ ۱

بیمار کی عیادت کرنی ہوتی تو یہی طریقہ اختیار فرماتے۔ خود کئی کئی بار جاتے اور اپنے مریدین کو ہدایت کرتے کہ وہ بار بار مزاج پرسی کے لیے جائیں ۲ ایک مرتبہ اکبر آباد کے ایک پرانے دوست مرزا غلام حسین علاج کی غرض سے دہلی آئے تو آپ نے اُن کی صدرجہ نگرانی اور امداد کی ایک علیحدہ مکان سکونت کے لیے دیا۔ طبیب معالجہ کے لیے مقرر کیا اور کئی کئی بار خود ان کی مزاج پرسی کے لیے جاتے۔ ۳

جو لوگ روزانہ یا پابندی سے آنے والے تھے اُن کی غیر حاضری سے بہت پریشان ہو جاتے اور اُن کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتے۔ دور وزیرِ افاک رو ب نہیں آیا تو بہت متفکر ہوئے۔ جب معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے تو فوراً اُسے دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ بہت محبت سے اس کا حال دریافت کیا۔ میر حسن حکم کو علاج کے لیے مقرر کیا اور نقد انعام دینے کے بعد فرمایا:-

”یہاں پر محمد! شما کہ از دور و زنیامید و از فقیر کہ در پرشش احوال شما تا فیرواقع شد معاف خواہند فرمود“ ۴

اخلاق کی ان ہی بلند یوں کو دیکھ کر مناقبِ فخریہ کا مصنف بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

بہ دہلی مظہرِ ماہِ حجازی

تو گوئی نائبِ شاہِ حجازی ۵

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ دہلی کے ایک شخص نے اپنے زمانہ کے تین بڑے بزرگوں کے اخلاق کا امتحان کرنا چاہا۔ اس نے شاہِ دلی اشرف صاحب، شاہِ فخر الدین صاحب، اور مرزا مظہر جان جانا ۶

۱۔ فخر الطالبین ص ۲۴ ۲۔ ایضاً ص ۲ ۳۔ مناقبِ فخریہ ص ۳۷۔ شجرۃ الانوار

کو مدعو کیا۔ تینوں بزرگ اس کے مکان پر پہنچ گئے۔ میر بان زنا نے مکان میں کھانا لینے کے لیے گیا۔
کئی گھنٹہ بعد واپس آیا اور بیوی کی علالت کا عذر کر کر کچھ پیسے ان تینوں بزرگوں کو دیے۔ شاہ
فخر الدین صاحب نے یہ پیسے کھڑے ہو کر لیے، شاہ ولی اللہ صاحب نے بیٹھ کر، مظہر جان جاناں
نے یہ کہہ کر کہ تم نے مجھ کو بڑی تکلیف پہنچائی۔

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر الدین صاحب نہایت صادق القول بزرگ تھے
وعدہ بہت کم کرتے تھے۔ لیکن جب کر لیتے تو تا ایفاء آں بے قرار ہوند^۱۔

شیخی اور اظہار بزرگی سے آپ کو سخت متنفر تھا۔ جب کسی دعوت یا جلسہ میں تشریف
لے جاتے تو لوگوں کو ساتھ چلنے کی اجازت نہ دیتے۔ اس سے ناامنی ہوتی تھی اور یہ آپ کو پسند
نہ تھی حکم تھا کہ لوگ علیحدہ علیحدہ منزل مقصود پر پہنچ جائیں۔

کوئی آپ کی تعریف کرتا تو ناپسند فرماتے۔ کوئی مرید اگر ہاتھ باندھ کر یا گردن جھکا کر آپ
یا تعظیم کا اظہار کرتا تو ناخوش ہوتے تھے۔ دعوتوں کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ لیکن کسی کی استدعا
کو رد بھی نہ کرتے تھے اس لیے کہ ”خوشی سائل را بر خوشی خود مقدم دارند“^۲

جب کوئی شخص ملنے آتا تو نہایت بشاشت اور خنداں روئی کے ساتھ گفتگو فرماتے
اکثر ”حضرت“ یا ”صاحب“ سے خطاب کرتے تھے جو شخص ملنے آتا اس سے اس کی فہم داورا
کے مطابق گفتگو فرماتے۔

”گفتگوئے باہر کس موافق اطوار و با عالم از علم و بہ سپاہی از سپاہ گری و با
ہوس از کیمیا“^۳

اسی خوبی کو بیان کرنے کے بعد مصنف مناقب فخریہ لکھتا ہے :-

”یار ماچوں آب در ہر رنگ شامل می شود“

^۱ مناقب فخریہ ص ۴۲ ^۲ ایضاً ص ۲۳ ^۳ فخر الطالبین ص ۲۳-۲۵ ^۴ مناقب فخریہ ص ۴۲

^۵ فخر الطالبین ص ۲۳ ^۶ مناقب فخریہ ص ۲۳-۲۴-۲۵ ^۷ مناقب فخریہ

ایک مرتبہ آپ نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ میرے پاس لوگ مختلف خیال سے آتے ہیں بعض مجھ کو عالم جان کر آتے ہیں بعض صوفی خیال کرتے ہیں کچھ کیمیا گر سمجھتے ہیں بعض میرے اخلاق کی وجہ سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ بعض اعمال کے لیے۔

”پس مرا نیز سلوک موافق اعتقاد ایشان به ایشان است“ لے
آپ حکمانہ انداز میں یا قطعی طور پر کوئی بات نہ کہتے تھے: ”چیں باید کرد“ کبھی آپ کی زبان سے نہ نکلتا بلکہ ہمیشہ یوں ہی فرماتے ”وصلح چیں می نماید“ لے کسی سے کوئی کام کرنے کو کہتے تو نہایت نرمی سے لکھا ہے:-

”بطور حکم ہرگز خطاب نہ فرمایند۔ بنوعی ارشاد می کنند کہ گویا شخصے محتاج در خدمت اغیار بعرض رساند“ لے

اکثر ایسا ہوا کہ لوگ آپ کے کتب خانہ سے کتابیں چرا کر لے گئے۔ کوئی اجنبی شخص ان کو فروخت کرنے کے لیے بھی حضرت ہی کی خدمت میں آگیا تو کبھی آپ نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کتاب تمہیں کہاں سے ملی لے ایک مرتبہ ایک شخص آپ کے کپڑے اور چاقو وغیرہ چرا کر لے گیا۔ چور کا پتہ چل گیا۔ لیکن آپ نے اس کے منہ پر قطعاً اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ کشمیر کے صوبہ دار بلند خاں نے آپ کی خدمت میں انہرار روپیہ بطور نذر بھیجے۔ لانے والے نے صرف کر لیے۔ بلند خاں کو معلوم ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ صوبہ دار اس کو سزا دے آپ نے لکھ دیا۔ کہ اسی کی قسمت کے تھے اس سے کچھ نہ کہنا ”قسمت او بود هیچ نگوید“ لے

اخلاق کی یہ بلندیاں لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی تھیں اور اکثر ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو جاتا تھا۔

جب آپ دہلی تشریف لائے تھے تو ایک بڑھیا آپ کی خدمت کرنے لگی تھی جب

لے فخر العالین۔ ص ۱۴ لے مناقب فخریہ ص ۴۲ لے فخر العالین ص ۲۵ لے مناقب فخریہ ص ۲۸

۷۵ ایضاً ص ۳۸ لے ایضاً

وہ مرنے کے قریب ہوتی تو اس نے اپنے بیٹے میر کلو کو آپ کے سپرد کیا۔ آپ نے اس کا بچہ خیال رکھا اور بیٹوں کی طرح اس کی پرورش کی۔ اور

”اور باوجود حرکات جو انا نہ گاہے معاتب نشدند والیوم بکمال اعزاز است“

جس زمانہ میں شاہ صاحب دہلی میں جلوہ افروز تھے وہ بڑی سیاسی بد امنی اور ہنگامے کا دور تھا۔ بڑے بڑے گھرانے تباہ و برباد ہو رہے تھے۔ امیر غریب ہو گئے تھے۔ خاندان کا عزت و ناموس خاک میں مل رہا تھا۔ شاہ صاحب کو ایسے گھرانوں کا خاص خیال تھا۔ اور ان کی مدد فرمایا کرتے تھے بھیک مانگنے والوں کو آپ زیادہ نہ دیتے بلکہ یہ فرما دیتے تھے کہ اگر میں ان کو نہ دوں گا تو کوئی دوسرا دیدے گا۔ دینا ان کا ہے جو اپنی عزت اور ناموس کی وجہ سے بھیک نہیں مانگ سکتے اور فلفلے کرتے ہیں۔

مریدوں کو آپ ہمیشہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص ہمیں برا کہے تو تم اس سے مکابرہ نہ کرنا۔

آپ کی صحبت شاہ فخر الدین صاحب کی صحبت جادو کا اثر رکھتی تھی۔ جو آپ کی خانقاہ میں آجاتا کے اثرات تھا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا جس پر نظر پڑ جاتی وہ شکار ہو جاتا جبرائیم پیشہ لوگ پناہ تلاش کرنے خانقاہ میں آتے اور ولی بن کر نکلتے بچہ گردن کشاں تکلیف پہنچانے کی نیت آتے اور حلقہ بگوش ہو جاتے۔ ان کا سر پھوڑنے آتے خود اپنا سر پھوڑتے ہوئے جاتے جس طرف نظر اٹھ جاتی کام کر جاتی۔

اس نگاہ ہے است کہ سطح فلک درگزر د

پردہ دل چہ بود پردہ افلاک در دھ

ایک شخص ایذا دینے کی نیت سے آپ کے پاس آیا۔ لیکن یہاں آکر از خود رفتہ ہو گیا اور نعرہ لگانے لگا۔ ”لگا۔ رہن دل ہمیں است“ ایک قاتل اپنی جان بچانے کے لیے آپ کی خانقاہ میں

۱۰ مناقب فخریہ ص ۴۷ ۱۱ فخر الطالبین ص ۹۵ ۱۲ ایضاً ص ۸۹ ۱۳ ایضاً ص ۶۷ ۱۴ مناقب فخریہ ص ۹۵ ۱۵ ایضاً ص ۵۰

آیا۔ چند ہی روز میں اس کا یہ حال ہو گیا کہ

”درہر کہ نظری کرد حالتش متغیرے شد“ ۱۵

ایک مرتبہ دس افغانی آپ کو شہید کرنے کی نیت سے قطب صاحبؒ میں جمع ہوئے۔ لیکن جب نگاہیں ملیں تو عالم بدل گیا۔ مناقب فخریہ کے مصنف نے سچ لکھا ہے۔

نگاہت دشمنان را دوست کردہ اثر ہا در گد در پوست کردہ
کہ آئے خیلے زبت خانہ کنی آشنائے ز بہگانہ

مناقب کا مصنف جب پہلی بار خود حاضر ہوا تھا تو ایسا محسوس کرنے لگا تھا۔

”گویا شرابے بود کہ در جام دل من ریختند و آتشے بود کہ در سینہ من انداختند“ ۱۶

اتباع شریعت | جس وقت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے مسند ارشاد بچھائی تھی اس وقت گڑے
وسنت کی تلقین | بڑے بزرگ دہلی میں موجود تھے۔ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا ہے

”در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی

بودند“ ۱۷

لیکن کثیر تعداد ایسے صوفیوں کی تھی جو شریعت و سنت کو چھوڑ چکے تھے۔ اور اپنے نفس کو دھوکہ
میں ڈال کر دوسروں کو گمراہ کر رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے ہدایت نامہ میں ایسے
دھوکہ بازوں سے بچنے کی ہدایت کی تھی ۱۸ فخر الطالبین کا مصنف سید نور الدین فخری جو شاہ
فخر الدین صاحبؒ کا مرید ہے لکھتا ہے

”بہر اہل اللہ ہر کس را کہ نصیب دست دہد قول و فعل اور اقال اللہ و

قال الرسول انکار“ ۱۹

یہ بات نور الدین نے اس وقت لکھی ہے جب اس نے اپنے مرشد کو اس معیار پر پورا پایا۔ ملفوظات

۱۵ مناقب فخریہ ص ۱۶ ۱۷ ایضاً ص ۵۰ ۱۸ ایضاً ص ۶۷-۶۳ ۱۹ ملفوظات شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ص ۱۰۶
۲۰ ہدایت نامہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ ۱۹ فخر الطالبین ص ۲

میں جگہ جگہ اتباع سنت و شریعت کی تلقین ہے۔ خود شاہ صاحبؒ کا یہ عالم تھا کہ معمولی معمولی باتوں میں سنت کا خیال رہتا تھا۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے۔

”در امور جزوی دلی اتباع سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام و بہ بندگاہان نیز

درین امر تاکید اکید“ ۱۷

آپ کی وضع قطع، اعمال و افکار سب شریعت کے مطابق تھے۔ سید نور الدین کا بیان ہے:

”وضع عمل ایشان مطابق و تابع حدیث نبوی است صلی اللہ علیہ وسلم“ ۱۸

تقریر کرتے تو ہمیشہ شریعت کے مطابق۔ جامع ملفوظ کا بیان ہے۔

”تقریر خواجہ کہ عین شریعت واقع شد“ ۱۹

مسئلہ وحدت الوجود پر شاہ صاحبؒ کا ایمان تھا۔ لیکن اس کے متعلق بحث و مباحثہ اس لیے ناپسند کرتے تھے کہ اس سے شریعت کے خلاف چند شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔ ۲۰

اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو بغیر سند کبھی نہ فرماتے۔ ۲۱

ادا کرتے اور اسی کی تلقین فرماتے ”تقیہ جماعت بدرجہ اتم در خاطر مبارک است“ ۲۲

معمولی معمولی باتوں میں اتباع سنت کا خیال رہتا تھا۔ برتن ”مکان ضرور“ اور وضو کے

یہ علیحدہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے مریدین کو اس کی تلقین فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ حضورؐ

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت ہے وہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ

کھانے کے وقت بیٹھنے کے متعلق فرمانے لگے ”میں جس طرح بیٹھا ہوں حضور مقبول صلی اللہ

علیہ وسلم اسی طرح بیٹھا کرتے تھے۔ ۲۳ پھر لوگوں کو مسواک کی ہدایت فرمائی کہ اس پر حدیث شریف

میں بہت اصرار کیا گیا ہے کہ جو شخص خواب سے بیدار ہو اُس کو مسواک کرنی چاہیے۔ ایک مرتبہ

۱۷ مناقب فخریہ ص ۲۰ نیز شجرۃ الانوار ۱۷۷ و ۱۷۸ فخر الطالبین ص ۱۳۲۔ ۱۸ مناقب فخریہ ص ۲۴

۱۹ فخر الطالبین ص ۱۴۱ ایضاً ۲۶ و ۷۷ و ۷۸ ایضاً ص ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۱

خوشبو کے استعمال کی تلقین فرماتے ہوئے نہایت محبت آمیز لہجہ میں فرمایا "حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو بہت پسند تھی۔" ۱۷

ملفوظات و حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے مریدوں کو اتباع سنت و شریعت پر مجبور کرتے تھے اور طرح طرح سے اس کے فوائد بیان کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنا قصہ بیان کرنے لگے کہ جنگ کے دوران میں بارود سے آنکھوں کو نقصان پہنچ گیا تھا اور دُرُتھا کہ بصارت بہت کم ہو جائے گی لیکن سرسہ کے استعمال سے بصارت میں زیادہ کمی نہیں ہوئی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہ متابعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ ۱۸

ایک جگہ مریدوں کو ہدایت ہوتی ہے۔

"درودے کہ در حدیث شریف آمدہ ہموں را بخوانند بطرف چیز ہائے دیگر رجوع نہ کنند و بہ مذہب حقی تعصب می کنند بطرف حدیث بسیار رجوع دارند۔" ۱۹

وفات سے کچھ پہلے کا ذکر ہے کہ ریش مبارک بڑھ گئی تھی۔ ملبول ہو کر فرمانے لگے۔

"ایں ترک سنت از ماشہ" ۲۰

فتنہ سکھ اور شاہ صاحب | شاہ فخر الدین صاحب کے زمانہ میں سکھوں کی چہرہ دستیاب انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ دہلی کا سرخاندان ہراسان اور پریشان تھا۔ بڑے بڑے خاندانوں کا عزت و ناموس خطرہ میں تھا۔ شاہ عبدالغفر نیر صاحب نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ صاحب کے نام جو مکتوبات اس زمانہ میں لکھے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی پریشانی کس حد کو پہنچ گئی تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

ایام ہرج و مرج انت فالقلب منجزع من قوم سکھ دان الخوف معقول
سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان سکھ قوم سے، اور دل کا یہ اندیشہ معقول
شاہ فخر الدین صاحب نے قتل و غارت گری کے یہ سب نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے

انسانی خون کی ازرائی دیکھ کر وہ خون کے آنسو روتے تھے۔ مسلمانوں کو ہراساں اور پریشاں دیکھ کر اُن کا دل ٹرپنے لگتا تھا۔ اُن کو بادشاہ کی حالت پر غصہ آتا تھا کہ وہ ان فتنوں کے انسداد سے کیوں غافل ہے۔ آخر کون رہا گیا اور ایک دن دربار میں بادشاہ سے کہہ اٹھے۔

”بہ تنبیہ آئنا (فرقہ سکھاں) باید پرداخت کہ فلاح دینی و دنیوی در ضمن آن است“

بادشاہ کو ہدایت | چاروں طرف زوال و انحطاط۔ کشمکش و کشیدگی، ابتری و بربادی دیکھ کر شاہ صاحبِ مجبور ہو گئے کہ بادشاہ کو سمجھا دیں کہ امرار کے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے ملک ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اُسے نظام مملکت کی طرف توجہ کرنی چاہیے ایک دن بادشاہ سے جہانِ الفاظ میں کہہ دیا۔

”سلطان عصر تا بذات خود بہ امور ملک ستانی و ملک داری متوجہ نشود و

اختیار محنت و مشقت نہ کند بند و بست بہ بیچ وجہ صورت نمی گیرد“ ۱

حکومت امیروں کے سپرد کرنے کے خطرناک نتائج سے اس طرح بادشاہ کو آگاہ کیا۔

”اگر امیرے مامور و مختار و نائب سلطنت نمایند امرائے دیگر ناخوش می شوند

و سر بہ طاعت او نمی نهند۔ و بے خبر بہ پے بردگی با سلطان می گردند۔ و رعاب

سلطان ہر کہ و مد نمی ماند۔ و فوج بادشاہی کہ محتاج بہ آں امیر شد اور اُمی شناسد

و سررشتہ تعلق شاہ از سلطان منقطع می گردد۔ و در دماغ امیر ہوائے انا و لا غیر

می پیچد۔ و گاہ باشد کہ بر سر بنی می آرد۔ و در سلف اکثر ہم چنین شدہ است“ ۲

جس سیاسی بصیرت کے ساتھ شاہ صاحب نے بادشاہ کو خطرات سے آگاہ کیا اُس سے

معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی پیچیدگیوں اور زوال کے اصلی اسباب کو سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ بادشاہ

کو ہدایت فرماتے ہیں۔

پس اول مقدم این است کہ آں صاحب بذات خود مستند محنت کشی و ملک گیری نشود ۳

رشد و ہدایت، اصلاح و تربیت کی جو آواز شاہ صاحبؒ نے بلند کی تھی وہ جھوٹروں سے لے کر مخلوق تک گونجی۔ اس کے اثرات کیا ہوئے۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ لیکن شاہ صاحبؒ کی بے باکی اور جرأت کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا انہوں نے کلمہ حق بلند کر کر اپنا فرض ادا کیا۔

شیعہ اور شاہ صاحبؒ | اس زمانہ میں شیعوں کا اقتدار ہندوستان میں نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ سادات بارہ اس وقت بادشاہِ گرجا کام کر رہے تھے۔ ان کی سیاسی سازشوں نے اگر ایک طرف ہندوستان میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا تو دوسری طرف سنی علماء کے خلاف اُن کی کارروائیوں سے بڑے بڑے بزرگ تنگ آ گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ”ازالہ الخفا“ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ”تحفہ اثنا عشریہ“ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے رسالہ رد و انقضائے ان ہی ہنگاموں سے متاثر ہو کر لکھی تھیں۔

سنی علماء پر بڑے بڑے مظالم کیے جا رہے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو دو مرتبہ چھبلی کا اٹن ملوایا گیا تھا۔ منظر جانِ جاناںؒ کو شہید کیا گیا تھا۔ غرض اسی طرح کی مختلف سازشوں نے پُر امن زندگی کو نامکمل بنا دیا تھا۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ کو ان ہنگاموں سے بہت دور تھے اور شیعوں کو مرید بھی کر لیتے تھے۔ لیکن وہ بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ایک واقعہ مناقبِ فخریہ میں اس طرح لکھا ہے کہ جن دنوں میں دشمنوں نے مزارِ منظر جانِ جاناںؒ کو شہید کیا میں ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا کہ ایک ایرانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک بڑے سنی عالم کو تو میں قتل کر چکا ہوں۔ لیکن ابھی جو سب سے بڑا سنی عالم ہے وہ باقی ہے۔ جلد ہی میں اُس کا کام تمام کر دیتا مگر کیا کروں اُس کے ارد گرد مریدوں کا جھگڑا رہتا ہے۔ میں اسے تنہا نہیں پاتا۔ اُسے اس کی اطلاع جب شاہ صاحبؒ کو دی گئی تو فرما دیا ”حق تعالیٰ حافظ و ناصر است“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ باوجود اس قدر مخالفت کے ناامید نہ تھے اور شیعوں میں اپنا کام کرتے تھے۔ وہ انہیں مرید بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیزؒ نے شاہ فخر الدین صاحبؒ سے کہ ”بسیار محبت و بے تکلفی بود“ اس کی وجہ پوچھی۔ فرمایا کہ اس طرح سے وہ ہر اسے باز آجاتے ہیں۔ ”ازیں جہت اُن سب و تبر بازمی آیند“ لہٰذا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاہ صاحبؒ نے اس طریقہ سے شیعوں پر بہت اثر ڈالا۔ ملفوظات شاہ فخر الدین صاحبؒ میں بعض ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جو شیعہ تھے لیکن آپ کی صحبت میں رہ کر سنی ہو گئے تھے۔ ایک شخص کے متعلق لکھا ہے۔

”پیش از ملاقات حضرت مولانا مذہب شیعہ داشت بغفلت تمام۔ اکنون

بفضل الہی تابع سنت است“ ۱۷

امراء و سلاطین سے	امراء و سلاطین سے تعلقات کے متعلق صدیوں پہلے حضرت بابا
تعلقات	فرید گنج شکرؒ نے اپنے سلسلہ کے لوگوں کو ہدایت فرمائی تھی

لواں دیکھ بلوغ در جہۃ الکبار فعلیکم بعد اہم الالقاء الی ابناء

الملوک“ یعنی اگر تم بڑے اولیاء کے درجہ تک پہنچنا چاہتے ہو تو یاد رکھو

کہ بادشاہوں کی اولاد کی طرف توجہ نہ کرو۔

چشتیہ سلسلہ میں اس پر نہایت پابندی سے عمل کیا گیا۔ اور ہمیشہ بزرگوں کی یہی کوشش رہی کہ امراء و سلاطین سے حتیٰ المقدور بچا جائے اور ان کی مجلسوں سے گریز کیا جائے۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ بھی اس سلسلہ میں اپنے بزرگوں کی سنت پر عمل کرتے تھے۔ امراء و سلاطین نے بارہا ان سے دیہات قبول کرنے کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے قبول نہ فرمائی۔ فخر الطالبین کا مصنف لکھتا ہے۔

”از اغنیاء ملاقات بکمال استغناء دارند“

فخر الطالبین ص ۶۸

۱۷ ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ ص ۲۰۔ ۵۷۔ ۱۱۶ سیر الاولیاء۔ میر خرد ص ۶۸

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے ہرچند دیہات قبول کرنے کی درخواست کی لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

”ہرچند حضرت ظل سبحانی، امراء مرید و معتقد تمنائے قبول دیہات نمودند قبول نہ فرمودند و ارشاد کر دند کہ اگر می خواہند کہ مادرین شہر با ششم بار دیگر این حرف تمنائے بمیاں نیاید“ ۱۷

ایک دن بادشاہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قلعہ تشریف لے چلنے کی درخواست کی آپ تشریف لے گئے۔ وہاں مجبوراً آپ کو کھانا بھی کھانا پڑا۔ جب واپس آئے تو آپ نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا کہ فوراً فقر اور درویشوں کے مکانات پر تشریف لے گئے اور ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ ۱۸

شاہ عالم بادشاہ کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ آپ سے ملاقات کے لیے آیا کرتا تھا ۱۹۔ عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب نے چند تبرکات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے غیاث گڑھ جانا چاہا تو بادشاہ نے نہ جانے دیا۔ ایک مرتبہ چلے گئے۔ جب واپسی کی خبر ملی تو شاہ عالم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے۔

”چوں حضرت ظل سبحانی شاہ عالم بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ خبر فرحت اثر آمدن

حضرت مولانا صاحب شنیدند کمال سرور و خاطر گذرانید“ ۲۰

بادشاہ گل و شیرینی آپ کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا ۲۱ شاہی خاندان کو بھی آپ سے بے حد عقیدت و ارادت تھی۔ شاہ عالم کی بہن خیر النساء بیگم آپ کی مرید تھیں ۲۲ نواب زینت محل والدہ شاہ عالم نے آپ کی خدمت میں ایک رتھ سواری نذر گزرائی تھی ۲۳

امرار و مشاہیر کی عقیدت کا بھی یہ حال تھا۔ فوج کے سینکڑوں سردار آپ کے مرید متقدم۔

لکھا ہر ”سرداران مغلیہ و ہندستان کہ ہمہ مریدان و مخلصان اند“ ۱۷
کشمیر تک سے صوبہ دار آپ کی خدمت میں نذر بھیجتے تھے لیکن آپ کی استغنا کا وہی عالم تھا۔ مجید الدین
بہادر نے تین دن تک آپ کے لیے دعوت کا کھانا بھیجا۔ چوتھے دن حکم پہنچ گیا کہ دعوت صرف تین
دن تک ہو سکتی ہے اور پھر کھانا نہ آنے دیا۔ ۱۸

نواب ضابطہ خاں مشہور سرداروں میں سے تھا۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے۔

”اور در حسن اعتقاد مرے بود بے نظیر و در سعادت ازلی یکتاے روزگار بود“ ۱۹

شاہ صاحب کا وہ نہایت نخلص مرید تھا اور بے مد عقیدت رکھتا تھا۔ جب آپ غیاث گڑھ تشریف
لے گئے تو اُس نے نہایت عقیدت و ارادت سے خیر مقدم کیا اور دیہات نذر گزارنے چاہے آپ نے
انکار کیا اُس نے اصرار کیا کہ مدرسہ کے درویشوں کے مصارف کے لیے قبول فرما لیجیے۔ پاؤں پر
پڑ گیا۔ آپ نے پھر بھی قبول نہ کیا بلکہ یہ فرمایا کہ ان کی آمدنی حضرت خواجہ صاحب اور سلطان المشائخ کی
دو گاہوں اور خادموں کے مصارف میں خرچ کی جائے۔ نیز شاہ جہاں آباد کے بعض مشائخ کو اس میں
دے دیا جائے۔ ۲۰ شجرۃ الانوار کا مصنف لکھتا ہے

”سبحان اللہ ہے استغنا کہ مزاج مبارک بود یک جہہ برائے خود و یاران خود

معین نفیر مود“ ۲۱

ایک مرتبہ کسی نے بادشاہ کو ضابطہ خاں کی جانب سے بظن کر دیا۔ حضرت شاہ فخر الدین صاحب
نے بادشاہ کی ناراضگی کو دور کرایا ۲۲

بہادر شاہ ظفر اور | بہادر شاہ ظفر نے اپنے دیوان میں جگہ جگہ حضرت شاہ فخر الدین صاحب سے
شاہ صاحب | عقیدت و ارادت کا اظہار کیا ہے۔ ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ

۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، مناقب فخریہ میں لکھا ہر ضابطہ خاں، شاہ ولی اللہ صاحب

کے بیٹوں کی مدد کرتا تھا۔ ۳۶ شجرۃ الانوار ۳۷ مناقب فخریہ ص ۳۴

سر پر دستار فضیلت بھی انہوں ہی نے باندھی تھی۔ ۵

کیوں نہ تو سر بفلک کھینچے کہ فخر الدین نے دئی دستار ترے سر پہ کھینچ کے ہانڈ

ظفر نے حضرت شاہ صاحبؒ کو بچپن ہی میں دیکھا ہوگا اس لیے کہ شاہ صاحبؒ کا وصال ۱۱۹۹ھ

میں ہوا تھا اور ظفر ۱۱۸۹ھ میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن عقیدت کا یہ عالم ہے کہ بار بار اس کا اظہار کرتا ہے۔ چند

شعر ملاحظہ ہوں ۵ اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے کہ جو کچھ ہوں سو ہوں

لیکن اپنے فخر دیں کے کفش برداروں میں ہوں

۵ جو ہاتھ آئے ظفر خاک پائے فخر الدین تو میں رکھوں اسے آنکھوں کی توتیا کیلئے

۵ کوچہ فخر جہاں کی اے ظفر

خاک کی چٹکی بھی بس اکیر ہے

۵ سچ تو ظفروں ہے کہ جز فخر دیں اور نہیں کوئی سہارا مجھے

۵ جو سمجھے کفش پائے فخر دیں کو تاج سرا اپنا

پسند اس کو ظفر کب افسر شاہانہ آتا ہے

۵ ظفر کہتے نہیں مطلب جہاں کے نکتہ دانوں سے

ہمیں فخر جہاں کا ایک نکتہ سو برابر ہے

اسلامی سوسائٹی کو درست | شاہ صاحبؒ نے جس وقت مسند ارشاد بچھایا تھا اس وقت اسلامیات

کرنے کی کوششیں | ہندو تنزل و انحطاط کی آخری حد پر پہنچ چکے تھے۔ مذہب کی روح ختم

ہو چکی تھی۔ تو ہم پرستی میں شہرخص گرفتار تھا۔ اعمال، تعویذ گندوں میں حد سے زیادہ اعتقاد تھا اور اس نے

عمل کی طاقت کو سلب کر لیا تھا۔ زندگی جمود مرگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ شہرخص ایک گونہ بے خودی

کے عالم میں مست و خراب تھا۔

مذہب سے ناواقفیت عام تھی۔ قرآن عربی میں تھا اس لیے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔

۱۔ اس موضوع پر ایک علیحدہ مضمون تھا در شاہ ظفر اور شاہ فخر الدین۔ میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

کتاب الشرح فی تبرک بن کر رہ گئی تھی مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ سورہ نسیین کا فائدہ اور مقصد صرف اتنا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دم آسانی سے نکل جاتا ہے۔ یہ مذہب کی روح مردہ ہو جانے کی آخری اور حسرت ناک حد تھی۔ انہیں حالات کے پیش نظر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا تا کہ ہر خاص و عام اس سے استفادہ حاصل کر سکے اور کتاب اللہ جو ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہے صرف تبرک بن کر نہ رہ جائے۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ بھی عوام کی اس ذہنیت کو دیکھ رہے تھے انہیں اس کا احساس تھا کہ مسلمان کس طرح تعلیمات اسلام سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں، چند رسوم کی پابندی کو وہ اسلام سمجھے بیٹھے ہیں صحیح تعلیم ان تک نہیں پہنچ رہی چنانچہ انہوں نے جمعہ کے خطبہ کو اردو میں پڑھنے کا مشورہ دیا۔

”پس اگر خطبہ بہ لفظ ہندی دریں مملکت خواندہ شود برائے چیزے کہ موضوع است حاصل می شود۔ الا برائے سائر الناس فائدہ ندارد کہ از زبان عربی واقف نیستند“ لہٰذا یہ سب باتیں اس لیے تھیں تاکہ عوام مذہب کی حقیقت و ماہیت کو سمجھ سکیں اور ان میں صحیح اسلامی روح پیدا ہو سکے۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ کے زمانہ میں تعویذ گنڈوں کا بہت زور تھا۔ دنیا دار صوفیوں نے اس کو اپنی رذیل کا ذریعہ بنا لیا تھا اور اس طرح مسلمانوں کے قوائے عمل کو شل کر رہے تھے شاہ فخر الدین صاحبؒ نے جب اس کے برے اثرات دیکھے تو لوگوں کو اعمال و وظائف بتانے سے گریز کرنے لگے۔ لکھا ہے

”آنحضرتؐ را از خواستن اعمال نفرت کلی است“

جس کسی کو کچھ بتانا ہوتا تو خود مناسب موقع پر بتا دیتے لیکن عام طور سے اعمال بتانے سے پرہیز کرتے۔ اگر مجبور کسی کو عمل بتانا پڑتا تو حدیث شریف سے بتاتے۔ لکھا ہے۔

”اکثرے اعمال حضرت مولانا از حافظ جیو سند دارند و صحت حدیث

شریف“

یہ حافظ جیو کون تھے۔ ان کے متعلق بھی سن لیجیے۔

”حافظ جیو شاگرد شیخ محمد طاہر خلیف الرشید شیخ ابراہیم کردی بودند و

جامع فن حدیث“ ۱

آپ کی تلقین تھی کہ ہر شخص کو تابع رضائے خداوندی ہونا چاہیے ۲ سید نور الدین فخری نے آپ سے عمل پوچھا۔ فرمانے لگے میں پہلے ہی سے لوگوں کو عمل کم بتاتا تھا۔ فلاں شخص کو عمل بتانے کے بعد میں کسی کو نہیں بتاتا۔ اس نے عمل کا بے جا استعمال کیا۔ پھر فرمایا۔

”عمل شخصے را بایہ گفت کہ اگر کے بسیار تصدیع دهد بلکه بے حرمت کند

تاہم از عمل در مقابلت نیاید در خدا بگذارد“ ۳

شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا اور عوام کے خیالات کی اصلاح کی۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاہ صاحبؒ کے مرید ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کا ہر کام ہو جائے گا۔ آپ نے نہایت صاف طریقہ سے تنبیہ کی۔

”در کارخانہ خداے مد اعلت نہ کنیم۔ حق سبحانہ تعالیٰ ہر چہ خواستہ باشد

بلند“ ۴

اس زمانہ میں لوگ مختلف طریقوں اور سلسلوں پر بیک وقت چلنے کی فکر کر رہے تھے اس طرح سے ہر سلسلہ کے روحانی نظام کی مرکزیت اور افادیت کم ہوتی جا رہی تھی۔ آپ نے ان حالات کو دیکھ کر پھر ایک بار ”یک درگیر و محکم گیر“ کی آواز بلند کی۔ اور فرمایا۔

”کمال مرد بین است کہ در یک مذہب یا در یک طوبی یا در یک

۱۔ فخرالطابین ص ۱۲۶ ۲۔ ایضاً ص ۱۲۷ ۳۔ ایضاً ص ۱۱۵ ۴۔ ایضاً ص ۱۱۵

رودش در ہر چیزے کہ بیاید ادا اور ابدہ و شے دوم را در ان مخلوط

نہ کند" ۱۷

نماز کی آپ کو خاص فکر رہتی تھی۔ "الصلوة عماد الدین" پر آپ کا ایمان تھا۔ مریدوں سے نماز کے متعلق پوچھتے تھے اور بچوں کو نماز سکھانے کی تاکید فرماتے تھے۔ یہ نظام سلسلہ اور حضرت شاہ صاحبؒ ہر شخص کو جو مرید ہونا چاہتا تھا اپنے سلسلہ تبیینی مساعی میں داخل کر لیتے تھے۔ لیکن خلافت کے معاملہ میں آپ سختی برتتے تھے۔ ۱۹۹ھ میں آپ نے بیعت کرنے کی عام اجازت دیدی لیکن "بشرط اتباع سنت و عمل بر کتاب" ۱۸

تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کا وہی مسلک تھا جو حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ اور دیگر بزرگان سلسلہ چشت کا تھا۔ کہ ہندوؤں کو ذکر بتا دو اس انتظار میں نہ رہو کہ وہ پہلے مسلمان ہو جائیں پھر ذکر بتایا جائے اس لیے کہ "ذکر خود اور اور ربقتہ" اسلام خواہد کشید" ۱۹

اس زمانہ میں بہت سے ہندو خاموش طریقہ سے مسلمان ہوئے تھے بعض کا ذکر شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان صاف طور سے مخالفت کے ڈر میں نہیں کرتے تھے۔ اور یہ ڈر ایک حد تک صحیح بھی تھا۔ شجرۃ الانوار میں ایک ہندو عورت کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کھلم کھلا مسلمان ہو گئی تھی اور اس کے بعد دہلی میں بلوہ ہو گیا۔ بدامنی یہاں تک پھیلی تھی کہ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے دہلی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہی تھا کہ خاموش طریقہ سے اسلامی تعلیمات اور پیغام پھیلایا

۱۷ فخر الطالبین ص ۱۲ ۱۸ ایضاً ص ۲۶-۲۷ ۱۹ ایضاً ص ۵۹ ۲۰ ایضاً ص ۸۲

۲۱ تکرار سیر الاولیاء ص ۱۲۱ ۲۲ مکتوبات شاہ کلیم اللہ دہلوی

جائے۔ تاکہ کوئی عام مخالفت رونما نہ ہو۔ شاہ عبد الغزیز صاحب کے ملفوظات میں بھی ایک ہندو ائمہ چند کا ذکر ہے وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا اظہار نہ کرتا تھا۔ اے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام ان بزرگوں نے جو تبلیغ و اصلاح کے کام میں مصروف تھے اسی طرح سے اپنے کام کو انجام دیا۔

نور الدین فخری نے کئی ایسے ہندوؤں کا ذکر کیا ہے جو حضرت شاہ فخر الدین صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ لکھا ہے۔

”ہندو سے آمد کہ از دستے در طریقہ شامل شدہ است و نماز ہم با خفا

می گذارد گویا از یاران است“ ۱۷

شاہ فخر الدین صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیے کہ اول مسلمان ہو جائیں پھر ذکر بتایا جائے۔

”مارا چنا معلوم است کہ از تعلیم نام خدائے عزوجل کوتاہی نباید کرد

در بند آں نباید شد کہ اول مسلم شود من بعد چیزے شغل کند۔ نام

اثر ہا است خود بطرف خدا خواہد کشید“ ۱۸

یہ وہی حکمت تھی جس کی تاکید شاہ کلیم اللہ صاحب نے فرمائی تھی اور جس کی تاثیر ان کے سلسلہ کے ہر بزرگ نے محسوس کی تھی اور اس پر عمل کیا تھا۔

وفات حضرت شاہ فخر الدین صاحب نے ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ کو وصال فرمایا

آپ کی عمر اس وقت ۳۷ سال تھی۔ وصال سے ایک دن قبل زبان پر تشوی کا یہ شعر تھا۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم

چشم بگذارم سر اسر جاں شوم

وصیت تھی کہ انتقال کے بعد جنازہ میڈھو خاں کے سپرد کر دیا جائے۔ میڈھو خاں آپ کے عزیز مرید تھے اور پہاڑ گنج میں رہتے تھے۔ حاجی محمد امین نے جو شاہ ولی اللہ صاحب کے مرید تھے، آپ کو غسل دیا اور حضرت خواجہ قطب الدین صاحب میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

آپ کے مزار کے سر اسٹون پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

بگداشت فخر دیں چوں ہماں سر اے فانی بر آستانہ جاوداں قطب جاودانی
سال وصال آں ماہ از غیب چوں بچستم تاریخ گفت ہاتف خورشید و جہانی
من کلام سید الشعر مقبول الہی ^{۱۱۹۹}

اولاد حضرت شاہ فخر الدین صاحب کے ایک بیٹے تھے۔ اُن کا نام غلام قطب الدین تھا۔ وہ دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ صاحب جب دہلی آئے تھے تو اُن کو اپنی بہن کے سپرد کر آئے تھے۔ شاہ فخر الدین صاحب کے بعد غلام قطب الدین صاحب ہی سجادہ نشین ہوئے۔ یہ بھی اپنے تقدس اور زہد کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ محمد اکبر شاہ اُن کا مرید تھا۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے۔

”حضرت نعل سبحانی محمد اکبر شاہ بادشاہ..... با اعتقاد تمام

مرید آں فرزند رشید حضرت فخر صاحب گشتند و بعضے فرزند ان و متعلقان

خود را نیز مرید گنایند“

۱ شجرۃ الانوار ۱۵ واقعات دار الحکومت دہلی۔ از مولوی بشیر الدین ج ۲ ص ۲۶۷

۲ ملفوظات شاہ عبدالغفر مرید صاحب

بہادر شاہ بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ غلام قطب الدین صاحب کا مرید تھا۔
 شاہ غلام قطب الدین صاحب کے بھی ایک بیٹے تھے۔ اُن کا نام میاں
 نصیر الدین تھا۔ اُن کو میاں کالے کہتے تھے۔ اُن کی حویلی گلی قاسم جان میں تھی جو
 اب احاطہ کالے صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ میاں کالے کے لڑکے میاں
 کمال الدین تھے۔ اُن کو اورنگ آباد بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں اُن کے لڑکے سیف الدین
 وغیرہ پیدا ہوئے۔ لے

خلفاء و مریدین | حضرت شاہ فخر الدین صاحب کے مرید نہایت کثیر تعداد میں تھے
 تملکہ سیر الاولیاء میں اُن کے تین سو مشہور خلفاء و مریدین کے نام دیے ہیں۔ خاص
 طور سے آپ کے دو خلفاء بہت مشہور اور معروف ہیں۔ حضرت شاہ نور محمد
 صاحب ہمارویؒ۔ جنہوں نے پنجاب میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو فروغ دیا اور
 حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلویؒ جنہوں نے یوپی میں اس سلسلہ کو پروان چڑھایا
 آئندہ مضمون میں ان دونوں بزرگوں کے حالات بیان کیے جائیں گے۔

لے میاں قطب الدین صاحب کی اولاد کے یہ حالات سرسید راس مسعود کے ماموں نواب مصلح الدین
 صاحب نے خواجہ حسن نظامی صاحب سے بیان فرمائے تھے۔ (منادی ۲۱ اگست ۱۹۳۶ء) خواجہ
 صاحب نے نواب صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ اُن کی معلومات احوال قدیم کی نسبت ایسی ہے کہ دہلی میں
 کوئی شخص ان کی برابر پرانی باتوں کو نہیں جانتا۔

بچوں کی تعلیم و تربیت

اسلامی تعلیمات اور نفسیات کی روشنی میں

سید احمد

(۳)

بہر حال کوئی بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے نہ ولی پیدا ہوتا ہے اور نہ شیطان۔ اسلامی تعلیمات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور جدید نفسیات کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو فطرت ساوہ لے کر آتا ہے۔ یہاں اُس کو جیسا ماحول ملتا ہے جیسی تعلیم اور تربیت ملتی ہے اُسی کے مطابق وہ ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ اور اُس کی یہ اثر پذیری اُس وقت سے ہی شروع ہو جاتی ہے جب کہ ہم اُس کو ایک جاندار کھلونا سمجھ کر اُس سے لطف اندوز ہوتے اور اُس کی باتوں سے خوش ہوتے ہیں اس بنا پر ہماری تعلیم و تربیت کا زمانہ بھی اسی وقت سے شروع ہونا چاہیے۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم (جلد سوم از صفحہ ۶۲ تا ۶۴) میں بچوں کی ادب آموزی اور

۱۔ ایک حدیث جو عام طور پر مشہور ہے یہ ہے کہ اگر تم پہاڑ کی نسبت سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہو تو اُس کی تصدیق کر لو لیکن اگر کسی کی نسبت یہ سنو کہ وہ اپنے خلق سے ہٹ گیا ہو تو اُس کی تصدیق مت کرو بالعموم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس حدیث میں اور حدیث ماسبق میں اس کا ذکر ہے کہ ماں باپ اولاد کو یہودی بنادیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔ ان دونوں میں تعاضل ہے۔ حالانکہ بات بالکل واضح اور صاف ہے پہلی حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ بچہ کی فطرت بالکل ساوہ ہوتی ہے۔ پھر ماحول سے وہ جو اثرات قبول کرتا ہو اُس کی طبیعت اُسی رنگ کو اختیار کر لیتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے ماحول کا زائیدہ اور اُس کا آئینہ داہن جاتا ہے۔ اور دوسری حدیث میں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ ایک شخص کسی خاص ماحول میں رہنے کے باعث جب کوئی اثر قبول کرتا ہے اور اس کی تکرار بار بار ہوتی ہے تو اب اُس کے نفس میں ایک (باقی برکت)

تربیت سے متعلق بڑی لطیف اور نکتہ درانہ بحث کی ہے اس کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد ایک شخص جس نے جدید نفسیات کا بھی مطالعہ کیا ہو آسانی یہ معلوم کر سکتا ہے کہ امام نے چند بلیغ فقرہوں میں ہی وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو آج ہمارے علمائے نفسیات کی برسوں کی تحقیقات اور دماغی کاوشوں کا ثمرہ ہے اور جس پر ان کو بڑا ناز ہے امام کے ایک ایک فقرہ کا الگ الگ تجزیہ کر کے یہ بتانا مشکل ہے کہ کون سا فقرہ نفسیات کے کس اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں آپ کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں۔ گزشتہ اوراق میں آپ جو کچھ پڑھ چکے ہیں ان کی روشنی میں امام غزالیؒ کے یہ ارشادات پڑھ کر آپ خود اندازہ کر سکیں گے کہ امام نے چند فقرہوں میں ہی کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

اعلم ان الطريق في سياحة	یاد رکھو، بچوں کی تربیت و تعلیم میں اہتمام
الصبيان من اهد الامور	کرنا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ بچہ
واوكد هاد الصبي امانته	اپنے ماں باپ کے پاس خدا کی ایک
عند والديه وقلب الطاهر	امانت ہے اور اس کا پاک دل ایک
جوهرة نفيسة ساذجة خالية	ایسے صاف و شفاف آئینہ کی مانند

(بقیہ ۳) کیفیتِ راسخ پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں ملکہ کہلاتی ہے پھر اسی ملکہ کو جس کے باعث نفس سے افعال کا صدور آسانی اور سہولت سے کسی غور و فکر کے بغیر ہو خلق کہتے ہیں۔ اب غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ دونوں حدیثوں کا مطلب ایک دوسرے سے متعارض نہیں ہے۔ بلکہ پہلی حدیث میں جو بات کہی گئی ہے اُسی کا ایک پہلو دوسری حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اب رہا یہ اشکال کہ اس حدیث سے تو یہ لازم آتا ہے کہ جب ایک انسان کا خلق اُس سے زائل ہو ہی نہیں سکتا تو پھر پڑھنا پڑھانا، تعلیم و تلقین اور وعظ و ارشاد سب بیکار ہوئے یعنی ایک خاص ماحول میں رہنے کے باعث اُس میں جو خلق پیدا ہو گیا ہے وہ ناقابلِ زوال ہے اور اب اس کے لیے کیسا ہی عمدہ اور بہتر ماحول پیدا کیا جائے اور اسے کیسی ہی تلقین و رشد و ہدایت کی جائے وہ سب بیکار رہے گا اور اُس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ملکہ جس کیفیتِ راسخ فی نفس کو کہتے ہیں وہ اگرچہ بطریقِ زوال یعنی دیر میں زائل ہو سکتے والی کیفیت ہے لیکن اس کا زوال ناممکن نہیں ہے البتہ ہاں یہ ضروری ہے کہ مرضِ قلب زیادہ شدید ہو علاج بھی اسی قدر مؤثر دیر پا اور طویل ہونا چاہیے۔ کسی غلط ماحول میں رہنے اور اعمالِ سیئہ کی (باقی برہم)

عن كل نقش وصورة وهو
 قابل لكل ما نقش ومائل
 الى كل ما يمال به اليه فان
 عود الخیر وعلمه نشاء عليه
 وسعد في الدنيا والاخرة
 وشارك في ثوابه ابوا د
 كل معلم لله ومودب دان
 عود الشر واهل اهل الاله
 شقى وهلك وكان الوزر
 في رقبة القيم عليه والوالی
 له وقد قال الله عز وجل
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا
 أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا
 وهما كان الادب يصونه
 عن ناس الدنيا فبان يصونه
 عن نار الاخرة اولی
 جو ہر نقش اور صورت سے خالی ہو اور
 جس میں ہر نقش کو قبول کرنے اور جس
 چیز کی طرف اس نہ مائل کیا جائے اُس
 کی طرف مائل ہونے کی پوری صلاحیت
 ہو۔ چنانچہ بچہ کا حال بھی یہی ہے کہ اگر
 اس کو بھلی اور اچھی باتوں کا عادی
 بنایا جائے اور اُن کی تعلیم دی جائے
 تو اُس کی نشو و نما انہیں چیزوں پر ہوگی
 اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں نیک
 بخت ہوگا اور اُس کے ثواب میں
 اُس کے ماں باپ اور اُس کے تمام
 معلم اور مودب سب شریک ہونگے
 لیکن اگر بچہ کو بری باتوں کا خوگر بنایا
 گیا اور جانوروں کی طرح اسے یوں
 ہی چھوڑ دیا گیا تو بچہ بد بخت ہوگا اور
 ہلاک ہو جائے گا اور اس کا وبال
 بچہ کے سر پرست اور نگراں پر ہوگا۔
 اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے مومنو! تم اپنے
 آپ کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ۔

(بقیہ صفحہ ۱۱۴) بار بار کی تکرار اور مزاولت کے باعث اگر کسی شخص میں کوئی برا خلق پیدا ہو گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اُس کو
 زائل کرنے کے لیے بڑی حذانت کی بھی ضرورت ہے اور ثبات و استقلال کی بھی

توجہ ادب آموزی کا تقاضا یہ ہے
کہ بچہ کو دنیا کی آگ سے بچایا جائے
تو اُس کو نارِ آخرت سے بچانا بدرجہ
اولیٰ تادیب کا لازمی فریضہ ہوگا۔

بچہ پر دودھ کے اثرات | علمائے نفسیات جب بچہ کی تربیت کے سلسلہ میں گھر کے ماحول اور دوسری چیزوں کا ذکر کرتے ہیں تو بچہ کے دودھ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور عام طور پر اُس کا ذکر بھی اڑا جاتے ہیں۔ لیکن امام غزالیؒ کی ژرف نگاہی اور دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ وہ بچہ کی شیرخوارگی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

یَنْبَغِي أَنْ يَرْتَقِبَ مِنْ أَوَّلِ صَرَّةٍ
فَلَا يَسْتَعْمَلُ فِي حَضَانَتِهِ
وَأَسْرَاضًا وَلَا أَصْرَاقًا
صَالِحَةً مُتَدَيِّنَةً تَأْكُلُ
الْحَلَالَ فَإِنَّ اللَّبَنَ الْحَاصِلَ
مِنَ الْحَرَامِ لَا بَرَكَهَ فِيهِ فَإِذَا
وَقَعَ عَلَيْهِ نَشْوَالُ الصَّبِيِّ انْجَنَّتْ
طِينَةٌ مِنَ الْخَبْثِ فَيَمِيلُ
طَبْعُهُ إِلَى مَا يَنَاسِبُ
الْخَبَائِثَ

بچہ کی بالکل شروع سے ہی نگرانی اور
دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ اس بنا پر
بچہ کی تربیت اور اُس کو دودھ پلانے
کے لیے ایک ایسی ہی عودت سے
کام لیا جائے جو نیک ہو۔ دیندار ہو
اور حلال کھاتی ہو کیونکہ جو دودھ حرام
سے حاصل ہوتا ہے اُس میں برکت
نہیں ہوتی اور جب کسی بچہ کا نشوونما
ایسے دودھ سے ہوگا تو اُس کی طبیعت
کا خمیر ناپاکیوں سے تیار ہوگا اور
اُس کی طبیعت انہیں کے مناسب
چیزوں کی طرف مائل ہوگی۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ علمائے اسلام کے نزدیک دودھ پلانے والی عورت کا دینی اور

اخلاقی اعتبار سے نیک ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ وہ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں روحانی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ بچہ کی صحیح جسمانی نشوونما اور اُس کے لیے مناسب اسباب کی فراہمی پر بھی بڑا زور دیتے تھے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ ”تندرست دماغ ایک تندرست جسم میں ہی ہو سکتا ہے“ اور کوئی قوم اس تنازع للبقا کی رزم گاہ میں اُسی وقت بامراد اور کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ اُس کے بچے روحانی اور اخلاقی عظمتوں کے ساتھ جسمانی اعتبار سے بھی سرفراز و بلند ہوں۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے بچہ کو دودھ پلانے کے لیے ایک نیک عورت کی ضرورت کا جو اظہار کیا ہے۔ اجیاء العلوم کے شارح علامہ سیہ ترفی زبیدی اس کی شرح میں فرماتے ہیں

”اس دودھ پلانے والی عورت کی عمر پچیس^۲ اور نینیس^۳ سال کے درمیان ہونی چاہیے کیونکہ یہی عمر صحت و شباب کی عمر ہوتی ہے پھر اس کا رنگ بھی اچھا ہونا چاہیے کیونکہ رنگ کا اچھا ہونا اعتدال مزاج کی دلیل ہوتا ہے۔ علاوہ برہس اس عورت میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں کہ اُس کی جلد ملائم ہو۔ گردن مضبوط ہو۔ سینہ چوڑا ہو نہ بہت فرہ ہو اور نہ بالکل دھان پان۔ پرگشت ہو۔ مگر چربی کا اُس پر غلبہ نہ ہو۔ اخلاقی اعتبار سے وہ پسندیدہ کردار رکھتی ہو۔ غم و غصہ اور بردلی وغیرہ اس قسم کے نفسانی انفعالات و تاثرات رویہ کو جلد نہ قبول کرتی ہو۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں مزاج کو فاسد کر دیتی ہیں“ لے

یہاں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ امام غزالیؒ اور اُن کے شارح علامہ زبیدی نے یہ جو کچھ فرمایا۔ اُس میں وہ منفرد نہیں ہیں بلکہ خود احادیث نبوی میں اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حلیمہ سعدیہؓ سے جو بنو سعد کے قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں اور جو فصاحت و بلاغت میں بڑا مشہور تھا، دودھ پیا تھا اور علی اختلاف الروایات آپ پانچ یا چھ برس کی عمر تک

یہاں رہے تھے۔ ایک روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں ”میں تم سب سے زیادہ فصیح ہوں کیونکہ میں قریش سے ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے“ غور کیجیے اس حدیث میں اس بات کی طرف صاف اشارہ ہے کہ بچہ جس عورت کا دودھ پیتا ہے اُس پر اس عورت کی زبان و طرز گفتار تک کا اثر ہوتا ہے اور یہ اثر آخر عمر تک قائم رہتا ہے۔ اگرچہ بچہ اس عالم میں نہ بھی پورے طور پر بول سکتا ہے نہ اپنا مافی الضمیر الفاظ کے ذریعہ کامل طریقہ پر ظاہر کر سکتا ہے اور نہ اس وقت الفاظ کا کافی ذخیرہ ہی اس کے دماغ میں محفوظ ہوتا ہے۔ اس حدیث کے علاوہ ایک روایت میں صاف طور پر کسی پاگل عورت سے بچہ کو دودھ پلوانے کی ممانعت بھی آئی ہے اسی طرح کی ایک روایت حضرت عائشہؓ سے منقول ہے جس میں آپ فرماتی ہیں

”لا ترضعوا الحمقاء فان احمق عورت سے دودھ مت پلواؤ

اللبن یورث ۷ کیونکہ دودھ کے اثرات منتقل ہوتے ہیں

ماں باپ کے تعلقات | شیر خوارگی کے بعد اب وہ منزل آتی ہے جس میں بچہ ایک خاص ماحول میں
کا اثر بچے پر | رہنے کے باعث گرد و پیش کی اشیاء سے اثرات قبول کرنے شروع کرتا ہے
اور گویا اب اس کی آئندہ زندگی کے امیال و عواطف کی تشکیل اور اُس کی خاص صلاحیتوں کی
تعمیر یا تخریب کی بنیاد پڑنے کا آغاز ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس منزل میں اس
بات کی ضرورت ہے کہ ماحول کو درست اور صالح رکھا جائے۔ لیکن جس طرح ایک آراستہ
کمرہ میں کسی ایک چیز مثلاً مینیر یا کرسی کی وضع اُس کمرہ کی دوسری اشیاء کی وضع کی نسبت سے ہی
متعین ہوتی ہے اور اُس کمرہ کے آراستہ ہونے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہاں کی ہر چیز اپنی اپنی
موزوں اور مناسب جگہ پر رکھی ہوئی ہے اسی طرح ماحول کے درست ہونے کے معنی یہ ہیں
کہ ماحول جن جن چیزوں پر مشتمل ہے یعنی ماں باپ، بہن بھائی، گھر کے چھوٹے بڑے آدمی۔

وہ سب اپنے طور و طریقہ بود و باش اور رفتار و گفتار میں ایسے اصول پر عامل ہوں جن کو محسوس کر کے اچھے اثرات قبول کیے جاسکیں۔ اگر کسی بچہ کے ماں باپ دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں آئے دن اُن میں نخ و خج اور تھکا فضیحتی رہتی ہے۔ بیوی شوہر سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی اور شوہر بیوی کو نظر میں نہیں لاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ میاں بیوی کی زندگی بھی اجیرن نہیں ہوگی بلکہ ننھے اور معصوم بچہ کی صحت بھی متاثر ہوگی اور اُس کا دماغی سکون و اطمینان نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو جائے گا۔ اُس کو ماحول کے اس تکرر سے صدمہ ہونا ناگزیر ہے اگرچہ وہ نہ یہ کسی کو بتا سکتا ہے اور نہ خود جان سکتا ہے کہ اسے یہ دکھ کیوں ہو رہا ہے۔

والدین کی باہمی نخ و خج تو بڑی بات ہے۔ علمائے نفسیات کا اس پر اتفاق ہے کہ ماں باپ کے دل پر اگر غم اداسی۔ مایوسی و ناکامی اور فکر و تشویش کی بھی کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے تو بچہ بھی اس سے متاثر ہوتا اور اُس کا دکھ اندرونی طور پر محسوس کرتا ہے بلکہ بچہ کو اس سے جوازیت ہوتی ہے وہ ماں باپ کو بھی نہیں ہوتی اُس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ماں باپ کو اپنے رنج و غم اور فکر و تشویش کا سبب معلوم ہوتا ہے اور بچہ اس سے ناواقف ہوتا ہے اس بنا پر اُسے اندرونی طور پر ایک نامعلوم السبب سی الجھن اور خلش ہوتی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بچہ جب اپنی موجودگی میں بھی ماں باپ کو متفکر و غمگین اور اداس دیکھتا ہے تو غیر شعوری طور پر اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اُس کے ساتھ پوری دلچسپی نہیں دیتے اور انہیں اُس کے ساتھ غیر معمولی محبت نہیں ہے اس غیر شعوری احساس کے باعث بچہ میں ماں باپ کے متعلق ایک گونہ احساس بیگانگی و مناورت پیدا ہو جاتا ہے اور اگر ماں باپ کے رویہ میں تبدیلی پیدا نہ ہونے کے باعث اس احساس کو پورے ورثہ پانے کا قلعے میں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ میں نقل اثر (

نے اصول کے مطابق آخر کار ایک طرح کا ضعف دماغی پیدا ہو جاتا ہے جس کو علمائے نفسیات کہتے ہیں یا اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بچہ

تصادم ذہنی (کاشکار ہو جاتا ہے اور اُس کی مثال علم النفس کی اُس ایک روایتی عورت کی سی ہو جاتی ہے جو بد قسمتی سے ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا تھی اور اسی عالم میں وہ ایک مرتبہ خودکشی کرنے کے خیال سے اپنے بالائی مکان کی کھڑکی ایک ہاتھ سے کھول رہی تھی تو ساتھ ہی اپنے دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت و قوت کے ساتھ کھڑکی کو بند رکھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

ایسے لڑاکا غم پسند یا تشویش پرور والدین کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی زندگی ہی برباد نہیں کرتے بلکہ چمن ہستی کے نوزائیدہ غنچوں میں بھی ایک ایسا گھن اور بس پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو مناسب اور موزوں طریقہ پر نشوونما پانا نصیب نہیں ہوتا۔ ینگ () نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اپنے لکچرز میں متعدد مثالیں دی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک خور دسال بچی جس کی عمر نو برس تھی بیمار ہو گئی۔ اسے بخار رہنے لگا۔ بھوک غائب ہو گئی۔ اُس نے اسکول جانا ترک کر دیا۔ مہینوں اس بچی کا علاج معالجہ کیا گیا مگر کوئی افادہ نہیں ہوا اور نہ کسی ڈاکٹر کو بیماری کا سبب ہی معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ اصلی سبب یہ تھا کہ بچی کے والدین میں باہم نا اتفاقی تھی۔ اگرچہ وہ دونوں بچی سے یکساں محبت کرتے تھے اور اس بات کا خیال بھی رکھتے تھے کہ اُس کے سامنے اپنی باہمی ناراضا مندی اور تعلقات کی ناخوش گواری کا اظہار نہ ہونے دیں۔ ماں شوہر سے طلاق لینا چاہتی تھی لیکن بچی کے خیال سے اس خواہش کا اظہار نہ کرتی تھی۔ آخر جب بچی کی حالت ردِ روز گرتی ہی چلی گئی تو تحلیل نفسی کے ایک ماہر نے بچی کے والدین سے کہا کہ آپ دونوں کو یا تو اپنے تعلقات خوش گوار کر لینے چاہئیں ورنہ پھر بہتر یہ ہے کہ باہمی تفریق اختیار کر لیجیے۔ اور اگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی تو بچی کی جان خطرہ ہے وہ اندرونی کشش اور غش پنہانی کو برداشت نہ کر سکے گی اب ماں باپ نے تفریق اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ بچی پر اس کا اثر یہ ہوا کہ والدین کی نا اتفاقی اور تعلقات کی بد مزگی کے باعث وہ ہر وقت جس مہم خوف و ہراس

دو چار رہتی تھی اب اُس کو اُس سے نجات مل گئی اور والدہ کی توقع کے برخلاف اُس کی صحت یکایک بہتر ہو گئی اور اُس نے اسکول جانا اور کھیلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر مسانی کا بیان ہے کہ اسمتھ کا کالج نیویارک کے چند گریجویٹوں نے جن میں ایک خاتون مس ہیلن وٹمر اور دوسرے طلبا شریک تھے ایک سو ستانوے بچوں کے حالات کی تحقیق کی جو بچوں کے دارالحفاظت () میں داخل

کیے گئے تھے خوب اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد یہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ بچوں کی کامیابی یا ناکامیابی پر دوسری چیزوں مثلاً خاندان کی پوزیشن، والدین کی اقتصادی حالت آب و ہوا، ذہانت، اسکول اور تعلیم وغیرہ کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا کہ اُن کے والدین کے باہمی تعلقات کی خوش گواری یا ناخوش گواری کا ہوتا ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ جن بچوں کے والدین آپس میں میل ملاپ اور پیار و محبت سے رہتے تھے وہ جسمانی اور دماغی اعتبار سے زیادہ تندرست اور کامیاب تھے۔

اسی طرح ایک اور محقق مسٹر ہالی (Hall) نے ایک مرتبہ ایک ہزار بچوں میں سے سو بچوں کا انتخاب کیا جن میں سے پچاس بچے ایسے تھے جن کے ماں باپ کے باہمی تعلقات بڑے خوش گوار تھے اور اُن کے برخلاف پچاس بچے ایسے تھے جن کے والدین نا اتفاقی اور بد مزگی کی زندگی بسر کرتے تھے ان سب بچوں کے حالات اور اُن کے امراض و شکایات کا ایک عرصہ تک عمیق نظر سے مطالعہ کرنے اور اُن کے اسباب کا سراغ لگانے کے بعد مسٹر ہالی اس نتیجہ پر پہنچے کہ جن بچوں کے والدین باہمی اتحاد و اتفاق سے نہیں رہتے تھے ان میں ۹۸ فی صدی بچے بعض امراض کا شکار تھے۔

فارسی کا ایک مصرع مشہور ہے ”افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را“ یہ مصرع دوسرے ارباب انجمن کے حق میں درست ہو یا نہ ہو لیکن علمائے نفسیات اور خصوصاً فریڈ

اور نیک کے نزدیک یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ والدین اپنی ازدواجی زندگی میں ناشاد و نامراد ہو کر اپنی انجمن بستی کی رونق کو جسے عرف عام میں بچے کہتے ہیں ضرور بے آب و مکدر کر دیتے ہیں۔

جو بچے ایسے ناخوش گوار ماحول میں پرورش پاتے ہیں اُن کی صرف صحت ہی ناقص نہیں ہوتی بلکہ دماغی اور نفسیاتی تاثرات کے باعث اُن میں مختلف قسم کے جرائم یا کم از کم اخلاق سے گری ہوئی متعدد دعائوں کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے عام طور پر چڑچڑ سے مزاج کے ہوتے ہیں۔ بات بات پر ماں باپ سے، بہن بھائیوں سے اور اس پاس کے ہم عمروں سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ یا ایسے بچے چپ چاپ اور خاموش رہتے ہیں۔ اُن کے چہروں پر یک گونہ افسردگی یا حیرانی کی کیفیات طاری رہتی ہیں کسی کام کو دلچسپی یا حاضر جواسی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ اُن کی فطرت غم پسند اور ان کی طبیعت رنج طلب بن جاتی ہے۔ وہ والدین سے اتنی محبت نہیں کرتے جتنا کہ اُن سے ڈرتے ہیں اور بچپن میں اس دُر کا انجام بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جوان ہو کر اُن کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہندوستانی گھرانوں میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ شادی کے بعد لڑکے کے تعلقات اپنے والدین سے خوش گوار نہیں رہتے۔ اس قسم کے واقعات میں غریب بہو خواہ مخواہ بدنام ہوتی ہے کہ اُس نے آکر بیٹے کو والدین سے الگ کر دیا۔ حالانکہ بات یہ ہے کہ بیٹے میں والدین سے جدا ہو جانے کا رجحان پہلے سے موجود تھا۔ مگر وہ اس کے اظہار کی جرأت نہیں کرتا کرتا تھا اب ہونے آکر صرف یہ کیا ہے کہ اُسی رجحان کو تیز اور شدید کر کے اُس کے اظہار کی جرأت بھی پیدا کر دی ہے۔

(باقی آئندہ)

ادبیت

ایشیا

کلیم ایشیا،
ابوالکلام آزاد کے نام

جناب روش صدیقی

مسند آرائے بہار بے خزاں پر ایشیا
جاوداں ہے ایشیا
زندگی کی نکلتوں کا راز داں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا

صبحِ نو ہے عالمِ مشرق میں سرگرمِ ظہور
گامِ زن ہیں وادیوں میں کاروانِ رنگ و نور
ناشکیب و نا صبور
جنتِ نزدیک و دور
بڑھ رہا ہے خود قدم بوسی کو منزل کا غرور
مرجبا! عزمِ غیور

خود مراد کارواں، خود کارواں ہے ایشیا

جاوداں ہے ایشیا

زمینِ آغوشِ بیداری ہیں، آزادی کے خواب
مہرِ قدامت اک تغیر، ہر سکوں اک انقلاب
بے نقاب بے حجاب
کام گارو کام یاب

منتشر پامال، اوراق کتاب احتساب خود سوال خود جواب

زندگی میکش ہے، اور پیر مناں ہے ایشیا

جاوداں ہے ایشیا

۳

دانش مغرب نے سمجھا جس کو نقشِ بے ثبات

آج ہے وہ ایشیا، نورِ صنمیر کا نسات

جس کے ہر تو سے درخشاں ہے جبینِ ممکنات

فکرِ انساں کی بلندی کا نشاں ہے ایشیا

جاوداں ہے ایشیا

۴

ایشیا کوہِ گراں ہے گردِ ہیں باطل پسند

ایشیا کو چھپیں سکتی حوادث کی کمند

ایشیا ہے زندگی کی غلٹوں سے ارجمند

خود زمیں ہے اور خود ہی آسماں ہے ایشیا

جاوداں ہے ایشیا

۵

ایشیا منت گزار دانشِ حاضر نہیں

ایشیا ہے جلوہ گاہِ علم و عرفان و یقین

ایشیا ہے خاکِ پائے رحمتِ للعالمین

خود مشیتِ نازِ فرما ہے، جہاں ہے ایشیا

جاوداں ہے ایشیا

۶

ایشیا ہے الفتِ نیرِ داں کا لافانی پیام
ایشیا میں عام ہے قدرت کا فیضانِ تمام
فرض ہے انسانیت پر ایشیا کا احترام
عالمِ انسانیت کا پاسباں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا
مسندِ آرائے بہارِ بے خزاں ہے ایشیا
زندگی کی نکلتوں کا رازداں ہے ایشیا

مولانا آزاد کی تازہ ترین علمی اور ادبی تصنیف

غبارِ خاطر

مولانا کے علمی اور ادبی خطوط کا دلکش اور غنبر بنیر مجموعہ۔ یہ خطوط موصوف نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانہ میں اپنے علمی محبِ خاص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو رہائی کے بعد مکتوبِ الیہ کے حوالے کیے گئے۔ اس مجموعے کے متعلق اتنا کہ دنیا کافی ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام جیسے مجمعِ فضل و کمال کی تالیفات میں اپنے رنگ کی بے مثال تراوشِ قلم ہے، ان خطوط کے مطالعہ کے بعد مصنف کے داغی پس منظر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ سطر سطر موتیوں سے ٹکی ہوئی ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت گرد پوش۔ چار روپے۔

مکتبہ برہان دہلی قرول باغ

تیسرے

محمد بن عبد الوہاب از مولانا مسعود عالم ندوی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۲۷۔
 طباعت و کتابت بہتر۔ قیمت ۴ روپے۔ دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدر آباد دکن۔
 اٹھارہویں صدی عیسوی میں دنیاۓ اسلام پر ایک عام انحطاط طاری تھا۔ اصل اسلامی
 تعلیمات کی روح یکسر مفقود ہو چکی تھی۔ ہر جگہ بدعات و رسوم و اہیہ کار و اج تھا اور انہیں کو اسلام
 سمجھا جاتا تھا۔ سرزمین نجد کا علاقہ بھی اس عام وبا سے محفوظ نہ تھا۔ اسی زمانہ میں نجد میں شیخ محمد بن
 عبد الوہاب پیدا ہوئے جنہوں نے قرآن حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملک میں توحید
 خالص کی ترویج و اشاعت اور بدعات و رسوم کا قلع قمع کر دینے کا عزم بالجزم کر کے اپنی
 زندگی ہی اس کے لیے وقف کر دی۔ چنانچہ اس راہ میں انہوں نے قلم اور تلواریں دونوں سے کام
 لیا اور سخت ترین دشواریوں اور مصیبتوں کے باوجود وہ اپنا کام عزم و استقلال سے کرتے
 رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آل سعود کا حکمران خاندان شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کی تحریک کا پشت
 و پناہ بن گیا اور اس بنا پر یہ دعوت نجد اور اس کے اطراف و اکناف میں بڑی شدت سے پھیل گئی
 اس میں شبہ نہیں کہ شیخ کی تحریک خالص اصلاحی اور مذہبی تھی لیکن خود شیخ اور پھر ان کے اتباع
 سے چند ایسی بے اعتدالیاں ہوئیں جنہوں نے اس تحریک اور اس کے بانی سے متعلق نجد کے
 علاوہ دنیاۓ اسلام کے دوسرے گوشوں میں بیزاری پیدا کر دی یہ بیزاری اتنی شدید تھی کہ اس
 نے اصلی تحریک و دعوت کی بنیادی اچھائیوں پر بھی پردہ ڈال دیا۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ حرمین
 شریفین کے علما اور اشراف مخالف ہو گئے اور آل سعود میں اور ان میں متعدد وزرم آرائیاں
 ہوئیں اور آخر کار مصری حکومت بھی میدان میں آئی اور ان سب نے آل سعود کے اقتدار کا
 خاتمہ کر دیا۔ آل سعود کے سیاسی اقتدار کے ختم ہوتے ہی یہ تحریک بھی ماند پڑ گئی۔ لائق مصنف نے

انہیں شیخ محمد بن عبد الوہاب کے حالات و سوانح اُن کی دعوت اور اُس کے اثرات و نتائج پر بڑی تحقیق اور برسوں کی محنت شاقہ کے بعد عربی اور انگریزی کے موجودہ مآخذ کی روشنی میں یہ کتاب لکھی ہے اردو میں اس موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے لیکن افسوس ہے کہ خود مصنف سے متعدد مقامات پر علمی تسامح بھی ہوا ہے مثلاً (ص ۱۷۳-۱۷۴) وہ لکھتے ہیں محمد بن اسماعیل الامیر مبنی بت پرستوں اور قبر پرستوں کے درمیان بالکل فرق نہیں کرتے۔ شوکانی نے ان کا رجوع نقل کیا ہے اور عباد قبور پر اس تشدد کی سخت مخالفت کی ہے عجیب بات یہ ہے کہ مصنف نے اس عبارت کے لیے الدر النضید ص ۳۵-۴۰ کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اسی کتاب کے صفحہ ۴۹ تا ۵۰ پر یہ صاف لکھا ہوا ہے کہ امیر اسماعیل یانی قبر پرستوں کی تکفیر نہیں کرتے اور اُن میں اور بت پرستوں میں تفریق کرتے تھے اُن کے نزدیک قبر پرستی صرف کفرِ عملی تھا لیکن قاضی شوکانی نے (الدر النضید ص ۵۳) پر اس مسلک کی سخت تردید کی ہے اور وہ قبر پرستی کو عملی و اعتقادی دونوں قسم کا کفر مانتے ہیں جناب مصنف نے الدر النضید کے بیان کے بالکل برعکس لکھا ہے۔ علاوہ بریں "صیانتہ الانسان" نامی کتاب کو مصنف نے عام روایت کے مطابق مولانا محمد بشیر سہسرامی کی تالیف بتایا ہے (ص ۲۱۳-۲۱۰) حالانکہ صحیح یہ ہے کہ اس کے مصنف عبداللہ بن عبد الرحمن السندی ہیں چنانچہ اس کے جواب میں جو کتاب "القول المجدی" لکھی گئی تھی اُس کے پورے نام سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے ان علمی مسامحات کے علاوہ مصنف نے تصوف اور ہندی اسلام اور اس سلسلہ کے زعماء پر جو جادو بیجا طرز کیا ہے اُس کی کتاب کا علمی وقار مجروح ہو گیا ہے اور آخر میں یہیں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ لائق مصنف نے صفحہ ۷۸ پر حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی رائے شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کے متعلق نقل کر کے اُس پر جو استعجاب ظاہر کیا ہے وہ بھی ان کے جوش مار والی دلیل ہے کیونکہ شیخ کا ایک بلند پایہ مصلح ہونا مسلم لیکن کتاب التوحید کے مصنف کی نسبت حضرت الاستاذ ایسے جبر تحریر کی رائے علی اور فنی حیثیت سے وہی ہو سکتی تھی جو انہوں نے ظاہر کی۔

وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم از مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی تقطیع خور و ضخامت ۲۸۴

صفحات کتابت طباعت بہتر قیمت درج نہیں۔ پتہ۔ کتب خانہ انعامیہ دربیہ کلاں دہلی۔

یہ کتاب اصل اُن تقریریں کا مجموعہ ہے جو فاضل مصنف نے سیرت النبیؐ کے متعدد جلسوں میں کی تھیں

جیسا کہ نام سے ظاہر ہو۔ تقریروں کا اصل موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کے آغاز سے لے کر وفات تک کے تمام حالات کا بیان تھا۔ لیکن تقریریں اور خصوصاً مواضع میں یہ ہوتا ہی ہے کہ اشیء بالشیء ذکر کے مطابق نفس موضوع کے علاوہ اور مختلف چیزیں بھی سلسلہ کلام میں مذکور ہو جاتی ہیں چنانچہ ان تقریروں میں بھی اصلی موضوع کے علاوہ اور بہت سے مسائل مثلاً حضرت عیسیٰ کا بچپن میں ہی نہی ہونا۔ عالم آخرت میں اعمال کی شکل۔ انکار حدیث، موت کا فلسفہ، دنیا کی تباہ شدہ قومیں، موجودہ تہذیب کی منہل مقصود وغیرہ پر بحث آگئے ہیں۔ بہر حال روایات مستند اور زبان موثر ہے اس کے مطالعہ سے سیرت نبویؐ کے مختلف گوشوں اور اسلامی عقائد و اعمال کے متعدد پہلوؤں کی نسبت صحیح معلومات حاصل ہوں گی۔

شیطان مترجمہ حکیم صیب اشعر صاحب دہلوی۔ تقطیع خورد ضخامت ۴۴ ۴۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۴۰ روپے :- رائل ایجوکیشنل بک ڈپو دہلی۔

حیران خلیل حیران عربی زبان کا مشہور اور صاحب طرز ادیب ہے، اس کی بعض کتابوں کے اردو تراجم لاہور اور دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے اردو خوان طبقہ کے لیے یہ نام نامائوس نہ ہونا چاہیے۔ یہ کتاب موصوف کے ہی دس دھپپے پر لطف افسانوں کا مجموعہ ہے۔ حکیم اشعر صاحب حیران کے کامیاب اردو ترجمہ کی حیثیت سے اب مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کے اس تازہ ادبی کارنامہ میں بھی ان کے ترجمہ کی خصوصیات یعنی زور بیان، شگفتہ زبان اور اس کا ساکینہ اثر یہ سب موجود ہیں۔ امید ہے افسانوی ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ”شیطان“ ”ریحانہ“ اور ”خاکستر تین افسانے زبان کے علاوہ ٹکنک کے لحاظ سے بھی خاصے بلند ہیں۔

نثر ریاض خیر آبادی مترجمہ عقیل احمد صاحب جعفری۔ تقطیع خورد ضخامت ۲۱۵ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۴۰ روپے :- نفیس اکیڈمی حیدر آباد۔ دکن۔

حضرت ریاض خیر آبادی مرحوم جس طرح اردو کے صاحب طرز اور ماہر فن شاعر تھے شریں بھی اپنا ایک خاص انداز رکھتے تھے۔ محاورہ بندی، شوخ نگاری، نزاکت خیال اور شستگی بیان ان کے شعر کی خصوصیات ہیں۔ نثر میں بھی ان کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یہ کتاب مرحوم کے مختلف چھوٹے چھوٹے مضامین اور خطوط کا مجموعہ ہے جن میں بعض پرائیویٹ حالات بھی ہیں اور ابلی نکات و تنقیدات بھی۔ اس کا مطالعہ ادبی لحاظ سے مفید بھی ہوگا اور دلچسپ بھی۔

سلسلہ ۱۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعمہ مجلد ۵۰
اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب
جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ
پیش کیا گیا ہے قیمت ۵۰ روپے مجلد للعمہ

خلافت راشدہ۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں
عہد خلفائے راشدین کے تمام قابل ذکر واقعات
صحیح و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں
قیمت ۵۰ روپے مجلد للعمہ

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ ۵۰ روپے
سلسلہ ۲۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغت قرآن
پہلے مثل کتاب ۵۰ روپے مجلد للعمہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا مختصر شش
ورفتہ ترجمہ قیمت ۵۰ روپے

اسلام کا نظام حکومت۔ صدیوں کے قانونی مطالب
کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطہ حکومت کے
تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت
۵۰ روپے مجلد سات روپے۔

خلافت بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے
بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ۵۰ روپے مجلد للعمہ

سلسلہ ۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت
جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، انداز
بیان و لکھ قیمت للعمہ مجلد ۵۰

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی
قیمت للعمہ مجلد ۵۰

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعمہ مجلد ۵۰
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی۔

قیمت ۵۰ روپے مجلد للعمہ

سلسلہ ۴۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت

کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین
اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبودیت مع الالوہیت

مذہب کا بازگ اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور

اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح

کیا گیا ہے قیمت ۵۰ روپے مجلد ۵۰

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء

کے حالات مبارک کا بیان قیمت ۵۰ روپے مجلد ۵۰

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر قابل مطالعہ کتاب

صفحہ ۳۰۰ قیمت ۵۰ روپے مجلد ۵۰

نیچر ندوۃ المصنفین دہلی قزول باغ

Registered No. 4305

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

- (۱) محسن خاص :- جو محض حضرات کم و کم پانچ سو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات تدریجی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔
- (۲) محسنین :- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔
- (۳) معاونین :- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔
- (۴) احتیاء :- نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے اجائیس داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

- (۱) برہان ہر گزری مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔
- (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔
- (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس وہ سالانہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابل اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔
- (۴) جواب طلب امور کے لئے ۱۰ رکانٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔
- (۵) قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی (دو روپے بارہ آنے) (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ہے۔
- (۶) منی آرڈر ولفند کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد رفیع صاحب پرنٹر و پبلشرز، جدید، پریس ہولی میں طبع کر اگر دفتر رسالہ برہان دہلی قبول بلاتر شائع کیا

مَدَدَةُ اَيِّينِ دِلِّي كَا اِلْمِي دِيْنِي كَا هِنَا

بُرْكَان

مُرْتَبِی
سَعْدِیَا حَمْدِ سَرِآبَادِی

مطبوعات ندوة المصنفین دہلی

ذیل میں ندوة المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کیا دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین معاومین اور اجار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

<p>۱۔ غلامان اسلام :- پچھتر سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت چھ مہلہ ہے</p> <p>۲۔ اخلاق اور فلسفہ اخلاق :- علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصول اخلاق اور انواع اخلاق اور فلسفہ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت چھ مہلہ ہے</p> <p>۳۔ قصص القرآن حصاؤل :- جدید ایڈیشن ندوة المصنفین کی مایہ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت چھ مہلہ ہے</p> <p>۴۔ بین الاقوامی سیاسی معلومات :- یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت چھ مہلہ ہے</p> <p>۵۔ مسند وحی الہی :- مسند وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مہلہ ہے</p> <p>۶۔ تاریخ انقلاب روس :- ٹرانسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت چھ مہلہ ہے</p>	<p>۷۔ مسند اسلام میں غلامی کی حقیقت :- مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جن میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت آٹھ مہلہ ہے</p> <p>۸۔ تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام :- اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت چھ مہلہ ہے</p> <p>۹۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت :- اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت آٹھ مہلہ ہے</p> <p>۱۰۔ ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ :- مسند نبی عربی صلعم بتاریخ مملکت کا حصول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے قیمت چھ مہلہ ہے</p> <p>۱۱۔ فہم قرآن جدید ایڈیشن :- جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بیشل کتاب قیمت چھ مہلہ ہے</p>
--	---

برہان

شمارہ (۳)

جلد ہندویم

مارچ ۱۹۴۷ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۶۶ء

فہرست مضامین

- | | | |
|-----|--|------------------------------------|
| ۱۳۰ | سید احمد | ۱- نظرات |
| ۱۳۵ | جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاری | ۲- قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے |
| ۱۶۳ | جناب میرولی انٹہ صاحب ایڈوکیٹ ایسٹ آباد | ۳- عدم تشدد اور حفاظتِ خود اختیاری |
| ۱۸۶ | جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی | ۴- خطبہ جمعہ کی زبان |
| | | ۵- ادبیات |
| ۱۹۰ | جناب ماہر القادری صاحب | فردوسِ خیال |
| • | • | نوائے سروش |
| ۱۹۱ | ۲- ح | تبصرے |

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات

پچھلے دنوں لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں مختلف ... مدارس عربیہ اور متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ عربی نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں پہلے مولانا نے ایک تقریر کی اور اس کے بعد دوسرے حضرات نے اپنے اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا۔ باہمی گلہ و شکوہ اور بعض جزئی چیزوں میں اختلاف کے بعد سب نے بنیادی طور پر اصلاحِ نصاب اور اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد ایک کمیٹی بنادی گئی جو اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے ایک مکمل نقشہ تیار کرے گی۔

راقم الحروف نے سنہ کے ماہ اگست میں دارالعلوم دیوبند کی ایک انجمن نادۃ الاتحاد کے سالانہ جلسہ میں ایک طویل خطبہ صدارت پڑھا تھا جس میں نصابِ تعلیم اور طریقہ تعلیم کی اصلاح کی ضرورت اور اس کے طریقوں پر مدلل اور مفصل گفتگو کی گئی تھی اور اس سلسلہ میں چند مفید تجاویز بھی پیش کی گئی تھیں یہ خطبہ اسی وقت انجمن کی طرف سے متوسط سائز کے ۳۲ صفحات پر چھاپ کر شائع کر دیا گیا تھا۔ ملک کے متعدد وقیع اخبارات و رسائل نے کھلایا جزا اس کو اپنے کالموں میں جگہ دیکر اور اس پر تائیدی شدہ لکھکر اور ان کے علاوہ ہندوستان کے متعدد اربابِ علم اور یونیورسٹیوں کے بعض مشہور اساتذہ عربی نے شخصی طور پر خطوط تحریر فرما کر خاکسار کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ جو حضرات اس خطبہ کے اولین مخاطب تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان معروضات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی بلکہ کسی نے کھلم کھلا اور کسی نے ارشادِ زیر لب کے انداز میں ”تجدد“ اور ”تنور“ کا ملزم قرار دیا۔ بہر حال خوشی کی بات ہے جو باتیں پہلے ایک فقیرِ بنیوا کی زبان سے ناشنیدی تھیں وہ اب لُن حضرات کے لئے بھی قابلِ غور ہو گئی ہیں جو ان کو سرے سے سنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور اگر

ارباب اخلاص کی جدوجہد اسی طرح جاری رہی تو امید ہے ہمارا یہ پرانا خواب ایک دن ضرور سچ ثابت ہو کر رہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ درس نظامی تین قسم کے علوم و فنون پر مشتمل ہے (۱) علوم دینیہ۔ جیسے تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ۔ (۲) علوم آلیہ یعنی وہ علوم جس سے علوم دینیہ کے فہم و تفہیم میں مدد لینا گزیر ہے جیسے صرف و نحو۔ ادب۔ معانی و بیان۔ فن بلاغت و بدیع۔ (۳) علوم عقلیہ، ان سے مراد وہ علوم ہیں جو نہ خود دین ہیں اور نہ جن سے علوم دینیہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی حیثیت صرف یہ ہے کہ یہ علوم عصریہ تھے۔ علماء اسلام نے شروع شروع میں ان علوم کے پڑھنے پڑھانے کی مخالفت کی لیکن جب دیکھا کہ یہ ارباب باطل کا ہتھیار بن گئے ہیں تو انھوں نے خود ان علوم کو پڑھا اور ان پر تنقید کر کے مسائل دین کے مقابلہ میں ان کی اثر آفرینی ختم کر دی چنانچہ امام غزالیؒ کی تہافت الفلاسفہ پھر علامہ ابن رشد المتوفی ۵۹۵ھ کی تہافت الفلاسفہ جس میں علامہ نے اگرچہ امام غزالیؒ سے متعدد مقامات پر اختلاف کیا ہے لیکن بہر حال خود بھی امام کی غرض و غایت کی تکمیل ہے اور اس کے بعد خواجہ زادہ (م ۸۹۳ھ) کی تہافت الفلاسفہ جو انھوں نے سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کے ایما سے لکھی تھی، یہ اور ان کے علاوہ حافظ ابن تیمیہؒ کی "الرد علی المنطقیین" اور امام رازیؒ کی شرح اشارات یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ان علوم میں منطق اور فلسفہ شامل ہیں جن کو ہمارے قدیم نصاب تعلیم میں نمایاں امتیاز حاصل رہا ہے اور اب بھی مدارس عربیہ کے طلباء کے کئی قیمتی سال انھیں کے نذر ہو جاتے ہیں۔ ان علوم کے علاوہ مدارس میں ہیئت اور تاریخ کی بھی دو تین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اول الذکر کا مقصد محض ایک عصری فن کا جاننا اور تاریخ کا مقصد اپنے اسلاف کے کاموں اور کارناموں سے واقف ہونا تھا، ہمارا درس نظامی جو ملا نظام الدین بہالی المتوفی ۷۸۵ھ کی طرف منسوب ہے۔ بس انھیں مقاصد کو سامنے رکھ کر بنا یا گیا تھا اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس زمانہ میں جو عمدہ و عمدہ اور مفید کتابیں دستیاب ہو سکتی تھیں ان کو درس کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ درس نظامی کی اس ہیئت ترکیبی سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ علمائے کرام کے نزدیک دینی تعلیم کی اسپرٹ کیا تھی یعنی وہ صرف دین کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ

ان کے نزدیک عالم بننے کے لئے علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ کا مطالعہ اور ان سے واقف ہونا بھی لازمی تھا۔ اب ان مقاصدِ تعلیم کو سامنے رکھ کر درسِ نظامی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ اُس کی موجودہ ہیئت دینی اور عصری علوم دونوں کی تعلیم کے لحاظ سے سراسر ناقص اور مقاصد کے لئے غیر مفید ہے اور غیر افادیت کی وجہ سے اس طرح نصابِ تعلیم پر اس نصاب کا طریقہ تعلیم بھی بڑی حد تک اس کا سبب ہے کیونکہ پہلے زمانہ میں جیسا کہ آجکل یونیورسٹیوں کی اعلیٰ کلاسوں میں ہوتا ہے طریقہ تعلیم ایسا تھا۔ استاد کسی مسئلہ پر فنی حیثیت سے کلام کرتا تھا اور تلامذہ اس کو قلمبند کرتے جاتے تھے اس طرح تعلیم کسی خاص ایک کتاب کی نہیں بلکہ فن کی ہوتی تھی اور طلباء کو استاذ کے لکچروں کے ذریعہ فنی بصیرت مہارت پیدا ہو جاتی تھی لیکن آج کل ہوتا یہ ہے کہ استاد کی تمام تر توجہ کتاب کی عبارتیں چیدگیوں اور مصنف کے مافی الضمیر کی تشریح و تفصیل پر مرکوز رہتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم نحو میں کافیہ اور شرح جامی پڑھتا ہے مگر اسے نحو نہیں آتی منطق میں سلم اور ملا حسن پڑھتا ہے مگر منطق سے کو راہی رہتا ہے۔ اصول فقہ میں اصول التلاشی اور تورالانوار کا درس لیتا ہے لیکن جیسا کہ اصول فقہ کے ایک طالب علم سے توقع کرنی چاہئے وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وقت کا کوئی اہم مسئلہ سامنے آجائے تو وہ اصول احکام کی روشنی میں کوئی حکم مستنبط کر سکے۔ قس علی ذلک۔ راقم الحروف اور اکثر رفقاء ندوۃ المصنفین نے حدیث اور منطق خلفہ کا درس علی الترتیب حضرت الاستاذ مولانا الیہ محمد انور شاہ الکشمیری مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور مولانا رسول خاں صاحب مدظلہما سے لیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک بزرگ اپنے اپنے فن کا امام تھا۔ اگرچہ کتاب ان کے سامنے بھی ہوتی تھی لیکن ان حضرات کا طریقہ درس ایسا ہی تھا۔ کسی مسئلہ پر تقریر کے وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مسئلہ سے متعلق فنی طور پر جتنی معلومات ہو سکتی ہیں وہ سب ان حضرات کے دماغ میں موجود ہیں وہ مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر سیر حاصل گفتگو کرتے تھے اور اس سے متعلق اکابر ائمہ فن کی آراء اور ان کے دلائل بیان کرنے کے بعد خود سب پر محاکمہ اور تبصرہ کرتے اور اخیر میں اپنی ایک قطعی رائے دلائل و بایں کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ لیکن یہ طریقہ صرف انھیں حضرات کے ساتھ مخصوص تھا اب وہ بات کہاں!

بہر حال سب سے مقدم اور اہم چیز یہ ہے کہ طریقہ تعلیم کی اصلاح کی جائے۔ اس میں شک نہیں اہل کے طریقہ پر درس دینے کا اہل ہر ایک مدرس نہیں ہو سکتا اور جو صاحب فن ہو گا وہ معمولی تنخواہ پر دست یاب نہیں ہو سکتا اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک میں آج کل ایسے حضرات کا قحط بھی ہے لیکن اگر واقعی مدارس عربیہ میں اصلاح کر کے انھیں وقت کے تقاضوں کے مطابق مفید اور کارآمد بنانا ہے تو یہ سب کچھ اور اس کی تکمیل کے لئے جو اسباب طبعی ہو سکتے ہیں ان کا بندوبست کرنا ہی ہو گا۔

دوسرا مسئلہ نصاب تعلیم کا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف علوم و فنون کی تعلیم کے لئے جو کتابیں رائج ہیں ان کی جگہ ایسی کتابیں شامل درس کی جائیں جو ان علوم کی تعلیم کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکتی ہیں اور آج کل بازار میں مل بھی سکتی ہیں۔ علاوہ بریں فنون کی تعلیم سے متعلق قدیم نقطہ نظر کو بھی تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً اصول حدیث کے سلسلہ میں صرف نخبۃ الفکر پڑھا دینا کافی سمجھا جاتا ہے حالانکہ اسماۃ الرجال کا جاننا بھی حدیث کے ایک طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔ ادب کا حال ان سب سے بدتر ہے۔ ادب کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ ادب اور علم السنہ اور ساتھ ہی عصر جدید کی ادبی ترقیات اور اس کی لسانی تبدیلیوں سے باخبر ہو۔ پھر اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کا فن تنقید نہایت کامل و مکمل ہے لیکن ہمارے طلبہ اس سے بھی نا آشنا رہتے ہیں ضرورت ہے کہ ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں ان تمام خامیوں کو دور کیا جائے اور اس کا نصاب دیا بنایا جائے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ایک طالب علم آج کل کی اصطلاح کے مطابق صحیح طور پر ادب کہلایا جاسکے۔

معانی و بیان اور بدیع میں ہمارے ہاں سب سے زور فن بدیع پر رہتا ہے حالانکہ اصل چیز فصاحت و بلاغت کا فن بدیع متاخرین کی ایجاد ہے اور اس سے بے اوقات لفظی حسن پیدا کرنے کی کوشش میں اصل معنی کا خون ہو جاتا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں کوئی ادل بدل نہیں ہو سکتا البتہ تفسیر کی مروجہ درسی کتابوں میں ادل بدل کرنا نہایت ضروری ہے اور اصول تفسیر کا فن ہمارے ہاں بالکل نہیں پڑھایا جاتا اس کو بھی شامل درس ہونا چاہئے۔ فقہ میں کم از کم ایک کتاب ایسی ضرور ہونی چاہئے جس سے طالب علم کو حنفی مسلک کے علاوہ دوسرے مذاہب فقہ اور ان کے مبادی و

اصول کا علم ہو۔ پھر ہمارے طلباء تاریخ علوم سے ناواقف رہتے ہیں اس کے لئے مقدمہ ابن خلدون کا انتخاب یا کوئی اور کتاب جو اس مقصد کے لئے مفید ہو شامل درس ہونی چاہئے۔

اب رہی علوم عصریہ! تو کوئی بالغ نظر انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عصر کے بدل جانے کے ساتھ اب مدارس عربیہ کے علوم عصریہ بھی بے وقعت ہو گئے ہیں جو چیزیں فلسفہ قدیم کی مسلمات سمجھی جاتی رہی ہیں اب وہ بدیہی^{المطلان} بن گئی ہیں اور اب ان کا پڑنا صرف ایک خاص زمانہ کی عقلی رفتار کے جان لینے کی حیثیت سے تو مفید ہو سکتا ہے ورنہ علمی اعتبار سے ان کا کوئی وزن نہیں۔ مدارس میں بالعموم رسالہ ملا جلال و میرزا ہد کی صرف ایک یہ بحث کہ علم کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کس مقولہ سے ہے؟ پوسے ایک برس میں تمام ہوتی ہے اور پھر بھی دماغ میں روشنی پیدا نہیں ہوتی اس کے بالمقابل اگر کانت کی کتاب "تنقید عقل محض" پڑھائی جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ فلسفہ کا ایک اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے بلکہ اس سے وحی اور الہام اور بعض اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے پھر ہمارے ہاں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ طبیعیات اور الہیات دونوں کے مباحث ملے جاتے ہیں اور وہ بھی جتنا کچھ پڑھایا جاتا ہے صرف جز لایعجزی صورت دہیولی اور اسی قسم کے چند اور مسائل تک محدود رہتا ہے۔ موجودہ فلسفہ کا ایک اہم شعبہ فلسفہ اخلاق ہے۔ مدارس عربیہ کے طلباء کو اس کی سوا بھی نہیں لگتی۔

کہا جاسکتا ہے آخر علوم عصریہ میں تو اور بہت سے علوم بھی شامل ہیں انہیں چھوڑ کر صرف فلسفہ کو ہی نصاب میں کیوں شامل کیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ اور علوم مثلاً اقتصادیات، علم نباتات، کیمیا اور طبیعیات وغیرہ علوم معاشی یا عملی علوم ہیں۔ انسانی عقائد و افکار سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس فلسفہ انسان کے مذہبی اور اخلاقی و روحانی افکار و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عام طور پر مذہبی کجروی اور گمراہی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بنا پر علمائے جس طرح پہلے فلسفہ قدیم پڑھا اسی طرح اب ان کو فلسفہ جدید پڑھ کر فکر و نظر کی گمراہی کا سد باب کرنا چاہئے۔

ان علوم کے علاوہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ اور جغرافیہ ان چیزوں کا بھی درس نظامی میں شامل ہونا نہایت ضروری ہے پھر تاریخ بھی صرف اپنی نہیں بلکہ مختلف قوموں اور سلطنتوں کی دنیا کے بڑے بڑے مذاہب و تہذیب تمدن کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے اس سلسلہ میں بھی چند گزارشیں در کرنی ہیں وہ آئندہ اشاعت میں پیش کی جاسکیں گی۔

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمن جاسیوہاری

(۷)

علیٰ | ایک حقیقت نگاہ ہستی ان بصیرت افروز صفاتِ عالیہ پر جب عمیق نظر ڈالتی ہے تو بے ساختہ اس کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلاشبہ قرآن اپنی تمام پیشرو کتبِ سماویہ کے مقابلہ میں رفیع الشان اور جلیل القدر ہے اور علومِ مرتبت و رفعتِ قدر کا حامل ہے کیونکہ نہ کوئی کتاب اس کے اعجازِ بیان کو پہنچتی ہو اور نہ اسرارِ الہیہ و غوامضِ کونیہ میں کسی کو اُس کی ہمسری حاصل ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ احدیت و صمدیت خود علیؑ - بلندتر ہے۔ اور جبکہ اس کے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "علیؑ ہے، پھر قرآن کی صفت اگر علیؑ نہ ہوتی تو یقیناً وہ کلامِ اللہ بھی نہ ہوتا اور نہ دوسری کتبِ سماویہ کی طرح اس کے نظم و معانی اعجاز کا خزانہ ہوتے اس لئے کہ اگر یہ مثلِ صحیح ہے کہ "کلام الملوک ملک الکلام" تو کیا وجہ کہ یہ بھی حق اور صحیح نہ ہو کہ "کلام اللہ معجز الکلام" یعنی جب خدا کی ذاتِ بحت بے ہمتا و بے مثال ہے تو اس کا کلام بھی دوسری تمام کتبِ سماویہ کے سامنے بے مثال اور معجز ہے اس لئے اس کی علو شان اور رفعتِ مکانِ مسلم اور حقیقتِ ثابتہ ہے۔

علاوہ ازیں تورات و زبور سہیا انجیل و صحف تمام پیشرو الہامی کتابیں نہ نسخ و تنسیخ سے محفوظ رہ سکیں اور نہ تحریف و تبدیلی سے اور اسی بنا پر آج خود اہل کتاب کو اعتراف ہے کہ اُن کے پاس موجود سماوی کتابیں خود ان نبیوں اور رسولوں کے زمانہ میں مرتب و مہذب موجود نہیں تھیں بلکہ عرصہ دراز

کے بعد ان کے حواریوں یا پیروان ملت نے ان کو موجودہ شکل میں پیش کیا ہے لیکن قرآن کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ اس کی نظم و ترتیب ہمہ قسم کی تحریف و تبدیل سے محفوظ اور اس کے احکام نسخ و تنسیخ سے مبرا ہیں اس لئے بھی وہ تمام پیشرو کتابوں کے بالمقابل ”علیٰ“ ہے ”بلند و بالا“ ہے۔

وَإِنَّ فِي الْقُرْآنِ لَوْحَ مَحْفُوظٍ (محفوظ) ہے ہمارے
لَدَيْنَا لَعَلِّي حَكِيمٌ نزدیک یقیناً بلند و بالا اور مضبوط و مستحکم ہے۔

وہ لوح محفوظ میں معصون و محفوظ ہے کہ جس کو نہ قلمِ خطا و نسیان بھلا سکتا ہے اور نہ اس پر خطِ نسخ و تحریف جاری ہو سکتا ہے اور پھر خدائے برتر کے ساتھ اس کی نسبت کا یہ حال ہے کہ تمام الہامی کتابوں کے مقابلہ میں یہ اس کے نزدیک مرتبہ کے لحاظ سے ”علیٰ“ ہے اور رفعت و قدر کے پیش نظر ”طہ“ گویا جو صفات ذاتِ موصوف میں علی وجہ الکمال موجود ہیں اُن کا کامل و مکمل عکس اس کی صفتِ کلام قرآن میں بھی جھلک رہا ہے اور اسی نسبت و قربت کی وجہ سے وہ بھی ان صفات کا موصوف ہے
وَذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔

حکمت | تو اب یہ کہنے میں بھی تصنع، عبارت آرائی، یا مبالغہ آمیزی نہیں ہے کہ جو کتاب ان عالی قدر و عظیم المرتبہ صفاتِ کمالیہ کی حامل ہو وہ ”حکمت“ ہی ”حکمت“ ہے۔

”حکمت“ دانائی اور صحیح فراست کا نام ہے ایسی فراست جب کہ اس سے رہنمائی اور رہبری کا کام لیا جائے تو حقیقی سعادت کا باعث ثابت ہو۔ تو اس مفہوم کے لحاظ سے قرآن حکمت ہی نہیں بلکہ ”حکمتِ بالغہ“ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت تمام عالمِ انسانی روحانی درد و کرب میں مبتلا تھی اور اس کا ہر ایک گوشہ نقص و خام کاری میں آلودہ تھا۔ غرض حقیقی راہنمائی و قیادت سے سب ہی محروم تھے۔ ایسے تاریک دور میں قرآن کی مشعلِ ہدایت اور حکمتِ بالغہ نے دستری اور دستگیری کی اور زندگی اور مابعد زندگی کے لئے وہ نسخہٴ حیات اور اکیس ہدایت پیش کیا کہ حکیم و دانائے اور فیلسوف

حیران و انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ اور وہ مسلمان ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن جلد یا بدیر سب ہی کو تسلیم کرنا پڑا کہ قرآن بلاشبہ حکمت ہے اور حکمت بالغہ ہے۔

اُس نے نازل ہو کر توحید کا پیغام سنا با اور شرک سے نفرت دلائی، اُس نے پیغمبرانِ خدا کو خدا اور خدا کا بیٹا مان لینے یا عام انسانوں کی طرح اُن کے پیغامات کو بھی محض انسان اور بشری خیالات بتلا کر غیر الہامی قرار دینے کی افراط و تفریط سے بچایا، اُس نے انسانی معاشرت کی اصلاح کی، معاشی اقدار کو عدل و نصفت کے سانچے میں ڈھالا، اُس نے انسانوں کو انسانیت کا سبق دیا بلکہ انسانیت کبریٰ تک پہنچایا۔ اسی تعلیم کا نام حکمت ہے اور ایسے ہی پیغام کو حکمت بالغہ کہا جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ مذکرہ، حضرت ہود و صالح علیہما السلام کا اپنی قوم سے مناظرہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مجادلہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مقابلہ، غرض حق و باطل کے وہ تمام مظاہر جن کا ذکر انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کے سلسلہ میں آیا ہے اسی حکمت اور حکمت بالغہ کے شواہد و نظائر ہیں۔

خدا کی توحید، رسول کی رسالت، معاد کا اثبات، معاشرت و معاشیات کی اصلاح، غرض وہ کونسا پہلو ہے جس کو حکمت بالغہ کے ذریعہ محکم دلائل و روشن براہین کی شکل میں اُس نے پیش نہ کیا ہو ہر ایک پہلو کو اس کی نمایاں خصوصیات کے ساتھ نمایاں کیا اور حکمت و دانائی کی راہ سے تمام پہلوؤں کے حقائق کو ممتاز بھی کیا اور ان کے درمیان تعلق و ربط بھی قائم کر دکھایا۔ سو یہی ہے وہ حقیقتِ عالیہ جس کو قرآن نے اس اعجازِ بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حِکْمَةٌ بِالْغَةِ فَمَا تَعْنِي (قرآن) پوری عقل کی بات ہے پھر ان پر موثر

النذر (القمر) نہیں ہوتے ڈرسانے والے۔

الحائل قرآن کا یہ دعویٰ بھی اپنی جگہ حق و صداقت پر مبنی ہے کہ وہ ایسی بے نظیر کتاب،

بے مثال، بے ہمتا و عظمت ہے کہ جس کا ہر ایک جملہ اور ہر ایک کلمہ حکمت اور حکمت بالغہ ہے۔
جل جلالہ | سطور بالا سے جب یہ واضح ہو چکا کہ قرآن ایسی کتاب ایسا کلام، اور ایسی موعظت ہے جو روشن بہان، محکم حجت، واضح بیان ہے اور اس کی تعلیم حکمت اور حکمت بالغہ پر مبنی ہے تو پھر کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی مضبوط رستی ہے۔

جل کے معنی رستی کے ہیں اور جل اللہ خدا کی رستی کو کہتے ہیں۔ رستی چند ایسے دھاگوں کے مجموعہ کا نام ہے جو بٹے جا کر اور انفرادی حیات کو اجتماعی زندگی پر قربان ہو کر ایک مضبوط شے بن جاتے ہیں اور وہ نہ یہ کہ خود مضبوط ہو جاتے ہیں بلکہ دوسرے بھی ان کی مضبوطی کا سہارا اور آسرا ڈھونڈنے لگتے ہیں، تم نے ایک دھاگے کو خواہ وہ سوت کا ہوسن کا ہو یا ریشم کا ریکھا ہو گا کہ جب کوئی شخص اس پر زور آزمائی کرتا ہے تو باسانی اس کے ٹکڑے کر دیتا ہے لیکن تم نے بھی ضرور دیکھا ہو گا کہ جب چند دھاگے اک کر ایک بٹے ہوئی رستہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو چند بہادر انسانوں کی رستہ کشی کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے اور کثرت نے وعدت کی جو صورت اختیار کر لی ہوتی ہے اُس کے بل بوتہ پر خود بھی محکم اور پائیدار رہتے ہیں اور دوسروں کی پائیداری کے لئے بھی سینہ سپر بن جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے جس طرح مادی دنیا میں ”جل متین“ بے سہاروں کا سہارا اور پے پناہوں کی پناہ ثابت ہوتی ہے اور خود بھی محکم و استوار رہتی اور دوسروں کی استواری کے لئے ممد و معاون بنتی ہے۔ اسی طرح عالم روحانیات میں بھی ”جل متین“ کے بغیر خدا طلبی اور خدا رسی ناممکن ہے اور گو اس کا وجود ہر ایک دور اور ہر ایک زمانہ میں رہا ہے لیکن مقتضیاتِ زمانہ اور تاثراتِ ماضیہ کے مطابق وہ ہمیشہ ایک مخصوص وقت تک کارگر ثابت ہوئیں اور وقتِ معینہ کے بعد چارہ گرنہ بن سکیں میرا وجود اس معاملہ میں بھی دوسروں سے ممتاز اور جدا ہے اور میں وہ روحانی جل متین ہوں جو تاقیام قیامت ہر ہاتھ بڑھا کر سہارا لینے والے کو سہارا دیتی اور گرفت میں لینے والوں کے لئے آسرا بنتی ہوں اور اس لئے ”جل متین“ ہوں۔

یعنی میں سوت، سن، ریشم یا لوہے کی رتی نہیں ہوں کہ پانی میں گل جاؤں یا مٹی میں ل جاؤں
یا ریشہ ریشہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جاؤں اور نہ میں وقتی تقاضا اور ہنگامی ماحول کی صدائے بازگشت ہو
کہ وقت اور ہنگام کے تقاضوں کو پورا کر کے موت کی آغوش میں سو جاؤں بلکہ ان کے برعکس میں خدا
کی وہ رسی ہوں اور جل اللہ ہوں جس کا وجود مستقبل کی آخری ساعات سے وابستہ ہے اور جس کی دسترس
معاش سے معاد تک ابدی وصف کے ساتھ متصف ہے۔

پس جو خوش بخت میرا سہارا لیتا ہے وہ شاد کام و بامراد ہوتا ہے اور جو بد بخت میرے سہارے کر
نے پر واہ ہو کر رہ رہ کر منزل بنتا ہے وہ ناکامی و خسران کا منہ دیکھتا ہے۔

لہذا یہ واضح رہے کہ میری جانب دوڑنے والے اور سہارا تلاش کرنے والے اپنی انفرادیت کو اجتماعیت
میں جذب کر کے آئیں اور علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ مجتمع ہو کر اس کو پکڑ لیں تاکہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہر حیثیت سے
بہتر اور مفید ثابت ہو۔ کیونکہ انفرادی زندگی درحقیقت زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی کا سراب ہے حقیقی حیات
تو دراصل اجتماعی حیات ہی کا نام ہے اور وہ انسانوں کو بلند مراتب اور اعلیٰ درجات پر فائز کرتی اور خدا کی
درگاہ میں مقبول بناتی ہے۔ اس لئے کہ نہ تشنت و افتراق میرا شیوہ ہے اور نہ میری تعلیم کی یہ روح ہے بلکہ
اجتماعی زندگی کے لئے یہ راہ جہدک اور بے پناہ ہے۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ کسی طرح بچھڑے ہوؤں کو
ملاؤں، افتراق کو مٹا کر وحدت پیدا کروں اور اس طرح خدا کی امن رستی کو مضبوط پکڑنے والوں کو یک دل و
یک جان بنا دوں تاکہ انشفاق و تخریب کا انسداد ہو کر تمام کائنات انسانی ایک ہی "اخوت" کے دامن میں
سماجئے اور دوئی کا اختلاف درمیان سے ہٹ جائے۔

غرض میرا مقصد، میری تعلیم، میرا جذبہ، میرا فیصلہ سب اسی ایک بات پر مرکوز ہیں کہ جو شخص "جل شدہ"
کو اجتماعی حیثیت میں گرفت کرے گا وہی منازل علیا کو حاصل کر سکے گا اور جو تشنت و تخریب کا طالب ہو گا وہ
بے جان لاشہ کے سوا کچھ نہ پاسکے گا۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً اور اندھ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور باہم افتراق
ولا تفرقوا۔ نہ پیدا کرو۔

قیم | پھر یہ بھی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ قرآن اگر ”حبل اللہ“ ہے اور خدا کی مضبوط رسی جو وصولِ الٰہی شے
کے لئے کافی و وافی ہے تو ازل بس ضروری ہے کہ وہ سیدھی اور راست ہو اور اس میں کسی قسم کی بھی کجی نہ ہو
تاکہ رہ رو رہاہِ طریقت منزل مقصود تک آسانی اور سہولت سے پہنچ سکے، ظاہر ہے کہ جو رسی ٹیڑھی اور
کج مچ ہوگی اس کا سہارا لینے اور اس کو پکڑ کر منزل تک پہنچنے والا کب کجی اور کجروی سے محفوظ رہ سکتا ہے
البتہ یہ بات جدا ہے کہ وہ راہ ہی راہِ مستقیم نہ ہو اور جادۂ استقامت کے برعکس ہو لیکن راہِ حق تو
بہر حال ”صراطِ مستقیم“ ہے اور اس کی استقامت میں کسی کو بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ تب یہ بھی لازم ہے
کہ راہِ مستقیم کی معراج تک پہنچنے کے لئے جس حبلِ متین کو کام میں لایا جائے وہ بھی زینج و کجی سے مستقیم
اور سیدھی ہو۔

پس قرآن حکیم یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ایسی حبل اللہ (خدا کی رسی) ہے جو ہر طرح کجی اور
کجروی سے مامون و مصون ہے یعنی نہ اس میں افراط ہے نہ اس کے اوامر و نواہی بندگانِ خدا کے لئے
مصیبت و عذاب بن جائیں اور نہ تفریط ہے کہ جس میں وہ ضروری احکام تک موجود نہ ہوں جن کی ضرورت
اور حاجت ہے اور یہ کہ ان کی تکمیل کے لئے کسی دوسری الہامی کتاب کی احتیاج محسوس ہونے لگے چنانچہ
قرآن نے اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر اس طرح واضح کیا ہے۔

”ما فرطنا فی الكتاب من شیء ہم نے الكتاب (قرآن) میں کسی شے کی کمی نہیں کی
یہی وجہ ہے کہ وہ الہامی کتابوں میں ”آخر کتاب“ قرار پائی اور اس کا پیش کرنے والا پیغمبرِ خاتم الرسل و الانبیاء
کے مغزِ لقب سے سرفراز و ممتاز ہوا۔

یا اس لئے ”قیم“ ہے کہ معاش و معاد کے تمام بنیادی مسائل اور بندگانِ خدا کے تمام مصالح

کے لئے متکفل اور ضامن ہے اور اپنے اس وصف میں ہر طرح مستقیم اور کجی سے منزہ ہے۔ گویا مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی کتاب ہے جو ہر قسم کے نقائص سے پاک اور ہر طرح کے فضائل سے مزین ہے اور اسی حقیقت کا دوسرا نام ”قیم“ ہے۔

قرآن نے اپنی اس صفت کا اظہار منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں سے کیا ہے اور یہ کہا ہے ”وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا“ ”قیما“ اب ادبی اعجاز کے لحاظ سے خواہ ان دونوں جملوں میں سے ایک دوسرے کی تاکید تسلیم کیجئے یا دونوں کو جدا جدا مفاہیم کے اعتبار سے قبول فرمائیے۔ ہر دو تعبیرات کی صحت کا ثمرہ اور نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح کائنات میں ہر شے کی خصوصیات کا اظہار دو ہی پہلوؤں سے ہوا کرتا ہے ایک مثبت اور دوسرا منفی یا ایک ایجابی اور دوسرا سلبی حتیٰ کہ خدا کی الوہیت کے ایقان و اعتقاد کا کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ بھی ان ہی ہر دو پہلوؤں کا اعلان کرتا ہے اسی طرح قرآن بھی ان دونوں گوشوں سے اپنی حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ایسی کتاب ہوں جس میں خدا نے کسی قسم کی بھی کجی نہیں رکھی اور اس لئے افراط و تفریط سے پاک ”معتدل المزاج“ ہوں اور ایسی صورت میں یہ بھی صحیح ہے کہ جس شے میں ”عوج“ (کجی) ہو وہ بلاشبہ ”قیم“ ضرور ہے اور یہ بھی درست ہے کہ صرف یہی نہیں ہے کہ مجھ میں کجی نہیں ہے اور اعتدال ہے بلکہ اس سے زائد یہ وصف بھی رکھتا ہوں کہ میں معاش و معاد انسانی کے تمام بنیادی گوشوں پر حاوی اور لوازم ہوں خداوندی کے کامل و مکمل اصولوں پر مشتمل ہوں اور اسی بنا پر میں ”قیم“ ہوں۔

پس غور کیجئے کہ جو کتاب اعوجاج سے منزہ اور استقامت سے مزین ہو وہی اگر ”جل اللہ“ نہ ہوگی تو پھر کس کتاب کو یہ رتبہ حاصل ہوگا۔

الحمد لله الذی انزل علی عبدہ الکتاب اس اللہ کیلئے ہر قسم کی ستائش زیبا ہے جس نے اپنے بندہ

وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا قِيمًا (کہف) (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر الکتاب (قرآن) کو نازل کیا اور نہیں ٹھیرایا اس کتاب کیلئے کجی کو اور نازل کیا اس کو مستقیم۔

العروۃ الوثقیٰ | اس زمانہ میں چار اور شریعت کی پیالی اور فحان کس نے نہیں دیکھیں اور نہیں بریں کیا اس کو گرفت میں رکھنے کے لئے قبضہ کی ضرورت نہیں ہوتی؟ ضرور ہوتی ہے۔ پس اگر یہ قبضہ مضبوط ہے تو پیالی کا مضبوطہ بخوبی انجام دے سکے گی ورنہ کمزور قبضہ اگر ٹوٹ گیا تو پیالی بھی شکست ہوئی اور قبضہ بھی فوت ہوا۔ نیز اگر کوئی شخص درخت پر چڑھا ہوا ہے تو اس کو اپنی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ ایسی شلخ کو پکڑے جو خود بھی مضبوط ہو اور اس کے سہارے کیلئے بھی مضبوطی کا باعث بن سکے۔

قرآن حکیم نے بھی ایک جگہ اسی تخیل کو اختیار کیا ہے اور اس جانب توجہ دلائی ہے کہ میں درحقیقت جام شریعت اور شجر ایمان کے لئے ”عروۃ وثقیٰ“ ہوں پس جو شخص جام شریعت و شاد کام ہونا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مجھ کو قبضہ جام سمجھ کر مضبوطی سے پکڑے تاکہ اپنے مقصد میں کامران و کامیاب ہو یا جو شخص شجر ایمان کی پناہ لیتا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ مجھ کو مضبوط شلخ سمجھ کر اچھی طرح گرفت میں لے تاکہ اس کو حقیقی پناہ نصیب ہو سکے۔

لیکن قرآن تو عالم رشد و ہدایت اور کائناتِ معاش و معاد کا ایک مکمل دستور ہے جو ہر گوشہ زندگی کے لئے مصلح اعظم اور انقلاب آفرین ہے لہذا وہ تو خود ہی جام شریعت اور شجر ایمان ہے پھر اس کو ”عروۃ وثقیٰ“ کہنے کے کیا معنی؟ تو خود قرآن ہی نے اس اشکال کو اس طرح حل کر دیا کہ جو شخص المؤمن پر ایمان و اعتقاد صحیح رکھتا اور طاعت کی ہر بات کا انکار کرتا ہے تو یہ ایمان باللہ اور کفر بالطاعت گویا پورے قرآن کی حقیقی تفسیر ہیں۔ اور ان پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا بلاشبہ قبضہ جام اور شلخ شجر کو مضبوطی سے پکڑ لینا ہے تو درحقیقت جام و شجر نے اپنے ظہور و نمود کو قبضہ و شلخ کہہ کر واضح کیا ہے اور یہ طریقہ تعبیر اعجازِ بلاغت کا ایک کرشمہ ہے۔

فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن پس جو شخص طاغوت (شیطان) سے سرکشی کرے

بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے مضبوط شلخ

لا انفصام لہا والله
 (بقرہ) سمیع علیم۔
 یا کٹ جانے کا اندیشہ نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا،
 (یا) مضبوط قبضہ کو بکڑ لینا جس کو انقطاع (ٹوٹنے)

اس حقیقت کا متعدد بار اظہار کیا جا چکا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ہستی بے سہیم ہمتا اور یکتا ہے، اس لئے اس کی خالقیت و مالکیت میں بھی اس کا کوئی ہمسر و ہمدم نہیں ہو سکتا اور جبکہ وہ احد و یکتا ہے تو اس کا قانون قدرت بھی سارے عالم پر یکساں اور مساوی کا فرما ہے یہ نہیں ہے کہ مادیات و محسوسات کے لئے ایک قانون قدرت ہے اور روحانیات و مدرکات کے لئے دوسرا اور اس طرح خدا کی خدائی دو متضاد و متقابل کا فرمایوں کے ماتحت ہو۔ توجہ فطرت تمام محسوسات و معقولات مادیات و روحانیات سب پر ایک ہی طرح عامل ہے تب ضروری ہے کہ ماوراء مادیات کے مسائل کو سمجھانے اور فہم سے قریب لانے کے لئے مادیات و محسوسات کو بطور تشبیہ استعارہ اور تمثیل کے استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے اعجاز بیان کے ساتھ جگہ جگہ حسب تقاضا راسلوب عالم روحانیت کی باتوں کو عالم مادیات کی اشار کے ساتھ تمثیلی تشبیہی اور استعارہ رنگ میں ذکر کرتا اور افہام و تفہیم کے لئے سہولت بہم پہنچاتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے امتیاز و اوصاف یا اپنی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے پیش نظر رکھا اور ”واعتصموا بحبل اللہ جمیعا“ میں قرآن کو ”حبل اللہ سے اور ”فقد استمسک بالعرصة الوثقی“ میں ”عرصة وثقی“ سے تعبیر کیا اور ان استعارات کو ذکر کر کے اس حقیقت حال کی جانب توجہ دلائی کہ قرآن ایک ایسا دستورِ کامل اور ایسی کتاب محکم ہے جس پر عامل ہونے اور اتثال اوامر و نواہی کرنے کے بعد کوئی شخص گمراہ نہیں رہ سکتا اور بلاشبہ اس نے خدائے برتر کے ساتھ ایسا محکم و مضبوط رشتہ قائم کر لیا جس کو کوئی طاغوتی قوت شکست و رنجیت نہیں کر سکتی۔

غالباً اس لطیف مگر عربی حقیقت کو پیش نظر لا کر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

نے بھی ایمان کو درخت سے تعبیر فرمایا اور اعتقادات و اعمال کو اس کی جڑ اور شاخیں قرار دیا۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم رسول الله صلى الله عليه وسلم نے ارشاد فرمایا ایمان

الایمان بضع وسبعون شعبۃ کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں ان میں سے بلند بالا

افضلها قول لا اله الا الله و کلمۃ لا اله الا الله ہے اور چھوٹی سی شاخ راہ سے

ادناها اطاعة الاذی عن خس و خاشاک دور کر دینا ہے اور چار بھی

الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان ایمان ہی کی شاخ ہے۔

”لا انفصام لہا“ کہہ کر قرآن اس کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہے کہ گو قرآن کو ”جل الشریح“

اور ”العروۃ الوثقی“ شاخ شجر یا قبضہ جام سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن مشابہت صرف اسی پہلو میں

منحصر ہے کہ جس طرح ان کو مضبوط پکڑ کر ابدی اور حسی کار بر آری ہو جاسکتی ہے اسی طرح روحانی

سعادت اور ابدی و سرمدی فلاح کی کامرانی قرآن کو مضبوط پکڑنے سے وابستہ ہے لیکن قرآن ان

تشبیہی امور سے کہیں بلند و برتر ہے اس لئے کہ قبضہ جام اور شاخ شجر خود اپنی جگہ کمزور اور ناپائیدار

ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ ہوتا رہتا ہے کہ جام موجود ہے مگر قبضہ شکست ہو گیا، یا درخت باقی ہے مگر وہ شاخ

کہ جس پر تکیہ تھا ٹوٹ گئی لیکن قرآن اس طرح کا ”عروۃ وثقی“ نہیں ہے بلکہ وہ تو خود بھی محکم و مضبوط اور

ابدی و سرمدی ہے اور دوسروں کے لئے بھی ایسا مضبوط ہے کہ جس کے لئے نہ انقطاع ہے اور نہ انفکاک

پس جو بھی اس کا اتشال کرتا ہے ابدی فوز و فلاح پاتا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ اس مالک حقیقی کا کلام

معجز نظام ہے جو سمیع ہے اور کوئی نیت اور کوئی عمل اس کی سماعت سے باہر ہے جو علیم ہے اور کوئی

شے اور کوئی کام اس کے عمل سے خارج نہیں۔

الوحی | سطور بالا سے یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ قرآن کی رشد و ہدایت اور تبلیغ و دعوت کا معیار کس قدر

بلند اور رفیع ہے اور اس راہ میں اُس کی بے مثال رعنائیوں اور خوبیوں نے عالم انسانی کے نشو و ارتقاء

اور اصلاح احوال و مدارج کی کیسی بے نظیر تصویر پیش کی ہے؟ اور یہی نہیں کہ اس کے انقلاب کی صدا نے صرف روحانیات کی منزل آخر کے لئے رہنمائی کا حق ادا کیا بلکہ دینی و دنیوی سعادت کو اس مرتبہ علیا پر پہنچا دیا کہ عقل و خرد کے نزدیک جس سے آگے کوئی منزل باقی نہیں رہتی۔

یہ تو آپ بارہا سن چکے ہیں کہ کائنات مادی میں جبکہ قانونِ فطرت ہر ایک آغاز کے لئے انجام ضروری قرار دیتا ہے اور یہ کہ انجام اُس حقیقت کا نام ہے جس کے بعد انتظار اور توقع کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی تو اس کہنے میں کیوں تامل کیا جائے کہ اسی طرح عالم روحانیات کا وہ آغاز جو آدمؑ (علیہ السلام) یا پہلے انسان سے ہوا تھا اس کے ارتقائی منازل کی آخری کڑی یا اُس آغاز کے انجام کا ہی دوسرا نام قرآن ہے۔

کیا تم اس کا انکار کر سکتے ہو کہ بچہ جب اس عالم مادی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی حاجات و ضروریات بہت ہی محدود ہوتی ہیں اور وہ اپنی ماں کے ماسوا کسی سے واسطہ نہیں رکھتا پھر جوں جوں اس کی زندگی کے لمحات آگے بڑھتے اور نشو و ارتقاء کی منازل سے گذرتے جاتے ہیں اس کی ضروریات کا ماحول بھی وسیع ہوتا جاتا ہے اور والدین سے شروع ہو کر اعزہ و اقرباء، محلہ، مکتب و مدرسہ، شہر و ملک تک پہنچ جاتا ہے اور اگر استعداد و صلاحیت، رفعت و عظمت کی سر بلندیوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے تو ایک دن ساری کائنات کے ساتھ اس کا رشتہ حیات وابستہ ہو جاتا ہے۔

یہی ماحول انسان کی اجتماعی زندگی و حیات کا ہے کہ گھر سے شروع ہو کر آخر کار ساری کائنات اُس کی آغوش میں سما جاتی ہے اور کائنات کے وہ تمام امتیازات جو خاندان، قبیلہ، برادری، قوم اور ملک کے نام پر قائم تھے مٹ کر خدا کی تمام مخلوق ایک کنبہ بن جاتی ہے۔

گویا انفرادی زندگی میں جس طرح ایک انسان طفولیت، صبا رت اور مراہفتہ کے درجات طے کرنے کے بعد شباب کے عروج کو حاصل کر لیتا ہے اُسی طرح اجتماعی زندگی بھی ان امتیازاتِ اول سے

گذر کر وحدتِ انسانی کے عروج و ارتقا پر پہنچ جاتی ہے اور یہی اُس کی آخری منزل اور مقصدِ حیات قرار پاتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح عالمِ روئیات پر بھی طفولیت و صبا رت کا دور آتا ہے اور رشد و بلوغت کا عروج و ارتقا بھی حاصل وجود بنتا ہے اور اس منزل پر پہنچ کر کسی مزید نشو و ارتقا کی حاجت باقی نہیں رہتی تو اس حقیقت کے پیشِ نظر جب ہم خدا کے پیغام اور نبیوں اور رسولوں کی رسالت کے نئی اور دینی ادوار پر نگاہ ڈالتے ہیں تب ہم کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ انسانِ اول کے دور میں جس پیغام نے بساطِ دنیا پر سور بھونکا وہ اولِ اول بہت ہی محدود دائرہ رکھتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وسعت اور عروج ارتقا کی منازل پر گامزن ہوتا نظر آتا ہے تاہم ملکی اور قومی امتیازات کی حدود سے بے نیاز نہیں ہے لیکن جب وہ وقت آپہنچا کہ بنی آدم اپنی نسلی بقا کے لحاظ سے سن رشد و بلوغ کو پہنچ جائے والی تھی اور اس کے ذہنی و دماغی نشو و نما نے ارتقائی منزل کی آخری میڑھی پر قدم رکھ دیا تھا تو بہ تقاضا کے وقت ضروری ہوا کہ اب ایک پیغام آئے جو خدائے واحد کی جانب سے تمام انسانی برادری، بلکہ انسانیت کے لئے ”وحدت“ کا پیغام ثابت ہو اور یہ شرف اُسی پیغام کو حاصل ہو سکتا تھا جو ابتدائی اور وسطانی دور کے پیغامات کے مقابلہ میں روحانیات کے رشد و بلوغت کا حامل ہو اور جس کے اساسی اور بنیادی اصولوں میں ارتقا کی وہ روح موجود ہو جس کے بعد کسی روحِ حیات اور صدائے حق کی تجدید کی ضرورت باقی نہ رہے اور یقیناً بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے انسانوں کے روحانی ارتقا کی تاریخی روشنی میں قرآن کے علاوہ کسی دوسرے پیغام کو یہ شرف حاصل نہیں ہے اور اس لئے رہتی دنیا تک ہر قسم کے روحانی انقلابات و اصطلاحات کا مولد و منشا صرف قرآن ہی رہے گا۔

لیکن اس مرحلہ پر پہنچ کر ہم کو اچانک ابتداء اور آغاز کی جانب نظر اٹھانا پڑتا ہے اور اس حقیقت کی کھوج لگانے کی فکر ہو جاتی ہے جس کو دینی اصطلاح میں ”وحی“ کہا جاتا ہے کیونکہ یہی

وہ حقیقت ہے جو کسی پیغام کو بشری اور انسانی پیغامات سے جدا کر کے کسی کلام یا کسی کتاب کو پیغام الہی قرار دیتی ہے۔

اگرچہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آج کا انسان اپنے ذہنی و دماغی نشوونما کے لحاظ سے اس درجہ کو پہنچ چکا ہے جس کو ”رشد و بلوغت“ کہا جاتا ہے مگر یہ بھی اسی دنیا ر مادی کا تجربہ ہے کہ جب کسی ذکی و فطین کی ذکاوت و فطانت حد اعتدال سے گزر جاتی ہے تو بے اوقات وہ انسانی توازن دماغی کو کھو کر مایخولیا اور جنون تک پہنچا دیتی ہے چنانچہ یہی حال انسانوں کی اجتماعی زندگی کا ہے خواہ وہ مادی حیات ہو یا روحانی یعنی جب انسان اس مقام پر پہنچ کر حد اعتدال سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اس راہ میں بھی اس کی حالت ایک جنون یا مایخولیا کی سی ہو جاتی ہے اور وہ ایسے امور کو گزرتا ہے جو کسی طرح بھی سلامت روی اور اعتدال سے مطابقت نہیں رکھتے۔

پس کوئی تعجب نہیں ہے اگر آج کے علمی دور میں یہ صدا گوش آشنا ہو رہی ہے کہ اس مادی دنیا کا تعلق مادیات ہی تک محدود ہے اور باور بار مادہ کوئی حقیقت موجود نہیں ہے اس لئے ”وحی“ بھی ان خرافی تصورات و خیالات یا معتقدات کی ایک کڑی ہے جس کو دور جاہلیت میں انسانی دماغوں نے قبول کر لیا تھا ورنہ ”وحی“ نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ مادیات کے علاوہ یہاں کوئی شے موجود ہے۔

علماء برہان میں نے اس علمی دور کے شروع میں دینی تصورات اور روحانی اعتقادات کا جس طرح شدت سے انکار کیا اور ان کو جاہلی خرافات قرار دیا ان میں سے انکار وحی کو بہت نمایاں حیثیت دی انھوں نے کبھی کہا کہ انسان پر جب عصبی بیماری یا کمزوری مسلط ہو جاتی ہے تو اس کو ہسٹیریا کی قسم کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور وہ عالم بیہوشی یا نیم بیہوشی میں اوہام کی تخلیقی دنیا کے نئے نئے تماشے دیکھتا اور عجیب عجیب باتیں اور خبریں سنتا اور سنا تا ہے۔ کبھی اس کو غیر معلوم آوازیں آتی ہیں اور کبھی مختلف اشکال سے مشکل انسانوں یا عجیب و غریب صورتوں کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جو اس سے باتیں کرتی ، یا

اشارات کے ذریعہ کچھ کہتی نظر آتی ہیں اور یہی مرض جب کسی ایسے انسان پر طاری ہوتا ہے جو نیک خو، نیک سیرت، ہمدرد قوم، مصلح ملت ہو تو اس کے اپنے منتشر خیالات بیماری کے دورہ کے وقت تشکل ہو کر وہ سب کچھ ہو جاتے ہیں جن کا اظہار وہ شخص ”وحی“ کہہ کر کرتا یا فرشتہ کا نزول بتلا کر بیان کرتا ہے اور اگر وہ مریض نہیں ہے اور عصبی کمزوری میں بھی مبتلا نہیں ہے تو پھر وہ کذاب ہے اور جن باتوں کو ”وحی“ کہتا ہے ان کے بارے میں جھوٹ بولتا اور قصداً دھوکا دینا چاہتا ہے۔

بہر حال ان مادیوں کے نزدیک جبکہ مادہ کے علاوہ نہ روح ہے اور نہ خدا اور نہ روحانیات کوئی شے ہے تو انکارِ وحی یقیناً اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہی سمجھنا چاہئے

فلسفہ جدید اور انکارِ وحی و اقرار

سولہویں صدی عیسوی تک علماء مغرب بھی وحی الہی کے اسی طرح قائل تھے جس طرح آج بھی اسلام، نصرانیت اور یہودیت قائل ہے کیونکہ بائبل کی تعلیم بھی وحی کی حقیقت پر اس طرح یقین دلاتی ہے جس طرح قرآن کی تعلیم مگر جب سترہویں صدی میں علم کے نام سے شکوک کی دنیا وسیع نے اپنا سکہ چلایا تو دین و مذہب کو بیکار و خوار وحی سے انکار کو علم کی روشنی قرار دیا اور اس کے اعتراف کو جہالت اور خرافات کی پیروی ظاہر کیا ابھی یہ دور ادیان و ملل کے اس اعتقاد پر مصنوعہ خیزی ہی کر رہا تھا کہ انیسویں صدی کے وسط میں سب سے پہلے امریکہ اور اس کے بعد یورپ میں مادی علوم ہی کے ذریعہ ایک نئے علم و اکتشاف کا آغاز ہوا اور انھوں نے دین و مذہب یا رسوم تقلیدی کی پیروی میں نہیں بلکہ علمی تجربات کی فصائیں یہ اعلان کیا کہ یہاں صرف عالم مادی ہی نہیں بلکہ مشاہد و محسوس مادیات کے علاوہ ایک اور عالم بھی ہے جس کو عالم ارواح کہنا مناسب ہے اور علمی تجربات سے انھوں نے ثابت کیا کہ اگر مصنوعی طریقوں سے انسان کے مادی جسم اور حواس کو معطل کر دیا جائے تو پھر اس مادی شخصیت میں مستور روحانی شخصیت کا رقبہ نظر آئے گی اور اس کے ادراکات و علوم اور معرفت کی بلندی حیرت زا وسعت کے ساتھ عالم زیر و بالا تک رسائی کی جائے گی۔

وہ کہتے ہیں کہ اس محسوس اور مادی انسان میں ایک روحانی شخصیت موجود ہے اور انسان درحقیقت اُسی کا نام ہے مگر ہمارے یہ حواس خمسہ اُس کے احساس و تعین سے قاصر ہیں البتہ جب ہماری یہ مادی شخصیت کسی مصنوعی عمل سے یا خواب کی وجہ سے معطل ہو جاتی ہے تب اس باطنی شخصیت کے جوہر کھلتے ہیں اور اس کے ادراک لطیف کی پہنائیوں تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مقناطیسی اثر سے کسی کو معمول بنا کر اُس پر مصنوعی نیند یا نیم بیہوشی طاری کر دیتے ہیں تو اُس کی مادی شخصیت مقہور ہو جاتی ہے اور باطنی شخصیت اس قید و بند سے آزاد ہو کر ان امور تک رسائی حاصل کر لیتی ہے جن کا اس کی مادی شخصیت کو علم تو کیا گمان تک بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں انسان بہت سے غیبی امور اور مستقبل کے حوادث کا علم حاصل کر کے دوسروں کو بھی بتا دیتا ہے اور جہاں تک اس کے مادی جسم نے رسائی تک حاصل نہ کی تھی ان دور دراز مقامات کو عیاناً اور مشاہدہ دیکھ دیکھ کر ان کے متعلق دریافت کردہ سوالات کا دست بدست صحیح جواب دینے لگتا ہے۔

چنانچہ امریکہ و یورپ کے علماء و روحانیین نے تقریباً تیس سال اس سلسلہ میں ہزاروں تجربے کئے اور بڑے بڑے علماء و فلسفہ روحانیات پر مشتمل کمیٹی نے ضخیم جلدوں میں ان کو مدون و مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے علمی تجربوں نے متفقہ طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر ان کو مجبور کر دیا کہ انسان اس حقیقت ہی کا نام نہیں ہے جو مادی شخصیت میں ہماری آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہے بلکہ اس کے اندر ایک اور شخصیت مستور ہے اور وہی ان اعضاء انسانی کے لئے باعثِ تکوین اور موجبِ تحریک ہے جو ظاہر انسان کے ارادہ و اختیار سے حرکت پذیر نہیں ہیں۔ مثلاً قلب، جگر، معدہ وغیرہ اس لئے اہل انسان وہ ہے نہ یہ جو محسوس و مشاہدہ ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جو انسان کے جسم کثیف اور اس کے مادی افعال کے تعطل کی صورت میں قوی ہو کر مشاہد انسان کو ان امور سے باخبر کرتی اور ان علوم و معارف کا افراک بخشی ہے جو الہام یا وحی کہے جاتے ہیں گویا انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی خارجی

اثرات کے بغیر اُس کی جبلت و طبیعت ہی اس پر امور غائبانہ کا انکشاف کر رہی ہے۔

علماءِ روحانین کی اس دریافت کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی قوتِ مدرکہ و دلیّت ہے جس کا احساس حواس نہیں کر سکتے اور انسان نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا ہے اور کس طرح ہے لیکن اس کے ثمرات اور عطا کردہ معارف و علوم اور ادراکات پر مشاہدہ سے زیادہ یقین رکھتا ہے اور ان ادراکات و علوم کے مظاہرے اس قدر واضح اور یقینی ہوتے ہیں کہ خود وہی اُن کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ دوسرے بھی اس کے اعتراف پر مجبور نظر آتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص حباب سے قطعاً نا آشنا ہے اور اس کی عدم واقفیت اس کے رفقاء میں مسلم ہے تاہم جب مصنوعی طریقہ تنویم سے اس کو نیم بہوش کرنے کے بعد اس سے علمِ ریاضی کے مشکل سے مشکل سوالات کئے گئے تو اس نے فوراً ہی ایسے صحیح جوابات دیے جن کو ماہرینِ علمِ ریاضی بھی کافی غور و خوض کے بعد دیکھتے تھے، اسی طرح مختلف ملکوں میں اس وقت جو ہو رہا تھا ایک دوسرے شخص پر بھی عمل کرنے کے بعد جب اس سے ان واقعات کے متعلق دریافت کیا تو اس نے ان واقعات کو اس طرح بیان کر دیا گویا وہ خود ہر واقعہ کو اپنی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ تجرباتِ علمی اس کے شاہد ہیں کہ بعض اشخاص ایسے پائے گئے بچپن میں کہ جبکہ اُن کی عمر ریاضی مسائل کے سمجھنے کے بھی قابل نہ تھی یعنی ۸-۹ سال کی عمر میں علمِ ریاضی کے دقیق مسائل کو آسانی سے سلجھا دیا کرتے تھے مگر جب وہ جوان العمر ہوئے اور ان کے باطنی مدرکات پر کشیف ظاہری شخصیت اور حواس ظاہری کا دباؤ زیادہ پڑا تو وہ ان حیرت زا جوابات دینے سے قطعاً قاصر نظر آنے لگے۔ جن کو وہ بچپن میں آسانی سے حل کر دیا کرتے تھے۔

غرض ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے خوش اعتقادی یا دینی تقلید یا ملکی و وطنی رسوم سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ علمی تجربوں کی کسوٹی پر کس پر سکڑوں انسانوں میں ایسے ہزاروں واقعات کا مشاہدہ کیا ہے

جن سے آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس مادی کثیف انسان کے اندر ایک ایسی زبردست باطنی شخصیت موجود ہے جس کے لئے یہ جسم اور اس کے ظاہری حواس و اعمال حجاب بنے ہوئے ہیں اور بعض مخصوص حالات میں جب اس کو اس کثافت کے دباؤ سے آزادی نصیب ہو جاتی ہے یا اس کا دباؤ نسبتاً کم ہو جاتا ہے تو پھر باطنی شخصیت کے واسطے اس کی روح متجلی انسان کو حیرت زار علوم و معارف اور ادراکات سے روشناس کراتی ہے اور عظیم الشان انقلابات کا باعث بنتی ہے اور یہ مخصوص حالات کبھی مصنوعی ہوتے ہیں جو عمل تنویم یا طبعی خواب یا ریاضات و مجاہدات سے حاصل ہوتے ہیں اور کبھی فطری طور پر بچپن میں نمایاں نظر آتے ہیں اور جب عمر ترقی کر کے مادی انسان اور اس کے حواس قوی ہو جاتے ہیں تو یہ باطنی شخصیت اپنی کار فرمائیوں میں ماند پڑ جاتی اور بے اوقات ستور ہو جاتی ہے۔

علماءِ مادیین کا یہ گروہ صرف اس لئے ”روحانیین“ کہلاتا ہے کہ ان کے نزدیک مادہ کے علاوہ ایسی باطنی روحی قوت موجود ہے جو اس قدر زبردست قدرت رکھتی ہے کہ اسبابِ ظاہر کی اعانت کے بغیر انسان کو علوم و فنون اور معارف و ادراکات کے لطائف و اسرار سے باخبر کرتی اور مادی اسباب معلوم کی نگاہ میں جو امور اور جو اشیاء پردہ غیب میں ہیں ان کا مشاہدہ کرا دیتی ہے اس لئے ان کے علمی تجارب کا یہ فیصلہ ہے کہ ”علم“ نے ہمارے سامنے ایک بند دروازہ کھول دیا ہے اور کل جس کا ہم انکار کرتے رہے ہیں وہ آج ناقابلِ انکار حقیقت ہے مگر یہ وہ باطنی اور روحی طاقت ہے جو انسان کے اپنے اندر موجود ہے اور کسی دوسری مخلوق (فرشتہ) کے ذریعہ یا اور دوسرے ذرائع سے باہر سے نہیں بخشی جاتی۔ اور کبھی یہ کیفیت خواب کی حالت میں بھی طاری ہوتی ہے اور بے اوقات ایک شخص نیند میں مستقبل کے واقعات کا روز روشن کی طرح مشاہدہ کر لیتا ہے یا جن مسائل کو بیداری میں لایحل اور مشکل تر سمجھتا رہا ہے وہ خواب میں آن کی آن میں حل ہو جاتے ہیں۔

پس جو علماءِ مادیین اس کا انکار کرتے ہیں وہ دراصل حقائق کے منکر ہیں، نیز چونیک خصال،

کریم الاخلاق اشخاص قوموں اور ملکوں کی دینی و دنیوی سعادت کے لئے اصلاحی و انقلابی نظام حیات پیش کرتے ہوئے اس قسم کے علوم و معارف اور نکات کا مظاہرہ کرتے اور ان کو وحی یا الہام کہتے ہیں وہ نہ کاذب ہیں اور نہ مفتری ہیں اور نہ وہ دماغی اور غیر دماغی امراض کے مریض ہیں بلکہ اپنے دعوے میں سچے اور صادق القول ہیں۔ البتہ یا تو ان کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی باطنی شخصیت اور ملکہ باطن کی قوتوں سے مرعوب ہو کر اس کو بشری طاقت سے خارج سمجھ لیتے ہیں اور یا تو یہ متخیل ایک عجیب الہیت شخصیت کو مشکل کر کے ان کو یقین دلا دیتی ہے کہ یہ علم و عرفان اس فرشتہ کے ذریعہ حاصل ہوا ہے غرض ایک انسان کا اپنی جسمانی زندگی کے لحاظ سے بہت سے امور مجھے لئے جاہل، غبی، اور ناکارہ ہونا اور پھر یک بیک باطنی قوت کے ذریعہ جولانی طبع، فکر روشن اور ذہن رسا کا مظاہرہ کرتے ہوئے دلوں کے پوشیدہ بھید، مستقبل و ماضی کے متورکوائف و حالات کا اکتشاف کرنا اور اقطاع و امصار بعیدہ تک پرواز کرتے ہوئے صحیح حالات سے مطلع کرنا اس بات کی صریح اور واضح دلیل ہے کہ اس کا لبد خاکی میں ضرور ایک باطنی شخصیت پوشیدہ ہے اور یہ جسم خاکی اس کے لئے حجاب بنا رہتا ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وحی کو جس معنی میں ادیان و ملل نے یقین کیا ہے مادیین عرصہ دراز تک اس کا انکار کرتے رہے اور چند صدی بعد جب علم نے ان پر روشنی کا مزید دروازہ دیا تب ان میں سے ماہرین علوم کی ایک بڑی جماعت نے اس کا اعتراف کیا کہ دنیا پر موجود میں صرف مادہ اور محسوس ہی موجود نہیں ہے بلکہ ماوراء مادہ موجودات بھی حقیقت ثابتہ ہیں اور ان کا انکار علم و حقیقت کے انکار کے مرادف ہے۔

پس وہ روحانی قوت کے تو معترف ہوئے لیکن وحی کے متعلق ان کے علمی تجربات نے اس سے زیادہ ان کی مدد نہیں کی کہ علم و یقین کی یہ نوع بھی دراصل انسان ہی کے اندر کی چیز ہے

خارج از انسان نہیں ہے اور یہ روحانی اور باطنی شخصیت مادی شخصیت کے پردوں میں محجوب و مستور ہے اس لئے ہم کو جرات کے ساتھ یہ کہنا چاہئے کہ اس حد پر پہنچ کر بھی ”علم جدید“ حد کمال تک نہیں پہنچ سکا اور ابھی مسلسل نت نئی ترقی کی طرف گامزن ہے اور وہ وقت قریب ہی آ رہا ہے جب ”علم جدید“ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ”وحی“ کی جو حقیقت دین و مذہب کی راہ سے بیان کی گئی ہے ”علم ظاہر“ اس کے ادراک سے قاصر رہا اور اب علمی حیثیت سے بھی اس کو تسلیم کر لینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے اور ”علم“ کا یہ پہلو یقیناً موجودہ تمام علوم و ادراکات سے بلند ہونے کی وجہ سے ہمارے علوم سے علیحدہ نوع کا علم ہے جس کی معرفت کا ذریعہ ہم سے مستور مگر ذواتِ قدسی صفات پر منکشف ہے۔

اس لئے از بس ضروری ہے کہ وحی سے متعلق اُن مسائل کو سامنے لایا جائے جو مفہوم وحی، حقیقت وحی، امکان وحی اور وقوعِ وحی سے تعلق رکھتے ہیں تاکہ کثیف حقائق کے بعد قرآن کے اس دعویٰ کی تصدیق ہو سکے کہ وہ بلاشبہ ”وحی الہی“ ہے۔

وحی کے لغوی معنی | ”رازداری کے ساتھ کسی بات کی اطلاع دینا“ لغت کی زبان میں ”وحی“ کہلاتا ہے یعنی جب کسی مخاطب کو اس طرح خفیہ خبر دینی ہو کہ دوسرے کو اس کا علم نہ ہونے پائے تو عربی میں اس اطلاع کو یوں کہتے ہیں ”وحیت الیہ“ ”او حیت الیہ“ نیز اگرچہ ”وحی“ معنی مصدری کا نام ہے لیکن لکثرت و بشیر اس خبر یا اطلاع پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو رازداری کے ساتھ دی گئی ہو۔

اصطلاحی معنی | اور دین و مذہب کی اصطلاح میں اس بات کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر (نبی و رسول) پر القا کی جاتی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں تعبیر کیجئے کہ ”وحی“ ایسے علم و عرفان کا نام ہے انسان جس کو اپنے نفس میں اس طرح پاتا ہے کہ اس کے متعلق اعتقاد جازم کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ یہ خدا کے برحق کی جانب سے القا ہوا ہے خواہ اس علم و عرفان کے انعام کے وقت کوئی اواز متحمل ہوئی ہو یا وہ بغیر آواز کے سنا گیا ہو اور وہ قول اور سخن نے آواز نہ لے گا مصداق ہو۔

امکانِ وحی | اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس قسم کا علم و عرفان جو عامۃ الناس سے غائب ہو مگر ان کی مصالح سے ہی تعلق رکھتا ہو کیا کسی ایسے انسان کو حاصل ہو سکتا ہے جس کو خاص اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا ہو؟ اگر اس کا امکان ہے تو عقلی مباحث میں اس کو کس طرح ثابت کیا جاسکتا، اور کس شکل میں اس کو قریب النعم اور قرین عقل بنایا جاسکتا ہے؟؟

تو اس سوال کے حل کرنے کے لئے آپ خود اپنی عقل و فراست کو ہی حکم بنائیے اور دریافت کیجئے کہ اس عالم رنگ و بو میں کیا یہ حقیقت ہر جگہ بکھری ہوئی نظر نہیں آتی کہ یہاں عقل و فہم کے تفاوت کے اعتبار سے انسان مختلف درجات رکھتے ہیں اور اس تفاوت کا یہ حال ہے کہ جس بات کو ایک انسان محال اور ناممکن سمجھتا ہے دوسرا انسان اس کو نہ صرف ممکن جانتا بلکہ اس کے وقوع کا مشاہدہ کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی عقل و فراست جن حقائق فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کے بعد بھی مشکل سمجھ پاتی ہے۔ دوسرے شخص کا فہم و ادراک نظر و فکر اور ترتیب مقدمات کے بغیر ہدایت اس کو پالیتا ہے۔

ہمہ درجات کا یہ تفاوت صرف کسب و تعلیم ہی کی راہ سے نہیں ہوتا کہ ایک ہستی نے تعلیمی ریاضتِ محنت کے بعد عقل و فہم میں ایسی حدت اور تیزی پیدا کر لی جس کو جاہل اور حامی پیدائہ کر سکا اور اس سے محروم رہ گیا بلکہ تفاوتِ درجات کا یہ مظاہرہ خود فطرت اور قانونِ قدرت کی جانب سے ہوتا رہتا ہے اور انسانوں میں فطری طور پر بھی یہ فرق نمایاں نظر آتا ہے اور اس میں انسان کے کسب و اختیار کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔

علاوہ انہی یہ بھی عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بعض امور معمولی اور متوسط افہام و عقول کے نزدیک نظری ہوتے اور دلیل و برہان کے محتاج نظر آتے ہیں اور بغیر ترتیب مقدمات ان کا حصول نہیں ہو سکتا لیکن ان سے بلند و عالی فکر و عقل کے نزدیک وہ ہر پہی ہوتے ہیں اور بغیر کسی تامل کے وہ

ان کا انکشاف کر لیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ عقل و فکر اور فہم و فراست کے درجات کے علو اور ارتقار کی کوئی خاص حد معین نہیں کی جاسکتی اور اسی لئے اصحاب افکارِ عالیہ و عقول ذکیہ میں بھی درجات کا تفاوت موجود ہے یہی وجہ ہے کہ جن بعید اور عالی امور کو اربابِ ہم قریب سے قریب تر سمجھتے اور عقل و خرد کے ذریعہ اُن کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، کم درجہ کے اصحابِ عقول شروع میں ان کے منکر نظر آتے ہیں اور جب وہ وجود پذیر ہو جاتے ہیں تو ان کے تحقق کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے اور آہستہ آہستہ اُن سے اس درجہ دانوس ہو جاتے ہیں کہ کل کے انکار اور آج کی حیرت پر شرمندہ ہو کر یہ یقین کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ گویا یہ امور کبھی قابلِ انکار ہی نہ تھے اور اب اگر اُن کے سامنے کوئی انکار کرتا ہے تو پھر اس پر اُسی طرح غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں جس طرح شروع میں ذکی الفہم اور سرِ بعِ العقل دانا پر ان امور کے انکار کے لئے کرتے رہے تھے۔

غرض تفاوت درجات کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور آج بھی موجود ہے اور ناقابلِ انکار حقیقت کی طرح موجود ہے۔

پس اگر یہ مقدمات ناقابلِ انکار اور بدیہی ہیں اور ان کے متعلق کبھی بھی دو رائے نہیں رہیں، اور آج بھی نہیں ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان صحیح اور بدیہی مقدمات کا جو نتیجہ اور ثمرہ لازم ہے وہ قابلِ تسلیم نہ ہو اور اس کا انکار کر دیا جائے کیا ان مقدمات کا صاف اور سادہ نتیجہ یہ نہیں ہے کہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اس عالمِ ہست و بود میں ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جو فیضانِ الہی سے اپنے اندر ایسا جوہر صاف اور فطرتِ عالی رکھتی ہیں جن میں یہ استعداد موجود ہے کہ وہ عالمِ بشریت سے پرواز کر کے عالمِ روحانیات تک پہنچتی اور عالمِ قدس میں ان علوم کا مشاہدہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ سے ان کے لئے عینی شہادت حاصل کر لیتی ہیں عام عقول و فہم جن کا ادراک مکرر سے عاجز و قاصر ہیں یا دلیل و برہان اور ترتیب مقدمات کے بغیر ان کا حصول اُن کے لئے ناممکن ہے اور جو کچھ بڑے بڑے اصحابِ عقل و فکر برسوں کی

محنت درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے حاصل کرتے ہیں یہ ہستیاں "فیضانِ الہی" سے فی البدیہہ اور علی الفور ان کا مشاہدہ اور معائنہ کر لیتی ہیں۔ اور پھر وہ ان علوم و عرفان کو دوسروں کی فلاح و نجات اور اصلاح کے لئے پیش کرتی اور تعلیم و دعوت کے ذریعہ دوسروں تک ان کو پہنچاتی اور ان کے حق ہونے پر یقین دلاتی ہیں اور عقل و فراست اس نتیجہ اور ثمرہ کو بھی کیسے فراموش کر سکتی ہے کہ اس غیر محدود و تفاوت درجات کی موجودگی میں ناموس فطرت اور بقدرت ضروریہ نفسِ عالی کو منتخب و مخصوص کر لے جو ہر زمانہ میں انسانوں کی اجتماعی و انفرادی مصالح عامہ اور فلاح ابدی و سرمدی کے لئے تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیتے رہیں اور جب حضرت انسان "دماغی اور عقلی قوی کے اعتبار سے سن رشد و بلوغت کو پہنچ جائے تو پیغام و دعوت کا یہ سلسلہ بھی ایک ایسی حد پر جا کر ختم ہو جائے جو اپنے اساسی اور بنیادی اصولوں کے اعتبار سے رشد و بلوغت کا حامل ہو اور بنیادی مقاصد میں جس کے بعد کسی مزید دعوت و تبلیغ کی حاجت باقی نہ رہے اور ان کی روشنی میں دینی و دنیوی ترقی غیر محدود و پرکار مہم ہو سکے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ان نفوسِ عالیہ کو اگر ناموسِ فطرت کی جانب سے جو ہر نقی اور فطانت و فراست کی وہ معراج عطا ہوئی ہے کہ جس کی بدولت فیضانِ الہی ان کو بغیر محنت و کاوش کے یقینی علم و عرفان بخشتا اور مہبت کرتا ہے تو اس کے لئے باطن کی یہ روشنی ہی کافی ہوتی ہے اور کسی روحانی شخصیت کا اس کے اور خدائے برتر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا تو اس دعویٰ کے لئے اگر علمی بہانہ و دلیل موجود ہے تو پیش کی جائے ورنہ باسانی یہ کہا سکتا ہے کہ جب علم جدید و قدیم دونوں متفق ہیں کہ اس عالم کیفِ دکم میں ایسے وجود کا پتہ لگتا ہے جو اس مادہ کشف سے بھی زیادہ لطیف جوہر سے بنے اور ہماری ان نگاہوں اور ظاہری حواس سے پوشیدہ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ ان حقائق اقرار آج علمی تجربات کے ذریعہ کیا جا رہا ہے نہ کہ خوش فہمی اور تقلید کی راہ سے تو اس تسلیم کرنے میں کیا علمی قباحت لازم آتی ہے کہ ان ہی لطیف وجودات و حقائق میں سے بعض وہ لطیف وجود بھی ہیں جو علم الہی اور فیضانِ الہی

ان مقدس ہستیوں تک پہنچاتے اور علم و عرفانِ الہی کو ان پر روشنی و تجلی کرتے ہیں نیز نزولِ وحی میں آواز کا مثل یا روح (فرشتہ) کا شکل نہ عقل کے خلاف ہے اور نہ علمی نگاہ میں بے حقیقت یا خرافی ہے کیونکہ وہ جو اہر معقولہ جو مادہ کثیف سے زیادہ لطیف حقیقت رکھتے ہیں اور جن کا ثبوت علمی ذرائع یعنی ثبوتِ ارواح کے عنوان سے حاصل ہو چکا ہے اپنی حقیقت کے ساتھ متشکل و مصور ہو کر ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح ان نفوسِ قدسہ کو نظر آتی اور ان سے خطاب و تکلم کرتی ہیں تو علمی تحقیق کا وہ کونسا گوشہ ہے جو اس کو ناممکن اور غیر معقول قرار دے سکتا ہے؟ اور اس تسلیم میں کونسی علمی قباحت لازم لاتی ہے کہ ان ارواحِ اولہ جو اہر معقولہ کا شکل نفوسِ قدسہ کے ساتھ اس لئے مخصوص ہے کہ ہر قدرت نے ان کے مزاج اور ان کی طبع و فطرت کا ساچمہ دوسرے انسانوں کے مزاج کے مقابلہ میں ایسا مخصوص اور رفیع و بلند بنایا ہے کہ عام انسانی مزاج اس کی رفعت کا ادراک نہیں کر سکتے اور خدائے بخشنده کی کار سازی اس کو صرف نفوسِ قدسہ ہی کے لئے خاص رکھتی ہے۔

یہ جہا بات ہے کہ ایک مادہ پرست کی طبیعت ہی چونکہ ان حقائق کے اعتراف سے انکار کرتی ہے اور وہ اپنے انکار کو علمی دلائل سے ثابت کرنے کی بجائے محض "انکار" ہی کو دلیل بنا لینا چاہتی ہے تو اس تعصبِ بیلے کے سامنے ہر قسم کی دلیل بے سود ہے۔

البتہ یہ کہا جائے گا کہ علم نے ابھی اس حد تک ترقی نہیں کی کہ وہ اس "ذریعہ علم" کی حقیقت کو پاس کے جس کو نفوسِ قدسہ یقین جازم کے ساتھ پالیتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ خدا کی جانب سے ہے اور یہی امتیاز و خصوصیت ان کو رسول، نبی، اور پیغمبر کے القاب سے مشرف کرتے ہیں البتہ بعض ایسے نفوسِ قدسہ بھی ہوتے ہیں جن کے مزاج اور فطرت کی ساخت اگرچہ ان پیغمبروں کے مزاج سے قریب تر ہوتی ہے لیکن باوجود اس کے وہ اس حد کا بل اور مثل اعلیٰ تک نہیں پہنچ پاتے اور ان کے ادراکات عقل و فراست اس سے نازل رہتے ہیں اور تفاوتِ عقل و فطرت کا مزید ثبوت پہنچاتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس

مرتبہ رفیع کی رفعت کے لئے صرف ہی کہا جاسکتا ہے ۵

ایں سعادت در دریا نہ نویسند تانہ بخشہ خدائے بخشندہ

دقوع وحی | اس علمی بحث کے بعد بات اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ اب یہ عوریا جائے کہ بس خاص علم کا نام ”وحی“ ہے کیا علمی و عقلی امکانات کے ساتھ ساتھ اس عالم ہست و بود میں اس کا وجود رہا ہے یا وہ آج بھی موجود ہے تو اس کا جواب ”تاریخ“ سے لینا چاہئے نہ کہ عقلی مباحث سے ”اہیات“ اور ”ما بعد الطبیعہ“ کے مسائل میں علماء عقلیین کی سب سے بڑی گمراہی یہی رہی ہے کہ انھوں نے عالم غیب کے حقائق کے صرف امکانات پر ہی علمی دلائل و براہین کا زور صرف نہیں کیا اور اقرار و انکار میں سے کسی ایک کو دلیل راہ نہیں بنایا بلکہ اس کے وجود کے اثبات و انکار پر بھی نظری دلائل سے کام لینے کی سعی ناکام کی ہے حالانکہ یہ نظری دلائل کی جگہ تاریخی ثبوت و عدم ثبوت کے محتاج ہیں اور اسی لئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ عالم غیب سے متعلق جس مسئلہ پر بحث کی جاتی اول اُس کے امکان پر ہوتی اور اس کے لئے دلائل عقلی و نظری کو راہنما بنایا جاتا اور اگر اس کا امکان ثابت ہو جاتا تو پھر نظر و فکر کے رخ کو نظری دلیل کی جانب نہیں بلکہ تاریخی ثبوت کی جانب پھیر دیا جاتا اور تاریخ سے دریافت کیا جاتا کہ کائنات میں اس مسئلہ کا وجود رہا بھی ہے یا نہیں۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی مسئلہ میں تاریخی ثبوت کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت عقل اپنی دلیل اور اپنے برہان سے تہی دامن ہو کر تاریخی ثبوت کو راہنما بناتی ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ سوال کے حل کے لئے عقلی دلیل، تاریخی ثبوت سے وابستہ ہو کر راہنما بنے گی صرف نظری بحث اس کے حل کیلئے کافی نہیں ہو سکتی پس اس صورت حال کو پیش نظر رکھ کر جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ قرآن کیا ”وحی الہی“ ہے تو تاریخ آگے بڑھ کر پر شوکت الفاظ میں اس سچائی کا اعلان کرتی ہے کہ بلاشبہ قرآن ”الوحی“ ہے اور یہ اس لئے کہ جس مقدس ہستی پر اس کا نزول ہوا ہے ہر ایک مورخ پر تاریخ پر یہ روشن کرتی رہی ہے کہ

وہ ہستی رسمی علوم سے نا آشنا، ہر قسم کے مادی اسباب و وسائل علمی سے محروم، ہر قسم کی علمی سوسائٹی سے بے وسیلہ، وقتی علوم مدونہ سے بوجہ امی ہونے کے ناواقف، مقام پیدائش و تربیت کے لحاظ سے ناسازگار فضا میں تربیت یافتہ، غرض سبہ قسم کے ذرائع علم و اخلاق سے بیگانہ مگر ذاتی اخلاق و کردار کے اعتبار سے اوصاف حمیدہ میں ممتاز، باطنی کمالات و محاسن میں کامل و مکمل انسانی ہستی تھی جس نے عمر کے چالیس سال اپنی قوم کے ہر فرد بشر کے سامنے اسی حال میں گزارے کہ اچانک ایک روز یہ دعویٰ کرتا نظر آتا ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر اور رسول ہے اور ساتھ ہی اپنی قومی زبان میں ایسا پیغام سنانا ہے جو ایمانیات و اعتقادات اعمال و افعال، اخلاق و کردار کے علمی کمالات کا مخزن، دینی، سیاسی، معاشی اور معاوی علوم و عرفان کا معدن، انفرادی و اجتماعی دستور و آئین کا منبع ہے اور نہ صرف یہ کہ اپنے الفاظ و عبارات اور نظم و معانی میں معجز ہے بلکہ وہ پیغام کہ جس کی تعلیم اپنے عالمین حقیقی کے لئے عظیم الشان اور معیر العقول انقلاب و اصلاح کی کھیل اور عروج و اقبال اقوام و اہم کی ضامن ثابت ہوئی اور ثابت رہی ہے۔ غرض اس کے متعلق تاریخ ادیان و ملل کا یہ فیصلہ ہے کہ بلاشبہ یہ پیغام حیات ابدی کھلے لئے سرمایہ نجات اور فلاح و نجات دہی کے لئے ذخیرہ سعادت ہے اور اس کو پیش کرنے والا ان نفوس قدسیہ میں سے ہے جس کی زندگی کا ہر ایک لمحہ ہر قسم کے ردائل سے پاک اور ہر قسم کے فضائل و فواضل سے روشن ہے تو جبکہ وہ اپنی صداقت مآبی اور دوست و دشمن کی جانب سے الصادق الامین کے لقب سے متصف حیات طیبہ کے باوجود یہ دعویٰ کرتا نظر آتا ہے کہ اس کا یہ پیغام اپنا نہیں بلکہ خدا کا پیغام (الوحی) ہے تو اس کے دعویٰ کی تکذیب علم کا کام نہیں جہل کی ڈیوٹی ہے لہذا اس کے پرکھنے اور معیار حقیقت پر کئے والے کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ وہ علمی دلائل سے اس کی صداقت کا امتحان کرے، اسی طرح یہ بھی اس کا فرض ہے کہ وہ تاریخی حقائق کی ترازو میں بھی اس کو تولے اور دونوں طریق امتحان کے بعد فیصلہ کرے کہ قرآن کا یہ دعویٰ کہ وہ ”وحی الہی“ ہے غلط ہے یا صحیح درست ہے یا نادرست۔

پس جو شخص بھی اس صحیح طریق امتحان کو اختیار کرے گا قرآن یقین دلاتا ہے کہ آخر کار اس کو یہ کہنا ہی پڑے گا کہ بلاشبہ قرآن ”الوحی“ ہے۔ چنانچہ سورہ انبیاء میں قرآن نے اس حقیقت کا یوں اعلان کیا ہے۔

قل انا انذرکم بالوحی کہدیکجے! میں جو تم کو ڈراتا ہوں سو ”الوحی“ کے ذریعہ

ولا یسمع الصم الدعاء اور حقیقت یہ ہے کہ سنتے نہیں بہرے پکار کو جب

اذا ما ینذرون۔ کوئی ان کو ڈر کی بات نہ لے۔

اور سورہ طہ میں بھی اس طرح کہا ہے۔

ولا تعجل بالقرآن من قبل اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک

ان یقضی الیک وحیہ۔ پورا نہ ہو چکے تم پر اس کا اترنا۔

القرآن | قرآن عزیز نے اپنی صفات عالیہ اور اوصاف کاملہ کا جس اعجازِ بیان کے ساتھ اظہار کیا،

اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں زیرِ نظر آچکی ہے اور تمام صفاتِ حسنہ کے مجموعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ

یہ کامل و متورِ صداقت، مکمل کتابِ ہدایت، اعلیٰ پیغامِ سعادت اور آخری برہانِ کرامت ہے، یہ نورِ

روشن، روحِ حیات، حق و معطی، ذکر و ذکرِی اور حق و مصدق ہے، آیاتِ بینات ہے، کلامِ الہی ہے،

صراطِ مستقیم ہے، اور مبارک ہے، علی و حکیم ہے، مصدق و ہمین ہے اور حکم و حکمت ہے، تنزیل ہے، ثانی و

دشایہ ہے، احسن الحدیث، حل اللہ اور بشیر و نذیر ہے، عدل ہے، علم ہے اور منادی للایمان ہے اور

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ ”الوحی“ ہے۔

پس جب تم قرآن کے ان صفات کا مطالعہ کرتے اور اس کے نظم و معانی میں ان تمام اوصاف

کی جھلک پاتے یا ان کو منور و روشن دیکھتے ہو تب تمہارا وجدان، تمہارا قلب اور تمہارے شوق و

اشتیاق سے ایک پیاسے کی طرح اس کی تلاوت و قرات کے لئے مضطرب و بے چین ہو جاتی ہے

اور جی چاہتا ہے کہ اس کے اعجازِ بیان اور جلاوتِ نظم پر پروانہ و از شاد ہو جائیں اور بار بار اس کو دہرائیں

اور اس طرح روح کو تازگی اور نور قلب کے لئے بالیدگی کا سامان مہیا کریں۔
 آپ دنیا پر علم کے ہر گوشہ ماضی و حال کی تفتیش کیجئے تو آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائیگی
 کہ اس عالم رنگ دلوں کوئی کتاب، کوئی دستور، اور کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جس کی تلاوت
 قرأت اپنے اندر وہ جاذبیت رکھتی ہو جو قرآن کے ساتھ مخصوص ہے کہ اُس کے معانی اور علوم و معارف
 کے فہم سے نا آشنا ہونے کے باوجود بھی اس کو الف سے یاتک حرف بحرف یاد رکھنے اور پڑھنے والوں کی
 تعداد ہر قرن اور ہر زمانہ میں لاکھوں اور کروڑوں کی رہتی ہے اور یہی وہ شرف ہے جو نظم شیریں سے بھی زیادہ اپنی
 قرأت و تلاوت میں حلاوت و عظمت رکھتی ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن کے دور نزول سے آج تک جس قدر بے شمار حفاظ اس کتاب کے
 حافظ رہے ہیں دنیا اور دین کی کسی کتاب اور کسی تحریر کو اس کا ہزارواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوا اور
 اس کی نمایاں وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے نظم و الفاظ میں حد اعجاز پر ہے جس کا مقابلہ کوئی کتاب نہیں کر سکی
 اور نہیں کر سکتی ہے اس لئے ماضی و حال بلاشبہ مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جب یہ کہتا ہے کہ میں ”القرآن“ ہوں تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے
 کہ وہ بھی دوسری کتابوں اور تحریروں کی طرح پڑھی جاتی ہے اس لئے قرآن ہے بلکہ وہ اس حقیقت
 مسطورہ بالا کو پیش نظر رکھ کر یہ کہتا ہے کہ جبکہ میرے پڑھے جانے اور میرے نظم الفاظ کو دہرائے
 جانے میں بھی دوسری تمام کتابوں اور تحریروں پر خصوصی امتیاز حاصل ہے تو یہ کہنا حق بجانب ہے
 کہ قرأت دراصل میری قرأت ہے اور نہ صرف میرے اوامر و نواہی کے اشتغال سے سعادت کبریٰ
 حاصل ہوتی ہے بلکہ میرے کلام الہی ہونے کی وجہ سے میری قرأت و تلاوت بھی صد ہزار سعادتوں
 کا مجموعہ ہے اور اس لئے میں بلاشبہ ”القرآن“ ہوں۔

اور جبکہ نظم و معانی کے انجام و اعجاز کے ساتھ میرا پیغام تمام کائناتِ انسانی بلکہ ہر ذی روح

کے لئے آخری پیغامِ حیات ہے اور ابدی و سرمدی نجات کا کفیل، حکمت بالغہ کا حامل، عظمت و کرامت کا پیکر، مجد و شرف کا معدن، عزت و غلبہ حق کا مہبط ہے اور اس لئے کتبِ سماویہ میں میرا وجود حیرت و تعجب کا مرکز بن گیا ہے۔ پس اس میں کیا شبہ ہے کہ میں قرآن مجید بھی ہوں اور قرآن کریم بھی، قرآن مبین بھی ہوں اور قرآن حکیم بھی، قرآن عربی بھی ہوں اور قرآن عجب بھی، قرآن عظیم بھی ہوں اور قرآن ذی الذکر بھی۔

اور چونکہ میری صفت قرآن یا القرآن ایک نمایاں صفت ہے اس لئے میری رشد و ہدایت کے پیغام میں جگہ جگہ اس صفت کا کبھی تنہا اور کبھی صفاتِ بالا سے متصف اظہار کیا گیا ہے۔

چنانچہ بقرہ، نساء، مائدہ، انعام، اعراف، یونس، توبہ، نمل، اسراہیل، فرقان، زخرف، حجر، طہ، نمل، قصص، یوسف، احقاف، قمر، رحمن، منزل، دھر، حشر، روم، سبا، حم، ق، ص، رعد، قیامہ، انشقاق میں ایک جگہ یا متعدد جگہ قرآن یا القرآن مذکور ہے اور سورہ بروج میں میل ہو قرآن مجید آیا ہے اور سورہ یسین میں قرآن مبین اور سورہ حجر میں القرآن العظیم اور سورہ یسین میں القرآن الحکیم اور سورہ ص میں القرآن ذی الذکر اور سورہ ق میں القرآن المجید اور سورہ یوسف طہ، شوریٰ، زخرف میں قرآن عربیہ اور سورہ جن میں قرآن عجیب کہا گیا ہے۔

غرض یہ ہیں وہ صفاتِ عالی اور اوصافِ برتر جو مجموعہ کمال کے لحاظ سے قرآنِ عزیز کو مہرِ نظامِ ہائے دنیوی اور دساتیرِ بشری سے ممتاز کرتے ہیں بلکہ تمام کتبِ سماویہ پر فضیلت و برتری ظاہر کرتے ہیں اور کلامِ الہی ہونے کا ثبوت واضح اور بہانِ روشن پیش کرتے ہیں۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ اللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

عدم تشدد اور

حفاظتِ خود اختیاری پر ایک نظر

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈووکیٹ ایسٹ آباد

ایک مدت سے عدم تشدد - - (Non-Violence) کا اصول ہندوستانی سیاست میں ایک مہتمم بالشان مسئلہ بنا ہوا ہے، اور اب تک اس کے حق میں اور اس کے خلاف بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔

اس اصول کا سب سے بڑا حامی اور سب سے زیادہ پرچار کرنے والا ایک ہندو لیڈر ہے۔ اس کے خلاف مسلمانوں کا ایک طبقہ بڑے زور شور سے عدم تشدد کو ایک غیر اسلامی اصول ثابت کرنے میں مصروف ہے چنانچہ عوام عام طور سے اہنسا کو غیر اسلامی چیز سمجھنے لگ گئے ہیں۔

اس مضمون میں عدم تشدد کے متعلق خالص اسلامی نقطہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسلام میں عدم تشدد کی کوئی جگہ ہے یا مطلق نہیں اور یہ اصول کسی رنگ میں بھی اسلامی اصول کہا جاسکتا ہے یا نہیں۔ مختصر الفاظ میں عدم تشدد سے یہ مراد ہے کہ تشدد نہ کیا جائے۔ اگر کوئی آدمی تشدد کرے تو اس کے مقابلے میں صبر برداشت اور عفو سے کام لیا جائے۔ تشدد دو قسم کا ہوتا ہے، ایک تشددِ قلبی، یعنی کسی کو برا بھلا کہنا، گالی دینا، توہین کرنا، غیبت کرنا وغیرہ وغیرہ، دوسرا تشددِ فعلی، یعنی کسی کو جسمانی ضرر پہنچانا۔

ہر شریعت میں اور ہر ملکی قانون میں تشدد کے مقابلے میں تشدد کے استعمال کرنے کا جواز موجود ہے۔ جو اپنی تشدد کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) تشدد کرنے والے کے خلاف قانونی عدالت تشدد کا حکم دے۔ یعنی مجرم کو قتل کرنے۔
جسمانی سزا دینے، جلا وطن کرنے، قید کرنے یا جرمانہ کرنے کے احکام صادر کرے۔

(۲) اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لئے یا کسی دوسرے شخص کی جان اور مال کی حفاظت کے لئے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ تشدد کرنے والے کے مقابلے میں تشدد کا استعمال کرے۔ اس حق کو قانونی اصطلاح میں حق حفاظت خود اختیاری کہتے ہیں۔

اس مضمون کا اہل مدعا تو صرف اُس تشدد اور عدم تشدد کا بیان کرنا ہے جو حفاظت خود اختیاری میں استعمال ہوتا ہے لیکن چونکہ تشدد بحکم عدالت اور تشدد بمراد حفاظت کے مباحث ایک حد تک ہم وابستہ ہیں۔ اس لئے فہم مطالب کے لئے ضروری ہے کہ تشدد بحکم عدالت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہر شریعت میں جو اپنی تشدد کا جواز موجود ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں بھی جہاں بروئے دھرم شاستر پر عقیدہ ہے کہ کسی صورت میں بھی کسی ذرورج کو قتل کرنا جائز نہیں۔ وہاں بروئے ارتھ شاستر آتمائی کو قتل کرنا جائز ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں چھ قسم کے لوگوں کو آتمائی کہا جاتا ہے۔

(۱) وہ شخص جو کسی کے گھر کو آگ لگانے آیا ہو۔

(۲) وہ شخص جو زہر خود اپنی کامر تکب ہو۔

(۳) وہ شخص جو مسلح ہو کر کسی کو قتل کرنے آئے۔

(۴) وہ شخص جو کسی کی دولت یا

(۵) عورت یا

(۶) زمین چھین لے۔

منوکا قول ہے کہ آتہ تائی کو قتل کرنا گناہ نہیں۔ ایسے شخص کو بے تردد قتل کر دینا چاہئے۔ ہندو قانون میں اس سے کم درجے کے تشدد کے جواب میں کم درجے کے تشدد کا استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

شریعت موسوی میں تشدد بجاؤ تشدد کے احکام جو موجودہ کتاب مقدس میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں۔
”جو کوئی کسی مرد کو مارے اور وہ مر جائے تو وہ البتہ قتل کیا جائے“ پرانا عہد نامہ کتاب الخروج باب ۲۱۔ آیت ۱۲۔

”اور جو آدمی کو چڑا لے جائے اور اسے بیچ ڈالے یا وہ اس کے پاس سے پکڑا جائے تو وہ البتہ مار ڈالا جائے گا“ کتاب و باب مذکور آیت ۱۶۔

”... اور اگر وہ اس صدمے سے ہلاک ہو جائے تو تو جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ“ کتاب باب مذکور آیات ۲۳ تا ۲۵۔

”اور وہ جو انسان کو مار ڈالے سو مار ڈالا جائے گا... اور اگر کوئی اپنے ہمسائے کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا ہی پائے گا۔ توڑنے کے بدلے توڑنا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ دانت کے بدلے دانت، جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اس کو ویسا ہی کیا جائے“ پرانا عہد نامہ۔ کتاب اجار۔ باب ۲۴ آیات ۱۷-۱۹-۲۰۔

”تو تم اس سے وہ سلوک کیجو جو اس نے چاہا تھا کہ اپنے بھائی سے کرے۔ تو اس طرح برائی کو اپنے درمیان سے دفع کیجو۔ تاکہ باقی لوگ سنیں اور دہشت کھائیں اور آگے کو تمہارے درمیان ایسی شرارت پھرنے کریں اور تیری آنکھ مروت نہ کرے کہ جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، دانت کا بدلہ دانت، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں ہوگا“ پرانا عہد نامہ کتاب استثنا۔ باب ۱۹ آیات ۱۹ تا ۲۱

توریت کی مندرجہ بالا آیات سے تشددِ جوابِ تشدد کی اجازت بلکہ ضرورت ثابت ہوتی ہے فی الواقعہ جوابی تشدد ضروری ہے کیونکہ یہ اور لوگوں کے لئے درسِ عبرت ثابت ہوتا ہے۔ اگر ظالم کے لئے کوئی سزا مقرر نہ ہو تو ظلم کے عام ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پرانے عہد نامے کی یہ آیات گو لفظاً جوابی تشددِ حکمِ عدالت کے متعلق ہیں، لیکن معنائ ان کے اصول تشددِ بحفاظتِ خود اختیار پر بھی حاوی ہیں، اپنی جان اور اپنے مال یا کسی دوسرے کی جان اور اس کے مال کی حفاظت میں تشدد کا استعمال کرنا انسان کا فطری حق معلوم ہوتا ہے۔

آئیے اب جوابی تشدد کی اجازت اور ضرورت کے متعلق قرآنی آیات کی روشنی سے چشمِ بصیرت کو روشن کرنے کی سعی کریں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا آتِ النَّفْسِ
بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ
بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ
وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصَ
فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارًا ۗ لَهُ
وَمَنْ كَفَرَ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ
(۵-۲۵)

اور فرض کیا ہم نے اُن پر اُس (کتاب یعنی تورات) میں کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان و السِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصَ اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارًا ۗ اسیا ہی زخم، اور جو کوئی بخشن دے اسے، پس وہ وَمَنْ كَفَرَ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ کفارہ اس کے لئے اور جو کوئی حکم نہ کرے فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ اس چیز کے مطابق جو اللہ نے بتا دی تو ایسے لوگ ظالم ہیں۔

اس بارے میں توریت کی آیات آپ اوپر پڑھ چکے۔ اس آیتِ قرآنی میں انہی احکام کو دوبارہ بیان کیا گیا ہے۔ اکثر علمائے اسلام اس طرف گئے ہیں کہ تورات کے یہ احکام جنہیں قرآن مجید نے بھی بیان کیا ہے ہمارے لئے بھی بمنزلہ قانون ہیں کیونکہ قرآن نے انہیں صراحت سے منسوخ نہیں کیا۔ لیکن بعض

علماء کہتے ہیں کہ یہ آیت قرآنی صرف پرانے قانون کی خبر دیتی ہے۔ ہمارے لئے یہ احکام قانون نہیں ہیں بہر حال اس مضمون میں اس اختلافِ رائے کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں غور کے قابل یہ بات ہے کہ جہاں تورات میں یہ لکھا ہے کہ تیری آنکھ مروت نہ کرے کہ جان کا بدلہ جان آنکھ کا بدلہ آنکھ، دانت کا بدلہ دانت، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں گا۔ وہاں قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ جو کوئی بخشدے اسے، پس وہ کفارہ ہے اس کے لئے، یعنی اگر مقتول کے وارث قاتل کو اور مجروح زخم پہنچانے والے کو معاف کر دے تو اس معافی کے بدلے اللہ تعالیٰ ورثا اور مجروح کے گناہ معاف کر دیگا۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ قاتل پر تین قسم کے حق ہیں ایک اللہ تعالیٰ کا حق۔ دوسرا مقتول کا حق، اور تیسرا ورثائے مقتول کا حق۔ پس جب قاتل نادم ہوا اور خدا کے ڈر سے تائب ہو کر اس نے اپنے آپ کو ورثائے مقتول کے سپرد کر دیا (تاکہ اگر وہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں) تو اس طرح اللہ تعالیٰ کا حق ساقط ہو گیا اور صلح و معافی سے حق ورثا ساقط ہو گیا۔ باقی رہا مقتول کا حق تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بمقتول سے مقتول کو معاوضہ دلا دے گا۔ (یعنی قاتل کے بعض نیک کاموں کا اجر مقتول کو دیدیگا یا مقتول کے چند بُرے کاموں کی سزا قاتل کو دیدیے گا) اور اس طرح قاتل و مقتول میں صلح کرادے گا۔

پس قرآن مجید کی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر قسم کے تشدد کے بدلے میں اسی قسم کا تشدد جائز ہے بلکہ فرض ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی اجازت دی ہے کہ مظلوم ظالم کو معاف بھی کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ قاتل کو بھی مقتول کے ورثا معاف کر سکتے ہیں۔ یہ حکم جوابی تشدد بحکم عدالت اور جوابی تشدد بحفاظتِ خود اختیار دونوں صورتوں پر حاوی ہے۔ پس یہ ایک صورت ہے عدم تشدد یا ہنساکی۔ اس بارے میں قرآن مجید کا ایک اور مقام بھی غور کے قابل ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْكُتِبَ عَلَيْكُمُ

الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ، الْحَرْبِ بِالْحَرْبِ کے بارے میں۔ آزاد ہو تو آزاد اور غلام ہو تو غلام

وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ اور عورت ہو تو عورت اور جس (قاتل) کو اپنے
 فَمَنْ عَفَىٰ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ بھائی (فریق ثانی) کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے
 فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ تَوْعَقُولٌ طور سے مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ
 بِإِحْسَانٍ - ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ اس کو ادا کر دینا۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے
 وَرَحْمَةٌ - فَمَنْ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ تخفیف ہے اور رحم۔ پس جس شخص نے اس کے
 فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ - وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ بعد تعدی کی اس کے لئے دردناک عذاب ہے
 حَيَوةٌ يَّأُولِی الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ اور اے عقلمند لوگو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی
 تَتَّقُونَ - (۱-۱۷۸-۱۷۹) ہے تاکہ تم لوگ پرہیز کرو۔

قصاص سے مراد ہے تشدد و بجواب تشدد۔ بدلہ لینا، قاتل کو قتل کے جرم کی سزا میں قتل کرنا یا زخم پہنچانے
 والے کو بدلے میں اسی طرح کا زخم پہنچانا قصاص ہے۔ ان آیات کی رو سے قصاص لازم ہے لیکن ساتھ ہی
 یہ بھی اجازت ہے کہ اگر مقتول کے ورثہ قاتل کو یا مضروب غارب کو معاف کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ یاد رہے
 کہ قتل کی سزا صرف قتل عمد کی صورت میں ہوتی ہے ورثہ مقتول اگر قتل کی سزا معاف کر کے خون بہا
 لینا چاہیں تو چاہئے کہ وہ مناسب طور سے مطالبہ کریں اور ملزم کو چاہئے کہ وہ خون بہا بطیب خاطر ادا
 کر دے۔ قصاص کو فرض بتا کر اللہ تعالیٰ نے معافی کی اجازت بھی دیدی۔ یہ اُس کی طرف سے اپنے
 بندوں پر فضل و کرم ہے۔ تخفیف ہے اور رحمت ہے۔

ان آیات میں قصاص کے فرض ہونے کی حکمت بھی بتادی اور کہا کہ قصاص میں تمہاری زندگی بچ
 فی الواقعہ اگر تشدد کے بدلے میں تشدد نہ ہو تو تشدد عام ہو جائے اور آدمی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔
 تورات میں بھی قصاص کے فرض ہونے کی بجائے ہی وجہ لکھی ہے تو اس طرح برائی کو اپنے درمیان سے دفع
 کیجیو تاکہ باقی لوگ نین اور دہشت کھائیں اور آگے کو تمہارے درمیان ایسی شرارت پھر نہ کریں

لیکن جہاں قصاص میں حکمت ہے۔ وہاں معافی میں بھی ایک حکمت پنہاں ہے جو آگے چل کر بیان ہوگی۔ پس ان آیات میں بھی عدم تشدد کی ایک صورت بیان ہوئی۔

الحرب بالکفر والعبد بالعبد والانتی بالانتی کے متعلق مفسرین اور فقہاء کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ بعض مفسر کچھ لکھتے ہیں اور بعض کچھ۔ بعض فقہاء کی ایک رائے ہے بعض کی کچھ اور لیکن یہاں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ اگر کسی کمزور قوم کا کوئی غلام کسی بڑی قوم کے آدمی کو قتل کر دیتا تو اصل قاتل کی جگہ کمزور قوم کے کسی آزاد آدمی کو بدلے میں قتل کر دیتے اسی طرح عورت قاتل کی بجائے اس کی قوم کے کسی مرد کو قتل کر دیتے۔ اس کے برعکس اگر کمزور قوم کے کسی آدمی کو طاقتور قوم کا کوئی آزاد مرد قتل کر دیتا تو اس آزاد کی جگہ کسی غلام کو قتل کر دیتے۔ اسی طرح کی اور نامعقول اور نامنصفانہ رسمیں بھی عرب میں جاری تھیں۔ قرآن مجید نے ان یہودہ رسموں کو ختم کرنے کا حکم دیا۔ اس لئے قرآن مجید کے ان الفاظ کا یہی ترجمہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر قاتل آزاد ہو تو اسی آزاد کو قتل کرو، قاتل غلام ہو تو اسی غلام کو قتل کرو اور اگر قاتل عورت ہو تو اسی عورت کو قتل کرو اب جوابی تشدد کے متعلق موجودہ انجیل کے احکام پر غور کیجئے۔

”تم سن چکے ہو کہ کہا گیا آئنگھ کے بدلے آئنگھ اور دانت کے بدلے دانت۔ پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرو بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی چاہے کہ تجھ پر نالش کرے تیری قبائلی گرتے کو بھی اُسے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیکار لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا، جو کوئی تجھ سے لچہ مانگے اُسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑے۔“

”تم سن چکے ہو کہ کہا گیا اپنے پڑوسی سے دوستی رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو اور جو تم پر لعنت کریں اُن کے لئے برکت چاہو جو تم پر

کینہ رکھیں ان کا بھلا کرو اور جو تمہیں دکھ دیں اور ستائیں ان کے لئے دعا مانگو، تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے فرزند ہو۔ کیونکہ وہ اپنے سہج کو بدوں اور نیکیوں پر لگا رہا ہے اور راستوں اور ناراستوں پر مینہ برساتا ہے کیونکہ اگر تم انہیں کو پیار کرو جو تمہیں پیار کرتے ہیں تو تمہارے لئے کیا اجر ہے؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟ اور اگر تم فقط اپنے بھائیوں کو سلام کرو تو کیا زیادہ کیا؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟ پس تم کامل ہو جیسا تمہارا باپ جو آسمان پر ہے کامل ہے۔" نیا عہد نامہ۔ متی کی انجیل۔ باب ۲۸ آیت ۳۸ تا ۴۱

تشدد بجا جواب تشدد کے متعلق آپ توریت، انجیل اور قرآن مجید کے احکام پڑھ چکے اب آپ ان پر غور کریں اور ان کا آپس میں مقابلہ کریں۔

(۱) تورات جو مذکورہ تینوں کتابوں میں سب سے پہلے کی ہے تشدد کے جواب میں تشدد کو لازم قرار دیتی ہے اور ساتھ ہی حکم کرتی ہے کہ تیری آنکھ مروت نہ کرے اور ظالم کو معافی نہ دے۔

(۲) انجیل تورات کے بعد کی کتاب ہے۔ اس میں تشدد بجا جواب تشدد سے بالکل منع کیا گیا ہے اور ہر صورت میں عفو سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے یعنی کئی عدم تشدد کی تعلیم ہے۔

مشہور و معروف کتاب پرنس کے مصنف میکا ویلی کے مندرجہ ذیل خیالات گویا انجیل کی اس تعلیم پر ایک تنقید ہے۔

• میکا ویلی کیننگلی کمزوری اور بزدلی پر حملہ کرتا ہے اور اپنے معاصرین پر انہی کمزوریوں کا الزام

لگاتا ہے جیسا کہ اس کی تاریخ فلائرس سے معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ یہ سوال کرتا ہے کہ ان

اپنی قدیم عظمت سے کیوں گر گئے ہیں تو اس کو اس کی وجہ ان کی تعلیم نظر آتی ہے۔ جس کے

اثرات نے ان کو اپاہج اور مایوس کر دیا ہے اور اس تعلیم کا سب سے بڑا تعلق مذہب سے ہے

قدار آبرو، عزت نفس، قوت اور صحت جسم کو پسند کرتے تھے اور قدیم مذاہب ان فانی

لوگوں کو جو پہ سالار، بہادر اور مقنن ہونے کی وجہ سے شہرت حاصل کرتے تھے، الوہیت کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ ان کے مذہبی رسوم شاندار ہوتے تھے۔ اور ان میں اکثر خونی قربانیاں ہوتی تھیں جو لازماً لوگوں کے دلوں میں تندی اور درشتی کا میلان پیدا کرتی ہوں گی۔

”برخلاف اس کے ہمارا مذہب مقصد اعلیٰ کو دوسرے عالم میں جا رکھتا ہے اور اس دنیا کی آرزو کو نظرِ تحقیر سے دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے وہ عجز و تواضع، ایثارِ نفس کو بڑی شاندار نیکیاں سمجھتا ہے اور فکر و مراقبہ کی خاموش زندگی کو خارجی امور کی عملی زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر وہ ہم سے قوت کا بھی طالب ہوتا ہے تو قوتِ فعل کا نہیں بلکہ قوتِ برداشت کا۔ اس اخلاق نے انسانوں کو کمزور کر دیا ہے اور دنیا کو بے دھڑک اور شدت پسند آدمیوں کے سپرد کر دیا ہے جن کو یہ معلوم ہو گیا کہ اکثر لوگ بہشت کی امید میں بہ نسبت بدلہ لینے کے برداشت کرنے پر زیادہ مائل ہیں۔ یکساں دلی ساتھ ہی کہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ انسانی بزدلی عیسائیت کی غلط تاویل سے پیدا ہوئی ہے لیکن ان الفاظ سے اُس کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ وہ عیسائی اخلاق اور قدیم اخلاق کے تمام مخالف کو واپس لیتا ہے اور اس کا خود جس طرف میلان ہے وہ ظاہر ہے۔“ ۱۷

(۳) قرآن مجید جو سب سے بعد کی کتاب ہے تشدد کے جواب میں تشدد کو لازم قرار دیتی ہے لیکن ساتھ ہی عفو کی اجازت بھی دیتی ہے۔

گویا پہلی کتاب میں قصاص ہے اور عفو نہیں۔ دوسری کتاب میں عفو ہے قصاص نہیں۔ تیسری کتاب میں قصاص بھی ہے اور عفو بھی۔ تورات کی تعلیم ایک انتہا پر تھی انجیل کی تعلیم دوسری انتہا پر۔ اور قرآن مجید کی تعلیم خیر الامور اور وسطیہ کا ایک روشن نمونہ۔ تورات کے احکام عوام کا دستور العمل بن سکتے ہیں۔

۱۷ تاریخ فلسفہ جدید، جلد اول، مصنفہ ڈاکٹر ہیرلڈ ہونڈنگ، ترجمہ اردو از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ص ۲۷ - ۲۸۔

انجیل کے احکام خواص بلکہ انسانِ کامل کا معمول ہو سکتے ہیں اور قرآن مجید کے احکام ہر خاص و عام کے لئے شیعہ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ ہم ان کتابوں کے احکام پر جتنا گہرا غور کرتے جائیں گے قرآن مجید پر ہمارا ایمان اتنا ہی زیادہ مضبوط ہوتا جائے گا۔

نوعِ انسانی کی تاریخ میں اہلسا کے اصول پر عمل پیرا ہونے کا سب سے پہلا واقعہ خود حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی میں ہی پیش آیا۔

وَإِلَّ عَلَيْهِمْ نَبَا ابْنِ آدَمَ بِالْحَقِّ ۖ أَوْسَانُ كَوَالِ آدَمَ كَ دَوِیُّوْنَ كَا سِیَا ۖ جِکَ
 إِذْ قَرَأَ بَاقِرُ بَانَآ فَتَقَبَّلَ مِنْ أَحَدَہَا ۚ دَوْنُوْنَ لَے قَرْبَانِی کِی ۖ پَسِ قَبُولِ ہُوئی اِیکِ کِی اِن
 وَلَمْ یَتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ۚ قَالَ ۖ مِی سَے اَدْرَے قَبُولِ ہُوئی دَوسرے کِی ۖ اِن لَے کِہَا
 اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۖ مِی تَحْجَے ضَرُورَ قَتْلِ کَرُوْں کَا اِس لَے جَوَابِ دِیَا کَہ اَنّہ
 لَیْنُ بَسَطْتَ اِلَیَّ یَدَکَ ۖ نُو پَر مِی زَکَا رُوْں ہِی سَے قَبُولِ کَر تَا ہِے اَکَر تُو بڑھَا مِی گَا
 لِمَقْتُلَیْ مَا اَنَا بِبَاسِطِ یَدِی ۖ مِی رِی طَرَفِ اِپِنَا ہَا تَہَ مَچْجَے قَتْلِ کَر نَے کُو تُو مِی نَہِی
 اِلَیْکَ لَا قَتْلَکَ ۖ اِنِّیْ اَخَافُ ۖ بڑھَاوْں کَا اِپِنَا ہَا تَہَ تِی رِی طَرَفِ تَحْجَے قَتْلِ کَر نَے کُو ۖ
 اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ۖ اِنِّیْ اُرِیدُ ۖ مِی تُو ڈَر تَا ہُوْں اَنّہ سَے جُو سَا رَے جِہَا نُوْں کَا پَر وَر کَا
 اَنْ تَبُوْا بِدِیْنِیْ وَلَا تُمِیْکَ ۖ ہِے مِی تُو یَہ چَا ہِتا ہُوْں کَہ تُو اُٹھَا لَے مِی رَا گَنَا ہِے اُو
 فَتَکُوْنُ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ ۖ اِپِنَا گَنَا ہِے مِی تُو ہُو جَا اِہْلِ دَوْر خِ مِی سَے اُو رِ
 وَذٰلِکَ جَزَاؤُ الظّٰلِمِیْنَ ۖ ۖ ہِی ہِے سُرْطَا لُوْں کِی ۖ بَچَہ آ مَادَہ کَر دِیَا اُسَے اِس
 فَطَوَعَتْ لَہُ نَفْسُہُ قَتْلَ اَخِیْہِ ۖ کَے نَفْسِ لَے اِپِنَے بَھَا ئِی کَے قَتْلِ کَر نَے پَر پَسِ اُسَے
 فَقَتَلَتْہَا صَبَحَ مِنْ الْخَیْرِیْنَ ۖ قَتْلِ کَر ڈَا لَا اُو رِ ہُو گِیَا خَا رَہ اُٹھَا نَے وَا لُوْں سَے ۖ

(۵ - ۲۷ تا ۳۰)

یہ قصہ ہے آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا۔ ان دونوں نے قربانی کی۔ ہابیل کی قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی اور قابیل کی قربانی کو قبول نہ کیا۔ اس پر قابیل کا رشک حد میں تبدیل ہو گیا اور حسد دشمنی میں۔ قابیل نے ہابیل کو کہا کہ میں تجھے ضرور قتل کروں گا۔ ہابیل نے جواب دیا کہ اس میں میرا قصور نہیں۔ اللہ تعالیٰ صرف پرہیزگاروں کی قربانی قبول کرتا ہے اور اگر تو خواہ مخواہ مجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں جواب میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ کیونکہ میں خدا سے ڈرتا ہوں تجھ پر ہاتھ اٹھانے کی بجائے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اگر تو مجھے قتل کرے تو مجھ مظلوم کے گناہ بھی تیرے سر پر پڑیں اور تیرے اپنے گناہ بھی اور تو اس جرم کی پاداش میں دوزخ میں جائے کیونکہ ظالموں کی سزا یہی ہے اس پر قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔

ظاہر ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے حملہ آور پر حملہ کرنا اور تشدد کے جواب میں تشدد کا استعمال کرنا نہ صرف شریعت اور قانون میں جائز ہے بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یقیناً ہابیل کو حفاظت خود اختیاری کا حق حاصل ہو چکا تھا لیکن اُس نے اس حق کو استعمال کرنے اور قابیل کے تشدد کے جواب میں تشدد کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنسا کے اصول پر کاربند ہو کر مظلومانہ شہادت کو تشدد بہ ترجیح دی۔

اس میں شک نہیں کہ ہابیل کا یہ طرز عمل جو آیات بالا میں مذکور ہوا۔ خود ہابیل کا اپنا طرز عمل تھا۔ خدا کا حکم نہ تھا۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ یہ طرز عمل جس انداز سے قرآن مجید میں بیان ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہابیل کا یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کو منظور و مقبول تھا۔

ہابیل نے یہ جو کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ بھی اٹھالے، اس پر بعض اصحاب کو یہ تردد ہوا کہ ایک کا بوجھ دوسرا کیوں اٹھائے گا اور ایک کے گناہ کا بار دوسرے کے سر پر کیونکر پڑے گا۔ اس لئے انھوں نے باقی کا ترجمہ کیا ”میرے قتل کا گناہ“ یعنی تو اپنے اور گناہ بھی اٹھائے اور مجھے قتل کرنے کا

گناہ بھی۔ لیکن بائمی کا یہ ترجمہ محض سینہ زوری ہے۔ مظلوم کے گناہوں کا بار ظالم کے سر پر کس طرح پڑے اس سوال کا جواب بخاری کی ایک حدیث میں موجود ہے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ
 قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ فرمایا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے
 من کانت لمظلمۃ لائحہ من اپنے بھائی کی آبرو یا کسی اور چیز کے متعلق ظلم کیا ہو
 عرضا وشیء فلیستحللہ منہ اُسے چاہیے کہ آج اس سے معاف کرالے قبل اس کے
 الیوم قبل ان لا یكون دینا سُر کہ (بروز قیامت) نہ دم رہے نہ دینار۔ اس وقت
 ولا درہم۔ ان کان لہ عمل اگر اس (ظالم) کا کوئی عمل صالح ہوگا تو اس میں سے
 صالح اُخذ منہ بقدر مظلمتہ بقدر اس کے ظلم کے لے لیا جائیگا (اور مظلوم کو دیدیا
 وان لم تکن لہ حسنات اُخذ جائے گا) اور اگر اس (ظالم) کے پاس نیکیاں نہ
 من سیئات صاحبہ فحمل ہوں گی تو اس کے (مظلوم) ساتھی کی بدیاں
 علیہ۔ لیکر اس (ظالم) پر لاد دی جائیں گی۔

قرآن مجید میں اکثر مقامات پر قصاص اور عفو یعنی جوابی تشدد اور عدم تشدد کا یکجا ذکر ہوا ہے اور جوابی تشدد کا جواز اور عدم تشدد کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ اور وہ لوگ کہ جب ہوتا ہے اُن پر ظلم تو وہ بدلہ لیتے
 وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ ہیں اور بدلہ بُرائی کا ہے بُرائی ویسی ہی۔ پس
 عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ اِنَّہ جس نے معاف کر دیا اور صلح کر لی سو اس کا اجر ہے
 لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ اللہ کے ذمے بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔
 بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ اور جس نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ اس پر ظلم ہوا ہو

مِنْ سَبِيلٍ ۚ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ
يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ
وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ
لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (۲۲-۲۳ تا ۲۴) بلند ہمتی کا کام ہے۔

ان آیات سے پہلے کی آیات میں اچھے لوگوں کا ذکر تھا۔ انہی اچھے لوگوں میں وہ لوگ بھی مذکور ہوئے
جو ظلم کا بدلہ لیتے ہیں چند اہم باتیں جو ان آیات سے ثابت ہوتی ہیں یہ ہیں۔

(۱) مظلوم کی طرف سے جوابی تشدد ظالم کے تشدد سے زیادہ یا بدتر نوعیت کا نہیں ہونا چاہئے
حق حفاظت خود اختیاری کے موجودہ ملکی قانون میں بھی یہ شرط موجود ہے کہ جوابی تشدد ضرورت کے زیادہ نہ ہو
(۲) جوابی تشدد کے استعمال کرنے والے پر کوئی الزام نہیں اور نہ ایسا تشدد جرم کی تعریف میں آتا ہے
(۳) الزام صرف اس شخص پر ہے جو تشدد میں ابتدا کرتا ہے یا اس شخص پر جو جوابی تشدد میں مقررہ ہا
حدود سے گزر جاتا ہے۔

(۴) جو شخص ظالم کے تشدد کے جواب میں تشدد نہ کرے بلکہ اسے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ
اُسے اس صبر کا اجر عطا کرے گا۔

(۵) تشدد کے مقابلے میں صبر اور عفو سے کام لینا بڑی بلند ہمتی کا کام ہے اور بڑا قابل
ستائش کام۔

پس ان آیات سے جوابی تشدد کی اجازت اور عدم تشدد کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بیان میں
حسن بصری رحمت اللہ علیہ سے نقل ہے کہ قیامت کے دن ندا ہوگی کہ جس شخص کا خدا کے ذمے کوئی اجر ہے وہ اٹھے اور لے
اس ندا کے جواب میں کوئی شخص نہ اٹھے گا سوائے اس کے جس نے کسی ظلم کو معاف کیا ہوگا (بحوالہ تفسیر حسینی)

عفو از گناہ سیرت اہل فتوت است بے علم و عفو کا رفتوت تمام نیست
 بگذر ز جورِ خصم و کرم کن کہ عاقبت در عفو لذتے ست کہ در انتقام نیست
 قرآن مجید نے انجیل کی طرح قصاص کو ناجائز نہیں ٹھیرایا کیونکہ انسانی طبائع مختلف
 ہیں نہ ہر شخص اتنا بلند ہمت ہے کہ وہ ہر تشدد کو معاف کر سکے اور نہ ہر ظالم اس کا مستحق ہے کہ اسے
 معاف کر دیا جائے۔ بقول سعدی

بگفتیم در باب احساں بے لیکن نبایست با ہر کے
 يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا
 وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا - وَدَاعِيًا إِلَىٰ
 اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَبِرَاجٍ مُّثِيرًا - وَبَشِيرِ
 الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا -
 كَثِيرًا - وَلَا تَطِعِ الْمُكَفِّرِينَ وَالْمُنْفِقِينَ -
 وَادْعُهُمْ إِلَىٰ كُلِّ عَلَىٰ اللَّهِ - وَ
 كَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (۳۲-۳۵ تا ۳۸)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلایا ہے کہ آپ نبی ہیں، بشیر ہیں،
 نذیر ہیں، داعی الی اللہ ہیں اور اہل عالم کے لئے روشن چراغ۔ اس لئے لوگوں کو اپنا پیغام سناتے جائیے۔ کفار کو
 عذابِ آخرت سے ڈراتے جائیے، ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی خوشخبری دیتے جائیے، دنیا
 میں نورِ ہدایت کی روشنی پھیلاتے جائیے۔ کافروں اور منافقوں کی باتوں میں آئیے اور نہ ان کی ایذا رسانی کی
 پرواہ کیجئے۔ اللہ کا راز ہے اور آخر کار آپ کی کار سازی کیسے گا اور آپ کو کامیاب بنائے گا۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی ایذا رسانی کے مقابلے میں صبر برداشت اور توکل

اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَ
بِالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ
أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْهُ
سَبِيلُهُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ
فَعَاكِزَاتٍ مَثَلٍ فَاعُوْهُنَّ فَإِنَّ صَبْرَكُمْ
لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ (۱۲۶ و ۱۲۵ و ۱۲۴)

ان آیات میں جوابی تشدد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم تشدد کرو تو بس اتنا ہی جتنا تم پر کیا گیا ہو اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ تم تشدد کے جواب میں تشدد نہ کرو۔ بلکہ صبر اور برداشت سے کام لو۔ جی چاہتا ہے کہ ان آیات کے نیچے مولانا ابوالکلام آزاد نے جو نوٹ لکھا ہے نقل کر دوں تاکہ میری روٹی پھسکی عبارت کے صحرا میں ان کا ادیبانہ اسلوب بیان ایک سرسبز نخلستان کا کام دے جائے۔

کتنی ہی پہلے بصیغہ امر دعوت کا حکم دیا گیا تھا، اُدْعُ اِلٰی سَبِيلِ رَبِّكَ "پس چاہئے تھا کہ یہاں بھی

بدلہ لینے کا حکم دیا جاتا کہ اگر تمہارے ساتھ سختی کی گئی ہو تو تم بھی ویسی ہی سختی کرو۔ مگر نہیں ایسا

نہیں فرمایا بلکہ کہا: "وَإِنْ عَاقَبْتُمْ" اگر ایسا ہو کہ تم مخالف کی سختی کے جواب میں سختی کرنا چاہو تو

چاہئے کہ حد سے بڑھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سختی کے جواب میں سختی کا حکم نہیں ہر محض اجازت ہے

یعنی اگر ایک آدمی وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا جو اس بارے میں بہتری اور خوبی کا مقام ہے۔ جھیل جانا اور بخش دینا۔ تو پھر اُسے بدلے کی اجازت دیدی گئی ہے لیکن اجازت کو ”بشل ما عوقبتم“ سے مقید کر دیا، تاکہ زیادتی کا دروازہ کبھی بند نہ ہو جائے۔ اب دوسری راہیں کھلی رہ گئیں عزیمت تو اس میں ہوئی کہ جھیل جاؤ اور بخش دو۔ رخصت اس کی ہوئی کہ جتنی سختی کی گئی ہے۔ اتنی ہی تم بھی کر لو۔ اس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتے۔“

”اس آیت کی تفسیر میں امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک تقریر بہت مقبول ہوئی ہے جو انھوں نے ”قطاس المستقیم“ میں لکھی ہے اور بعد کے مفسرین نے عموماً اسے اختیار کر لیا ہے وہ کہتے ہیں استعداد و فہم کے لحاظ سے ہر انسان کی طبیعت یکساں نہیں۔ اور ہر ذہنی حالت ایک خاص طرح کا اسلوب خطاب چاہتی ہے۔ ارباب دانش کیلئے استدلال کی ضرورت ہوتی ہے عوام کے لئے موعظت کی اور اصحابِ خصومت کے لئے جدل کی پس اس آیت میں قرآن نے تینوں جماعتوں کے لئے یہ تینوں طریقے بتلا دیئے ہیں۔ ارباب دانش کو حکمت کے ساتھ مخاطب کرو، عوام کو موعظت کے ساتھ۔ اور ارباب خصومت کے لئے جدل کی بھی اجازت ہے مگر بطریق احسن“ (ترجمان القرآن ص ۳۴۵)

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّدُّكُمْ اَكْثَرُ اِلٰى كِتَابٍ جَاهِتُمْ فِيْهِ وَهُمْ يَمُودُوْنَ
مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُنَّا اِلَآءًا حَسَدًا اِيْمَانُ لَّائِي سَجَّجَ كَا فِرُوْنَ فِيْ بُوْجِهٍ حَسَدٍ
مِنْۢ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاَعْفُواْ وَاصْفَحُواْ
حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِہٖۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰیۤ اٰمَارَاتِہٖۚ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (۲-۱۰۹) اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسلام کی ابتدائی دور کی تاریخ شاہد ہے کہ مکہ معظمہ کے اہل کتاب کا فرامحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان مٹھی بھر لوگوں پر جو ایمان لے آئے۔ طرح طرح کے تشدد اور ظلم کرتے تھے تاکہ انھیں تنگ کر کے پھر کافر بنا دیں۔ یہ اللہ کے بندے رنگارنگ مصیبتیں اور اذیتیں جھیلے رہے مگر ہاتھ نہ اٹھایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ ”جھیل جاؤ اور بخش دو“ لطف یہ ہے کہ اس برداشت میں عفو کا عنصر بھی موجود تھا۔ غور کیجئے کتنا بلند مقام ہے۔

جوابی تشدد اور عدم تشدد کی دو حیثیتیں ہیں۔

(۱) انفرادی اور شخصی (۲) جماعتی یا قومی

اس آیت میں جماعتی عدم تشدد کی تعلیم ہے، عدم تشدد دو چیزوں پر موقوف ہے ایک علوہمت، دوسری مصلحت وقت۔ یہاں جس عدم تشدد کا حکم دیا گیا ہے اس میں یہ دونوں عنصر موجود ہیں، جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت مسلمان معدودے چند تھے اور کامیاب مدافعت کے ناقابل۔ یہ تو مصلحت کا عطف لیکن بلند ہمتی کا عنصر بھی موجود تھا کیونکہ درگزر کے ساتھ عفو کی ہدایت بھی موجود ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کا شعر:

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

ایک مقام ہے عقل مصلحت اندیش کا، ایک مقام ہے عشق مصلحت نااندیش کا۔ یہ دونوں مقام ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ کامیاب انسان کے لئے جہاں عشق مصلحت نااندیش کی ضرورت ہے وہاں عقل مصلحت اندیش کے بغیر بھی چارہ نہیں۔ یہ تھوڑے سے گنتی کے مسلمان اگر مقام عشق مصلحت نااندیش پر قائم نہ ہوتے تو یقیناً ان جانکاہ مصیبتوں کے مقابلے میں ارتداد کو ترجیح دیتے اور اگر وہ مقام عقل مصلحت اندیش سے نا آشنا ہوتے تو ضرور وہ مقابلے پر اٹھ کھڑے ہو کر خود کشی کے مرتکب ہوتے لیکن وہ ان دونوں غلطیوں سے بچے رہے کیونکہ ان کا ان دونوں مقاموں پر عبور تھا اسی لئے وہ مدافعانہ اقدام کے لئے اس وقت تک منتظر رہے جب کہ ان کی جماعتی طاقت بڑھ گئی۔ اور جہاد کا حکم آگیا۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۖ وَأَقْتُلُواهُمْ حَيْثُ تُقِفُّهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تَقَاتِلُواهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۚ فَإِنْ انْتَهَوْا فَلْيَنْتَهِ عَفْوَ رَبِّهِمْ ۚ وَقَاتِلُواهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنْ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ۚ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۚ

اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن جو لڑیں تم سے اور زیادتی نہ کرو، یقیناً اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور قتل کرو انہیں جہاں پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے نکالا انہوں نے تم کو۔ اور فتنہ زیادہ سخت ہے قتل سے اور نہ لڑوان سے مسجد الحرام (یعنی کعبہ) کے پاس۔ جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے وہاں پس اگر وہ لڑیں تم سے تو قتل کرو ان کو۔ یہی سزا کا فورا جزاء کافرین کے۔ فان انتہوا فلینتہ عفو ربہم۔ وقاتلوہم حتی لا تكون فتنۃ ویکون الدین للہ فان انتہوا فلا عدوان الا علی الظالمین۔ الشہر الحرام بالشہر الحرام والحرمات قصاص۔ فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم۔ واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔

رہیم ہے اور لڑوان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ اور جو جائے دین اللہ کے لئے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو نہیں سختی مگر ظالموں پر حرمت والا ہینہ حرمت والے ہینہ کے بدلے ہے اور سب حرموں میں بدلہ ہے پھر جو زیادتی کرے تم پر تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی اور درو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پر ہر گاہ اللہ کے ساتھ ہے۔

آیاتِ بار میں قانونِ جنگ کے جو اصول بیان ہوئے وہ گہرے غور کے قابل ہیں۔

(۱) لڑائی صرف اسی قوم سے ہو سکتی ہے جو حملہ آور ہو۔ "الذین یقاتلونکم" اس سے معلوم ہوا

کہ جہاد مدافعتیہ اقدام ہے۔

(۲) لڑائی میں فریقِ ثانی پر زیادتی کرنا جائز نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اسلامی قانون کا رو سے ایٹم بم گرانہ تعدی ہے اور خدا معتمدین کو پسند نہیں کرتا۔

(۳) عرب کے رواج کے مطابق خانہ کعبہ کے نواح میں لڑائی کرنا منع تھا۔ اسی طرح بعض مہینوں میں بھی لڑائی بند ہوتی تھی۔ مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ تم بھی ان حرمتوں کا لحاظ کرو، ہاں اگر دشمن ان کا پاس نہ کرے تو اس صورت میں تم بھی آزاد ہو۔

(۴) اگر دشمن لڑائی بند کر دے تو تم بھی بند کر دو۔ ”فان انتہوا“ تاکید کے لئے یہ حکم مکرر بیان ہوا۔

(۵) لڑائی فتنہ دور کرنے کے لئے ہفتہ دور ہو جائے تو لڑائی بند کر دو۔ اس صورت میں فتنہ یہ تھا کہ کافر مسلمانوں کو پھر کفر میں واپس لانے کے لئے ان پر طرح طرح کے ظلم و ستم کرتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کو ان کے مظالم سے تنگ آ کر مکہ چھوڑنا پڑا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذہبی آزادی کیلئے لڑنا جائز ہے لیکن جب یہ آزادی مل جائے تو پھر لڑنا جائز نہیں۔ دین کا معاملہ خدا اور آدمی کے درمیان ہے کسی تیسرے شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس معاملے میں دخل دے۔ اگر کوئی دخل دے تو لڑو۔ لیکن جب پھر دین کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے تو لڑنا بند کر دو۔ ”و یكون الدين لله“

(۶) تعدی کے مقابلے میں اتنی ہی تعدی کرو جتنی تم پر کی گئی ہو، اس سے زیادہ جائز نہیں، یہ تقویٰ ہے اور اللہ تعالیٰ تقویٰ کرنے والوں کا حامی و مددگار ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جوابی تشدد اگر ضروری بھی ہو جائے تو بھی وہ مشروط ہے بشرطِ چند در چند۔ یہ نہیں کہ موجودہ زمانے کی لڑائیوں کی طرح انسانیت سوز حدود تک چلا جائے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ عدم تشدد اور امن کی تضحیک کرتے ہیں اور دوسروں کو تشدد پر آمادہ کرتے رہتے ہیں وہ خود بڑے بزدل ہوتے ہیں اور دقت پر عورتوں کی طرح گھروں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا
أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَ
آتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ
الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ
النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً
وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كُتِبَتْ عَلَيْنَا الْقِتَالُ

لَوْ لَا آخِرُ تَنَاءَلِي أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ“ اور میں تنویری اور مہلت کیوں نہ دی۔

مکہ معظمہ میں جب کافر مسلمانوں کو انہیں دیتے تھے تو بعض مسلمان کہتے تھے کہ ہمیں جوابی تشدد کی اجازت دی جائے، انہیں کہا گیا کہ نہیں ابھی جہاد کا وقت نہیں، ہاتھوں کو روک رکھو اور نمازیں پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو لیکن جب جہاد کا حکم آیا تو یہ لوگ کافروں کے مقابلے سے اتنا ڈرنے لگے جتنا خدا سے ڈرنا چاہئے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے کہ ابھی جہاد خلاف مصلحت ہے اور مہلت ہونی چاہئے۔ مولانا رومؒ نے انہی لوگوں کے متعلق کہا ہے۔

در میانِ ہمدگر مردانہ اند . در غزا چوں عورتانِ خانہ اند
وقتِ لافِ غز و مستانِ کف زبند . وقتِ جوش و جنگ چوں کف می فتند
وقتِ ذکرِ غز و شمشیرش دراز . وقتِ کز و فر تیغش چوں پیاز
لاف و غرہ تراثر خارا کم شنو . باجنب ہا در صعب ہیجا مرو
زانکہ زادو کم جالا گفت حق . کز رفیق سست برگرداں ورق
پس مشو ہمراہ این اشتر دلاں . زانکہ وقت ضیق و بیم اند آفلاں
پس گریزند و ترا تنہا بلند . گرچہ اندر لاف سحر بالند

توزر عنا یاں مجوہیں کارزار توز طاؤساں مجو صید و شکار
قرآن مجید میں تشددِ فعلی اور تشددِ قوی دونوں کے جواب میں عدم تشدد کی تعلیم موجود ہے۔
أُولَٰئِكَ يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ یہی لوگ ہیں جنہیں اُن کا اجر دو دفعہ دیا جائے گا۔
بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرُؤْنَ بِالْحَسَنَةِ بدیں وجہ کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ ہٹاتے ہیں
السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ برائی کو بھلائی کے ساتھ اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے
وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ اس سے خرچ کرتے ہیں اور جب وہ سنتے ہیں لغوبات
وَقَالُوا إِنَّا أَعْمَالُنَا وَكَلَمٌ أَغْمَالُكُمْ تو اس سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال
سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے سلام ہے
الْجَاهِلِينَ۔ (۲۸-۵۵)

آپ نے دیکھا عدم تشدد کا اجر دو چند ہے۔ صبر کرنے کی وجہ سے اور بدی کے بدلے میں نیکی کرنے کی
وجہ سے عدم تشدد پر عمل کرنے والے لوگ جو کوئی لغوبات سنتے ہیں تو اس کے جواب میں لغوبات نہیں کہتے
بلکہ یہ کہہ کر چل دیتے ہیں کہ ”آپ جانیں اور آپ کے کام۔ ہمارا اور آپ کا ساتھ ممکن نہیں۔ آپ پر سلام ہو“
فکر کا مقام ہے آج کل ہم میں کتنے ہیں جو اس نہایت حکیمانہ تعلیم پر کار بند ہیں۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ اور اللہ کے (نیک) بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر
عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ عجز و انکسار کے ساتھ اور جب مخاطب ہوتے ہیں
الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (۲۵-۶۳) ان سے جاہل تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو۔

کتاب بند مقام ہے ہمارا یہ حال ہے کہ جہالت کے جواب میں جب تک ہم بڑھ چڑھ کر جانت
نہ کریں تسلی نہیں ہوتی ہمارا دستور العمل تو یہ ہے۔

اَلَا لَا يَجْهَلْنَ اَحَدٌ عَلَيْنَا ففجھل فوق جھل الجاہلینا

مولاناؒ روم کے یہ دو شعر اسی بلند مقام کا پتہ دیتے ہیں جو اس آیت میں مذکور ہوا۔
 اگر گویند ز راقی و سالوس بگو ہستم دو صد چندان و می رو
 و گر از خشم دشنامے دہندت دعا کن خوشدل و خندان و می رو
 وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ اور وہ (نیک) لوگ جو نہیں شہادت دیتے
 وَلَا ذَا قُرْبَىٰ وَلَا بِالْغُفْرِ يُؤَكِّرُ مَا جھوٹی اور جب وہ گزرتے ہیں لغو کے پاس سے
 تو گزر جاتے ہیں وقار کے ساتھ۔ (۲۵-۲۷)

لغو قول یا لغو فعل پیش آجائے تو نیک بندے جواب میں نہ لغو کہتے ہیں نہ لغو کرتے ہیں بلکہ شرافت و عزت اور وقار کے ساتھ کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ
 فَهَرَّاجِمًا وَلَا وَذَرْنِي وَالْمَلِكُ يُبَيِّنُ
 أُولَى النَّعْمَةِ وَفَهْلَهُمْ قَلِيلًا خوش حال جھٹلانے والوں کو اور مہلت دے انھیں
 إِنَّ لَدَيْنَا الْأَكْبَالَ وَحَجِيمًا (۱۲۴:۱۲۵) تھوڑی بلا شبہ ہمارے پاس بڑیاں ہیں اور دوزخ۔

یہ خطاب ہے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کافر اور مشرک آپ کو یہودہ باتیں کہہ کہہ کر ایذا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ آپ ان کی باتوں پر صبر کریں اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ میں جانوں کہ لطف یہ ہے کہ چھوڑنا بھی وہ چھوڑنا نہیں جو بزربان آدمی کے درخور ہے۔ بلکہ ہجر جمیل کی ہدایت خوبصورت چھوڑنا یہ نہ صرف عدم تشدد ہے بلکہ حسن و جمیل عدم تشدد۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا دلِ دشمنان ہم نکر نہ تنگ
 ترا کے یستر شود ایں مقام کہ باد و تانت خلاف است جنگ (سعدی)
 فی الواقعہ یہ مقام بہت بلندی پر ہے۔ کوئی خوش بخت آدمی ہی وہاں تک پہنچ سکتا ہے

جوابی تشدد یعنی قصاص کی حکمت اور مصلحت پہلے بیان ہو چکی۔ قرآن مجید میں عدم تشدد یا اہنسا کی حکمت بھی بیان ہوئی ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِذْ قُم بِالَّذِیْ هِیْ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ
بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهُ
وَلِیُّ حَرِیمٍ ۚ وَمَا یُلْقُهَا الْاَلٰ الذِّیْنَ
صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلْقُهَا الْاَلٰ ذُوْ حِظٍّ
عَظِیْمٍ ۝ (۳۱-۳۲ و ۳۵) مگر اس کو جو بڑا بخت والا ہوتا ہے۔

یہ حکمت ہے عدم تشدد کی اور یہ مقام ہے اُن لوگوں کا جنہیں اللہ تعالیٰ نے صابر اور ذو حظّ عظیم کہا ہے حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ”حسن خلق آنست کہ خلق را ز بخانی و رنج خلق بکشی بے کینہ و مکافات“

یہاں یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ وہ اصحاب جو قرآن مجید کے ایک نصف کو دوسرے نصف سے منسوخ ثابت کرنے کے شائق ہیں تقریباً تمام مذکورہ بالا آیات کو آیہ سیف سے منسوخ قرار دیتے ہیں لیکن وہ لوگ جو ان نہایت حکیمانہ اور زرین تعلیمات کو منسوخ کہنے کی گستاخی نہیں کر سکتے یہ نہیں کہہ سکتے کہ عدم تشدد یا اہنسا کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔

خطبہ جمعہ کی زبان

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

حضرت مولانا گیلانی کا یہ مضمون امید ہے ارباب علم اور اصحابِ فتویٰ توجہ سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ دیوبند کے بعض مشہور اکابر پہلے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھا چکے ہیں، مولانا نے اپنی جدید تحقیق کی بنیاد تارخانیہ کی جس عبارت پر رکھی ہے علامہ ابن عابدین (شامی) کا فیصلہ اس کے متعلق یہ ہے: "لکن کو نہما رجعا الی قولہ فی الشرع لم نقلہ احد وانما المنقول حکایتہ الخلاف واما فی التارخانیہ فغیر صریح فی تکبیر الشرع بل ہو معتمل لتکبیر التشریع او الذبح بل ہذا اولیٰ، لانہ قرنہ مع الاذکار الخارجیۃ عن الصلوۃ یعنی نہ تو دربارہ تکبیر صاحبین کا رجوع امام صاحب کی جانب ثابت ہو اور نہ یہ واضح ہے کہ تارخانیہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ تکبیر تحریمہ کے متعلق ہے۔"

بہر حال خطبہ جمعہ کی سرکاری زبان کا مسئلہ ہمارے خیال میں ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کا فیصلہ چند متفرق قیاسات کو یکجا کر دینے سے نہیں ہو سکتا۔ (عقیق الرحمن عثمانی)

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے ہندوستان کے اساطین صوفیہ کے تحقیقی حالات کا جو سلسلہ برہان میں شروع کیا ہے بڑا مفید سلسلہ ہے۔ حضرت مولانا فخر قدس اللہ سرہ العزیز کی سیرت طیبہ غالباً اس سلسلہ کی دوسری قسط ہے حق تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوں کہ توفیق پروفیسر صاحب کی رفیق ہو، مولانا فخر رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کے آخر میں یہ جو روایت نقل کی گئی ہے۔

"پس اگر خطبہ بہ لفظ ہندی دہیں مملکت خواندہ شود برائے چیزے کہ موضوع است حاصل نشود، الا برائے سائر الناس"

فائدہ نثار دکن از زبان عربی واقف نیستند (فخر الطالبین ص ۴۲) برہان ص ۷۰، ۷۱ فروری ۱۹۷۷ء

اس وقت اسی کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے، ایک زمانہ سے ہندوستان کے خفی علمائے میں یہ مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے۔ عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ جمعہ کو غیر مسنون قرار دینے والے حضرات کے دلائل

عام طور پر مشہور ہیں، غالباً ان میں سب سے قوی تر دلیل وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے پیش فرمائی ہے کہ ”غیر عربی ممالک میں حالانکہ جمعہ و جماعات کا عہد صحابہ میں ظاہر ہے کہ ہر مفتوحہ ملک میں انتظام تھا لیکن کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ان غیر عربی ممالک کے باشندوں کی رعایت سے سننے والوں کی زبان میں خطبہ کے ترجمہ کی اجازت دی گئی ہو۔“

مجھے اس وقت مسئلہ کی دلیلوں سے بحث نہیں ہے پوچھنے والے جو یہ پوچھتے ہیں کہ شہادت کا نہ ملنا، اس کو وجود شہادت قرار دینا، یا کسی مباح فعل کو نہ کرنا، فعل کے عدم اباحت کی دلیل کیا بن سکتی ہے؟ کتاب و سنت میں ترجمہ کی ممانعت نہیں ہے اس لئے اس کو مباح سمجھنا چاہئے، صحابہ نے اگر کسی فعل مباح پر عمل نہ کیا تو ان کا عمل نہ کرنا اس فعل کی اباحت کو کیا کراہت سے بدل دیگا؟ نیز غیر عربی زبانوں سے عموماً صحابہ کی ناواقفیت بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے کہ ترجمہ کے فعل مباح پر وہ عمل نہ کر سکے۔

بہر حال اصولی سوال و جواب کے سلسلے کو میں چھڑنا نہیں چاہتا، بلکہ اس وقت یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ”مسک حنفی“ جس کے مسلمانان ہند اپنی صلوات و صیام عقود و معاملات وغیرہ میں پابند ہیں اس کا اس باب میں صحیح نقطہ نظر کیا ہے؟

جاننے والے جانتے ہیں کہ یہاں دراصل دو مسئلے ہیں ایک تو قرآن کے ترجمہ کا مسئلہ یعنی بجائے قرآن کی اصل عربی عبارت کے نماز میں حق تعالیٰ کے کلام کا ترجمہ کسی زبان میں کر کے اگر کوئی پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟ دوسرا مسئلہ قرآن کے سوا دوسرے اذکار مثلاً تکبیر، تسلیم، تشہد، درود، قنوت، خطبہ، تسبیحات سجود و رکوع وغیرہ کا ہے کہ بجائے عربی الفاظ کے اسی مفہوم کو جو عربی الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں غیر عربی الفاظ میں ترجمہ کر کے مانع میں کوئی پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے۔

متن کتنز میں دوسرے مسئلہ کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ اوبالفارسیہ صح (یعنی بجائے عربی کے ان اذکار کو کوئی فارسی میں ترجمہ کر کے پڑھے تو یہ درست ہے) پھر چونکہ ایک اور سوال پیدا ہوتا تھا یعنی ایک آدمی ایسا ہے جو عربی

جاننے والے جانتے ہیں کہ یہاں دراصل دو مسئلے ہیں ایک تو قرآن کے ترجمہ کا مسئلہ یعنی بجائے قرآن کی اصل عربی عبارت کے نماز میں حق تعالیٰ کے کلام کا ترجمہ کسی زبان میں کر کے اگر کوئی پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟ دوسرا مسئلہ قرآن کے سوا دوسرے اذکار مثلاً تکبیر، تسلیم، تشہد، درود، قنوت، خطبہ، تسبیحات سجود و رکوع وغیرہ کا ہے کہ بجائے عربی الفاظ کے اسی مفہوم کو جو عربی الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں غیر عربی الفاظ میں ترجمہ کر کے مانع میں کوئی پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے۔

جو عربی الفاظ میں ان اذکار کو ادا کرنے پر قادر نہیں ہے، دوسری صورت میں تو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ صاحبین ابو یوسفؒ و محمدؒ سب ہی اجازت دیتے ہیں البتہ عربی الفاظ میں تعبیر کی قدرت رکھتے ہوئے بھی غیر عربی الفاظ میں ان اذکار کو کوئی اگر ادا کرے تو لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو اس وقت بھی اجازت دیتے ہیں لیکن صاحبین ایسی صورت میں اس طریقہ عمل کو مکروہ قرار دیتے ہیں عینی نے کنتر کے حاشیہ میں لکھا تھا کہ۔

والفتویٰ علی قول لصاحبین یعنی صاحبین (ابو یوسف و محمد) کے قول پر علماء نے فتویٰ دیا ہے

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسی صورت میں کراہت ہی کو ترجیح علماء نے دی ہے ان اذکار کے سلسلہ میں خطبہ کو بھی لوگوں نے داخل کیا ہے، اس لئے حاصل یہی نکلتا ہے کہ عینی کے قول کے مطابق جیسے نماز کے اذکار کا بحالت قدرت غیر عربی الفاظ میں ترجمہ مکروہ ہے اسی طرح خطیب جو عربی تعبیر پر قادر ہو اس کے لئے غیر عربی الفاظ میں خطبہ کو پڑھنا مکروہ سمجھا جائے گا، فتویٰ اسی پر ہے عینی کے قول سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ ان تفصیلات کو کنتر کی مشہور شرح فتح المعین میں نقل کرنے کے بعد عینی کے دعویٰ پر فیه نظر (یعنی کراہت ہی کے پہلو پر فتویٰ دیا گیا) عینی کا یہ دعویٰ بحث طلب ہی کے الفاظ سے اعتراض کر کے آگے تارخانہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

ان الشروع بالفارسیۃ یعنی نماز کی تکبیر کو فارسی زبان میں شروع کرنا بالاتفاق سبکے

کاتبلیۃ یجوز اتفاقاً نزدیک جائز ہے جیسے حج میں لبیک بجائے عربی کے فارسی میں بھی کہنا جائز ہے

اور آخر میں اسی تارخانہ کے حوالہ سے صاحب فتح المعین اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ

محصلہ فی مسئلۃ الشروع خلاصہ یہ ہے کہ باوجود عربی پر قادر ہونے کے فارسی زبان بالفارسیۃ ولو مع القدرة علی العربیۃ میں نماز کو شروع کرنا یعنی فارسی میں تکبیر کا ترجمہ کرنا اس رجحان الی قولہ بخلاف القراءة بھامع مسئلہ میں ابو یوسفؒ اور محمد بن حسنؒ نے رجوع کر کے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو اختیار کر لیا ہے اور قرآن کی قراءۃ میں امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ اور محمد کے قول کی طرف رجوع کیا ہے (رفع المعین ص ۸۳)

یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک میں ایسی چیزیں ہیں جن کی قراءۃ میں عربی کے الفاظ کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں کو چاہئے کہ اصل کتاب بھی علماء دیکھ لیں مسئلہ کی اس حقیقت پر مطلع ہونے کے بعد میں اب یہ سمجھا ہوں کہ عربی زبان کی تعبیر پر قادر ہونے کے باوجود قرآن کے سوا دوسرے اذکار (یعنی وہی تکبیر و تسلیم، تہجد، تسبیحات، درود جس میں خطبہ جمعہ بھی بالاتفاق داخل ہے) ان کے متعلق ہمارے تینوں امام یعنی امام ابو حنیفہؒ، قاضی ابویوسفؒ، و محمد بن حسنؒ سب ہی اس بات کے قائل ہیں کہ بغیر کسی کراہت کے غیر عربی الفاظ میں ان کا ترجمہ جائز ہے مبسوط کے حوالہ سے اسی موقع پر فتح المعین ہی میں نقل کیا ہے کہ من غیر کراہۃ علی الاصح علی ما ذکرہ السرخسی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں صاحبین (ابویوسف و محمد) کا رجحان ان اذکار کے متعلق بھی کراہت کا تھا اور امام ابو حنیفہؒ جواز کے قائل تھے لیکن بعد کو دونوں صاحب اپنے اتناڑ کے ہم نوا ہو گئے، اس لئے حنفی مذہب کا اب یہ اجماعی مسئلہ ہوا کہ سارے غیر قرآنی اذکار جن میں خطبہ جمعہ بھی شریک ہے ان کا ترجمہ عربی پر قادر ہونے کے باوجود خطیب کر سکتا ہے اور کسی قسم کی کراہت اس میں نہیں ہے۔

اسی کے مقابلہ میں قرآن کے ترجمہ کے متعلق امام ابو حنیفہؒ نے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کیا یعنی قرآن کا ترجمہ نماز میں جائز نہیں ہے جیسا کہ صاحب فتح المعین نے لکھا ہے کہ قرآن اور غیر قرآنی اذکار میں لوگوں نے فرق نہیں کیا اور مشہور کر دیا گیا کہ امام ابو حنیفہؒ پہلے جواز کے قائل تھے لیکن بعد کو ابویوسفؒ و محمدؒ کے قول کی طرف انھوں نے رجوع کر لیا حالانکہ مسئلہ کی یہ صیح تعبیر نہیں ہے بلکہ یہ دونوں الگ الگ مسئلے ہیں ایک مسئلہ یعنی قرآن کے متعلق امام ابو حنیفہؒ نے رجوع کیا اور غیر قرآنی اذکار میں صاحبین نے ابو حنیفہؒ کے مسلک کی طرف رجوع کیا اس لئے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

فظاہرہ کالمتن رجوعہما الیہ تتارخانہ کی عبارت کا کھلا ہوا اقتضار وہی ہے جو متن (کنز) کی عبارت سے معلوم

لا ہوا لیہما فا حفظہ فقد ہوتا ہے یعنی غیر قرآنی اذکار میں صاحبین ہی نے ابو حنیفہؒ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے

اشتہ علی کنیر حتی الشربلائی نہ کہ ابو حنیفہؒ نے ان دونوں کے قول کی طرف اس کو خوب اچھی طرح یاد رکھا اکثر کوشش ہو گیا حتیٰ

ایک زمانہ سے جی چاہ رہا تھا کہ فتح المعین کے اس غصیلہ کو علماء احناف کے سامنے پیش کروں آج موقع مل گیا

فقہ النفس بزرگوں سے توقع ہے کہ اس کی طرف رجوع فرمائیں گے۔

تصیر

دلی کی چند عجیب ہستیاں | از جناب اشرف صاحب صبحی تقطیع متوسط ضخامت ۲۷۴ صفحات طباعت اور کتابت بہتر شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی پتہ قیمت ۱۱/۸ بھلا جلد اور سہے جلد

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد دہلی کی بہار لٹ گئی اور اس کا سہاگ اجڑ چکا تھا لیکن پھر بھی اس میں ایک بانگین اور ایک خاص طرح کی دلکشی تھی اور یہ بانگین طبقہ علیا کے لوگوں سے لیکر نیچے درجہ کے لوگوں اور معمولی پیشہ وروں تک میں پاتا جاتا تھا۔ اس کتاب میں اسی دور کی چند عجیب ہستیوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں جس طرح یہستیاں مثلاً میر باقر، مٹھو بھٹیارا، گھمی کبابی، مکن نانئی، مرزا چاچی، پیر جی کوے، سیدانی بی بی، نیازی خانم وغیرہم اپنے عادات و اطوار، سچ دھج، وضع قطع، بات چیت اور طور طریق کے لحاظ سے نہایت دلچسپ اور عجیب ہستیاں ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے حالات جس زبان میں سنائے گئے ہیں وہ بھی دلی کی خالص ٹکسالی اور لال قلم کی بیگماتی زبان ہونے کی وجہ سے نہایت دلچسپ شیریں اور بہت عجیب و غریب ہے۔ اب اس زبان کے لکھنے اور بولنے والے دلی میں بھی خال خال ہی رہ گئے ہیں اور انھیں میں ایک اس کتاب کے فاضل مصنف ہیں جو ارباب ذوق دلی کی پرانی معاشرت بول چال اور قدیم تہذیب و تمدن کی جھلک دیکھنا اور ساتھ ہی یہاں کی بیگماتی روزمرہ اور ٹکسالی زبان کا لطف لینا چاہتے ہوں ان کو اس کتاب کا کم از کم ایک مرتبہ ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ کتاب کے آخر میں خاص خاص لفظوں اور محاوروں کی مع ان کی تشریح کے اگر ایک فہرست بھی شامل کر دی جاتی تو بہت اچھا ہوتا کیونکہ اس میں بہتیرے الفاظ اور محاورے ایسے ہیں کہ ابھی تک سینہ بسینہ ہی منتقل ہوتے رہے ہیں۔ عام متداول لغات میں بھی نہیں مل سکتے۔

مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں | مرتبہ مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی تقطیع خورد ضخامت ۲۰۰ صفحات

کتابت طباعت بہتر قیمت غیر مجلد علم اور مجلد علم پتہ :- مکتبہ جمعیت التعاون دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

”الندوۃ“ دورِ جدید میں ایک مستقل عنوان ”میری محسن کتابیں“ کے ماتحت ملک کے شاہسیر اہل علم و ادب کے مقالات کا ایک طویل سلسلہ کئی ماہ تک شائع ہوتا رہا تھا اب انہیں مقالات کو جمع دوا اور مقالوں کے جو اس زمانہ میں الندوہ میں نہ چھپ سکے تھے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے یہ کل مقالات گنتی میں اٹھارہ ہیں اور سب کے سب بلند پایہ مصنفین، ادا اور اربابِ قلم و علم کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ان حضرات نے یہ بتایا ہے کہ اُن کی علمی اور ادبی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں سب سے زیادہ دخل کن کتابوں کا رہا ہے یہ مجموعہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل یگانہ ہے اس کا مطالعہ عام اربابِ ذوق اور طلباء کے لئے خاص طور پر بہت مفید ہوگا۔ آخر میں لائق مرتب نے حروفِ تہجی کے اعتبار سے اُن تمام کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی دیدی ہے جن کا ذکر اس میں آیا ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت دوچند ہو گئی ہے۔

نفسیاتِ جمال | از مولانا ابوالنظر صاحب رضوی امر و موی تقطیع خورد ضخامت ۱۵۲ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد غیر پتہ :- اعلیٰ کتب خانہ دہلی قرول باغ۔

مولانا ابوالنظر صاحب رضوی کے متعدد مقالات برہان میں شائع ہو کر علمی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب موصوف کا ہی ادبی کارنامہ ہے جس کا نام اگر بجائے ”نفسیاتِ جمال“ کے ”نفسیاتِ محبت“ ہوتا تو بہتر تھا، کیونکہ اس میں محبت اور اُس کی مختلف کیفیات اور ادائیں مثلاً محبت اور زندگی، محبت اور شباب، عزم و ارادہ، ناکامی، خودکشی وغیرہ وغیرہ جیسے ۲۷ عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ زبان بڑی شگفتہ اور اندازِ باریک بینی سے فلسفیانہ ہے۔ لائق مصنف نے فلسفہ، ادب اور نفسیات ان تینوں کی ترکیب سے اس پیکر کو تیار کیا اور لطف یہ ہے کہ محبت کے شراب خانہ میں بیٹھنے کے باوجود انھوں نے اپنے قلب و نظر کو بہکنے نہیں اور موضوعِ گفتگو کے انتہائی نازک ہونے کے باوجود عریانی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اس کا مطالعہ ادبی نفسیاتی دونوں جہتوں سے دلچسپ اور لطف آفرین ہوگا۔

سلسلہ ۱۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعر مجلد ۷۲

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب

جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ

پیش کیا گیا ہے قیمت ۱۰/- مجلد للعر

خلافت راشدہ۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں

عہد خلفائے راشدین کے تمام قابل ذکر واقعات

صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں

قیمت ۱۰/- مجلد ۳۲

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ ۴۲

سلسلہ ۲۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغت قرآن

پر بے مثل کتاب ۱۰/- مجلد للعر

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا مختصر شہ

ورفتہ ترجمہ قیمت ۱۰/-

اسلام کا نظام حکومت۔ صدیوں کے قانونی مطالب

کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطہ حکومت کے

تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت

۴۰/- روپے مجلد سات روپے۔

خلافت بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے

بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ۱۰/- مجلد ۳۲

سلسلہ ۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت

جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، انداز

بیان دلکش قیمت للعر مجلد ۷۲

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی

قیمت للعر مجلد ۷۲

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات

کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعر مجلد ۷۲

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی۔

قیمت ۱۰/- مجلد للعر

سلسلہ ۴۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت

کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین

اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبودیت مع الالو

نذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور

اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح

کیا گیا ہے قیمت ۱۰/- مجلد ۷۲

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء

کے حالات مبارک کا بیان قیمت ۱۰/- مجلد ۷۲

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر قابل مطالعہ کتاب

۳۰۰ صفحات قیمت ۱۰/- مجلد ۷۲

نیچر ندوۃ المصنفین دہلی قزول باغ

Registered No. 4305

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

- (۱) محسن خاص :- جو حضرات کم و کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ معین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم و آراء اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات خدمت کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشنوں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔
- (۲) محسنین :- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ معین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔
- (۳) معاونین :- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جن کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔
- (۴) اجتا :- نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے اجتام میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

- (۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔
- (۲) فہرست علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ عنوان ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں
- (۳) باوجود ہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجا جائیگا اس کے بعد شکایت قابل اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے اس کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی عدد ہے چھ ماہ آٹھ (مع حصول ایک) فی روپے ۸

(۶) نئی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جدید پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قریب بلوچ سٹریٹ کا

نَدْوَةُ اَصْنَفِیْنَ دِلِّیْ كَا عِلْمِیْ دِیْنِیْ كَا هِنَا

بُرْكَانُ

مُرْتَبِیُّ
سَعْدِیَا حَمْدًا بِسْرَابَادِی

مطبوعات ندوة المصنفین دہلی

ذیل میں ندوة المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کئے جاتے ہیں تفصیل کیا دفتر سے فہرست کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محضرہ معاونین اور اجار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

غلامان اسلام :- پچھتر سے زباوہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت ۳۰ روپے جلد ۱	مسئلہ اسلام میں غلامی کی حقیقت - مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جن میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت ۳۰ روپے جلد ۱
اخلاق اور فلسفہ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مسودہ اور محققانہ کتاب جس میں اصول اخلاق اور انواع اخلاق اور فلسفہ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳۰ روپے جلد ۱	تعلیمات اسلام اور سچی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ۲۰ روپے جلد ۱
مسئلہ قصص القرآن حصاؤل - جدید ایڈیشن ندوة المصنفین کی مایہ ناز اور مقبول ترین کتاب زیر طبع قیمت ۳۰ روپے جلد ۱	سوشلزم کی بنیادی حقیقت، اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ۳۰ روپے جلد ۱
بین الاقوامی سیاسی معلومات - یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت ۲۰ روپے جلد ۱	ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۴
وحی الہی - مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت ۲۰ روپے جلد ۱	مسئلہ نبی عربی صلعم - تاریخ ملت کا حصول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے قیمت ۲۰ روپے جلد ۱
تاریخ انقلاب روس - ٹرانسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت ۲۰ روپے جلد ۱	فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے اس موضوع پر اپنے رنگ کی بیشل کتاب قیمت ۲۰ روپے جلد ۱

برہان

شمارہ (۴)

جلد تیزوہم

اپریل ۱۹۴۷ء مطابق جمادی الاول ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

۱۹۴	سعید احمد	۱ نظرات
۱۹۷	لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب	۲۔ علم النقیات کا ایک افادی پہلو
		۳۔ دستور الغصاحت
۲۱۱	محترمہ آمنہ خاتون ایم۔ اے لکچر رہارانی کلج میسور	اس کی ترتیب اور حواشی پر ایک تنقید
۲۳۷	سعید احمد	۴۔ بچوں کی تعلیم و تربیت
		۵۔ ادبیات۔
۲۵۱	جناب ماہر القادری صاحب	نقشِ دوام
۲۵۲	جناب رشید ذوقی	قطعات
۲۵۳	م۔ ح	۶۔ تبصرے۔

نظرات

اصلاحِ تعلیم کے سلسلہ میں ہمارے مخدوم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اپنی بلند پایہ کتاب مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت میں ایک نظریہ وحدتِ تعلیم کا پیش کیا ہے مولانا کا یہ خیال صحیح ہے کہ تعلیم کو قدیم وجہ بدو حصوں پر تقسیم کر دینا اور اس طرح تعلیم یافتہ مسلمانوں کا دو متخالف و متضاد گروہوں میں بٹ جانا انگریزی حکومت ہی کی ایک برکت ہے۔ ورنہ مسلمانوں میں دینی اور دنیوی علوم و فنون پر شتمل ہمیشہ ایک ہی نصابِ تعلیم رائج رہا ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج علوم و فنون کی اس قدر کثرت اور ان میں جو وسعت پیدا ہو گئی ہے وہ پہلے کبھی نہ تھی اور آج کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنی میں مضبوط اور زندہ قوم نہیں ہو سکتی جب تک اس میں سب علوم جدیدہ وحاضرہ کے نہ صرف جاننے والے بلکہ ان میں بصیرت و مہارت رکھنے والے افراد موجود نہ ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص تمام علوم و فنون کا جامع اور ماہر نہیں ہو سکتا اور ایک علم و فن کی تدریس اور اس میں تحقیقی نظر پیدا کرنے کے لئے طبعی طور پر جن ابوابِ آلات اور ماحول کی ضرورت ہے وہ دوسرے علم و فن کے لئے ضروری نہیں ہو سکتے۔ اس بنا پر اگر وحدتِ تعلیم سے مقصد یہ ہے کہ درس گاہیں ایک ہی قسم کی ہوں، نصابِ تعلیم سب کا یکساں ہو۔ اور ماحول بھی ایک ہو تو ایسا ہونا نہ صرف یہ کہ عملاً ناممکن ہے بلکہ قومی اعتبار سے نقصان رساں اور مضر بھی ہوگا۔

البتہ تعلیم کی مدت کو چند حصوں پر منقسم کر کے یہ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی حصہ میں وحدتِ تعلیم کے نظریہ کو عملی شکل دی جائے اور وہ اس طرح کہ مثلاً میٹرک تک کا نصاب ایسا بنایا جائے اور وہ سب کے لئے لازمی ہو۔ کہ اُسے پڑھنے کے بعد ایک مسلمان طالب علم میں ایک طرف دینی علوم و فنون سے مناسبت پیدا ہو جائے اور دوسری طرف ضروری علوم عصریہ سے وہ نا آشنا نہ رہے۔ یہ نصاب پرائمری تعلیم کے ختم ہونے کے بعد زیادہ تر

زیادہ پانچ سال کا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد ہر طالب علم کو اس کا موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنے فطری ذوق اور ذاتی صلاحیت و استعداد کے مطابق جس شعبہ میں چاہے کمال و امتیاز پیدا کرے۔ اس مرحلہ پر مدارس عربیہ میں انگریزی علوم و فنون کی یونیورسٹیوں کی طرح دینی اور عربی علوم کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبہ کے لئے الگ الگ اولاً ثانوی تعلیم اور پھر اس کے بعد درجہ تکمیل کا بندوبست کرنا چاہئے۔ درجہ تکمیل میں تدریس کا کام کم اور ریسرچ کا کام زیادہ ہوگا!

اصلاح تعلیم کے سلسلہ میں جہاں نصاب طریق تعلیم میں تبدیلی کرنا ضروری ہے۔ اتنا ہی ضروری یہ امر ہے کہ طلباء میں علمی شغف، دینی جذبہ اور اخلاقی فضائل پیدا کئے جائیں۔ ورنہ نصاب تعلیم کتنا ہی صالح اور مفید ہو اگر طلباء میں عام دنیا داروں کی طرح علم کو ذریعہ معاش بنانے اور اس کے ذریعہ دنیوی جاہ و منصب اور دولت و ثروت حاصل کرنے کا جذبہ باقی رہا تو بہترین نصاب تعلیم سے بھی.....
..... ہماری قومی مشکلات حل نہیں ہو سکتی۔ دورِ آخر میں ہماری علمی اور دینی تباہی کا بڑا سبب یہی رہا ہے کہ علماء سلف کے امتیازی اوصاف یعنی قناعت کیشی، مخلصانہ خدمت، دین کا جذبہ، بے غرض علمی انہماک ان سب کو عصرِ حاضر کی تہذیب نے بالکل تباہ کر دیا اور ہر شخص مادی منفعت کی جستجو میں بے لوث خدمت کے جذبہ سے محروم ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شخص بے لوث و بے غرض خدمت کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن ہر زمانہ میں بہر حال ایسی جماعت کا وجود حیاتِ ملی کے لئے ناگزیر ہے زمانہ کے نشیب و فراز اور رجحاناتِ عصری کے باعث اس جماعت کے افراد میں کمی بیشی ہو سکتی ہو لیکن یہ اندہ سیر تو نہ ہونا چاہئے جو آج نظر آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی مختصر ہو لیکن قوم کو صحیح راستہ پر لیجانے اور ان میں ذہنی اور علمی خوبیاں پیدا کرنے اور ان کو نشوونما دینے کا کام ہمیشہ ایسی ہی جماعت انجام دیا ہے۔ ایسی جماعت کو قائم رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم ان کیلئے باعزت مگر آزاد وسائل معاش کا بھی انتظام کریں۔

آخر میں ایک اور اہم بات کی طرف توجہ دلانی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے نزدیک جب تک خالص اسلامی حکومت ہو مسلمانوں کی تعلیم کو حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہونا چاہئے۔ ہمارا یہ خیال عام تعلیم سے متعلق ہے خواہ وہ مدرسوں میں ہو یا کالج

میں لیکن مدارس عربیہ کیلئے تو اپنی تعلیم کو حکومت کے اثر سے بالکل آزاد رکھنا اور بھی ضروری ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی اور یا مشترکہ۔ بہر حال جب تک وہ خالص اسلامی طرز کی حکومت نہیں ہے، اس کی سیاست بے لاگ اور بے غل و غش نہیں ہو سکتی اور مدارس عربیہ کیلئے ایسی تعلیم درکار ہے جو ہر قسم کے بیرونی اثر اور خارجی عمل و دخل سے یکسر آزاد ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند ایسی چند درسگاہیں اب تک حکومتی اثرات سے آزاد رہی ہیں لیکن اب ملک میں نیشنل گورنمنٹ قائم ہے۔ اس لفظ "نیشنل" سے ہماری پرانی درسگاہوں کو دھوکہ نہ ہونا چاہئے۔ یہ گورنمنٹ نیشنل ضرور ہے لیکن اسلامک نہیں ہے اور ہماری تعلیم کسی نیشنلزم کی ہرگز پابند نہیں ہو سکتی۔

آنندیل مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم مرکزی حکومت نے بہت اچھا کیا کہ اس قسم کے شبہ کو دور کرنے کے لئے لکھنؤ میں اجتماع کے بعد ہی ایک بیان میں فرمادیا کہ انھوں نے اجتماع میں جو تقریر کی تھی وہ وزیر تعلیم ہونے کی حیثیت سے نہیں کی تھی! کوئی وجہ نہیں کہ مولانا کے اس بیان پر اعتماد نہ کیا جائے خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہے کہ مدارس عربیہ کی اصلاح و تجدید مولانا کا آج کا نہیں۔ ایک عرصہ دراز کا خواب ہے اور اب یہ خواب خواب پریشاں نہیں رہا۔ بلکہ رویائے صالحہ بن چکا ہے لیکن اگر مولانا علما دین کو یو۔ پی۔ گورنمنٹ کے کونسل چیمبر کے بجائے لکھنؤ کے کسی عربی مدرسہ یا کسی مسجد میں مجتمع ہونے کی دعوت دیتے اور وہاں تقریر فرماتے تو مولانا کا مذکورہ بالا بیان اور زیادہ مؤثر ہوتا اور بعض "اگلے وقتوں" کے عادی علما کو کونسل چیمبر میں جانے سے جو وحشت ہوئی وہ نہ ہوتی۔

ہمارے بعض احباب ہماری زبان سے اصلاح مدارس عربیہ کا مطالبہ سنتے ہیں تو انھیں گمان ہوتا ہے کہ ہم نصاب تعلیم کی اصلاح کے ساتھ مدارس کے نظام تمدن کو بھی نو یورپیوں کے نظام تمدن کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ واضح رہنا چاہئے کہ اس طرح کا خیال ایک غلط بدگمانی سے زیادہ واقع نہیں ہے۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ درسگاہوں میں ٹاٹ یا دسی کے فرش اور تپائیوں کی جگہ میزوں اور کرسیوں کا انتظام کیا جائے۔ اور طلباء کو سادہ اور کم خرچ لباس پہننے کی بجائے جدید وضع کا اور گراں لباس پہننے کا مکلف کیا جائے علوم دینیہ اسلامیلن بزرگوں کی مبارک سیاحت میں جو اگرچہ دبدبہ و چشم کے اعتبار سے کسی فرمانروا سے کم نہ تھے مگر ان کے گھر کا اثاثہ بقول مولانا شبلی کے "بوریا نیست کہ در کلبہ احزاں دلیریم" کا مصداق ہوتا تھا۔ اس بنا پر ان علوم کی تدریس تعلیم کی شان اسی میں ہے کہ اس سادگی کو قائم رکھا جائے۔ مگر ہاں سادگی کے ساتھ صفائی

۴ اور سلیقہ مندی ضروری ہے پھر ان اثرات کے ماتحت جو نوجوان ان درسگاہوں پر تعلیم پا کر نکلیں گے وہ بے شک اس شرم کا مصداق ہوں گے۔ عینون لینون ایسا درخشاں کام + سوائس مگر متا بناء ایسا۔

علم النفسیات کا ایک فادی پہلو

خواب، ضبط، زندگی اور حرکت

از

لیفٹیننٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب

Transference of Emotion یعنی نقل جوش سے متعلق ہم

گذشتہ مقالات میں عرض کر چکے ہیں کہ اس سے ہماری زندگی میں کیا کیا نقائص پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اس حجاب کا انحصار احساسِ کمتری پر ہے۔ ہمیں تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دور کیوں جائیے۔ اکبر اعظم کا ہی دور حکومت دیکھئے۔ بدایونی نے جو کچھ فیضی اور ابوالفضل کے متعلق اپنی منتخب التواریخ میں لکھا ہے اس سے تاریخ داں اصحاب بے خبر نہیں ہیں۔ اور پھر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نقل جوش کی محض یہ وجہ تھی کہ بدایونی کو فیضی اور ابوالفضل کے بڑھتے منصب پر رشک ہونے لگا۔ اور یہ رشک حسد کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اور بدایونی احساسِ کمتری میں اس طرح گرفتار ہو گئے کہ سوائے اس کے کہ منتخب التواریخ کے صفحات پر دل کھول کر ایک پر آشوب بخار کا اظہار کرتے اور چارہ ہی نہ تھا۔ یہ بخار نمودار ہوا اور دنیا اس وقت تک اس کی شاہد ہے۔ دورِ اکبری اور دیگر شاہانِ مغلیہ کے وقتوں میں ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ اولیا اللہ اور علماء کا بے دریغ قلع قمع، دوستوں اور رشتہ داروں کا بے جا قتل، اگر اظہارِ احساسِ کمتری نہیں

سہ سلسلہ کے لئے دیکھئے برہانِ نومبر ۱۹۲۶ء

تو اور کیا ہے؟ مذہب تو ایسی باتوں کی اجازت نہیں دیتا! طبیعتوں میں نہ تو ایمان و یقین تھا اور نہ ہی سکون و اطمینان۔ ہر فرد منصب کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جو کچھ بھی کسی کے راستے میں حائل ہوتا وہ اُسے اکھاڑ پھینکنے کی ناک میں لگا رہتا۔

مختصر یہ کہ اس دنیا میں کون و فساد کی بنیاد ہی نقلِ جوش ہو کر تھی ہے خواہ وہ کسی رنگ میں ہو اور یہی وجہ فتنہٴ اعتزال کی تھی۔ بات کیا تھی ایک منوانا چاہتا تھا دوسرا ماننے کو تیار نہ تھا، جبر و اختیار سے دونوں ہی ناواقف تھے، یا یوں کہہ لیجئے دونوں آشنا تھے مگر ہر ایک ہی سمجھتا تھا کہ دوسرا فریق غلط راستے پر چلا جا رہا ہے مسئلہ خلقِ قرآن میں دونوں درست تھے۔ اسلامی اصولِ اعتدال کسی نے بھی اختیار نہ کیا۔ حکومت ایک فریق کے ساتھ تھی وہ دوسرے پر چڑھ گیا، اگر دونوں نے خاموشی اختیار کر لی ہوتی تو بات کچھ بھی نہ بنتی!!

گذشتہ زمانے میں جب یہ اختلافات شروع ہوئے تو عوام میں یہ باتیں ابھی شعور کی سطح پر تھیں جہاں سے انھیں بخوبی نکالا جاسکتا تھا مگر اب یہ تاثرات تحت الشعور کی گہری داویوں میں پہنچ کر قیام کر چکے ہیں جہاں سے نکالنا انھیں کوئی آسان کام نہیں اس وقت ہم انھیں باقاعدہ حجاب کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

غرض کہ یہ نقلِ جوش زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ اب اگر ہم نفسیاتی دنیا کے افادی پہلو کا جائزہ لیں تو دو چیزیں ہمیں بخوبی نظر آتی ہیں جن پر ہم قابو پا کر زندگی کو سہل بنا سکتے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) احساسِ کمتری *Inferiority Complex*.

(۲) نقلِ جوش *Transference of Emotion*.

ہم نے علمی دنیا میں ان دونوں حقیقتوں کا کسی قدر جائزہ لے لیا ہے۔ اب ہم اس حقیقت کا جائزہ ذرا تفصیل کے ساتھ خوابی دنیا میں بھی لینا چاہتے ہیں خوابی دنیا میں ہم خیالی دنیا کو بھی شامل

سمجھتے ہیں جسے آئندہ واضح کیا جائے گا۔ انسان نصف سے زائد عمر سو کر اور سوچ کر گزار دیتا ہے تو کیا پھر یہ نصف حصہ انسان کی عمر کا ضائع ہو جاتا ہے؟ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس نصف عمر میں انسانی زندگی کا افادی پہلو کس طرح جدوجہد جاری رکھتا ہے اور یہ علی دنیا کے ساتھ کس طرح وابستہ ہے۔ ہم خوابوں کی تعبیر کے علم میں پڑنا نہیں چاہتے محض اس بات کی وضاحت کریں گے کہ خواب و خیال کا اثر علی زندگی پر کیسے، اور علی زندگی کا خواب و خیال پر کس طرح ہوتا ہے خوابوں کی تعبیر کا علم کوئی مستقل علم نہیں ہے جس کو اس وقت تک علمی حیثیت سے ترتیب دیا گیا ہو۔ البتہ ایک خاص قسم کا ملکہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ عطا کر دے۔ اشاری تعبیرات (Symbolical Interpretations) جدید نفسیات کی ایجاد ہیں۔ البتہ جدید نفسیات میں ان کی نوعیت ایک جنسیت اختیار کر گئی ہے۔ ہم اس سے متعلق آئندہ صفحات میں انشا اللہ تعالیٰ بالتفصیل کچھ عرض کریں گے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علی دنیا میں احساس کمتری انسان کے اندر ایک ایسا نصب العین (Ideal) قائم کر دیتا ہے جو اس کی پہنچ سے بہت بالا تر ہوتا ہے۔ یہ بھی قطعی امر ہے کہ ہر شخص ایک نصب العین رکھتا ہے مگر ہر ایک کا نصب العین ناممکن الحصول نہیں ہوتا۔ اکثر یہ نصب العین انسان کی پہنچ کے اندر ہوتا ہے اور اس کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ اگرچہ حالات کے مطابق اس میں ترمیم ہوتی رہتی ہے اور نصب العین کا افادی پہلو بھی یہی ہے کہ اس میں بتدریج ترقی ہوتی رہے۔ اگر نصب العین میں ترقی کی گنجائش نہیں اور وہ ایک جگہ پر قائم ہے یا وہ بجائے ترقی کے پیچھے کی طرف ہٹتا ہے تو یقیناً ایسا نصب العین احساس کمتری پر زندہ ہے۔

ہم نصب العین کو دو حصوں یا درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) فوری نصب العین Immediate Ideal.

(۲) آخری نصب العین Ultimate Ideal.

آخری نصب العین پر انسان فوری نصب العین ہی کے توسط سے پہنچتا ہے۔ اور اگر انسان کا فوری نصب العین موجود نہ ہو تو وہ نصب العین ناممکن الحصول ہوگا اور اس کی بنیاد احساس کمتری پر ہوگی۔ اگر ایک سر باز کا آخری نصب العین سرسنگ بنا ہی تو اس کے نصب العین کو سرداری اور سرگردگی گمراہ اختیار کرنا پڑے گی اگر درمیانی منازل مفقود ہیں تو یہ نصب العین ناممکن الحصول ہے اور خلاف عقل۔ چنانچہ معمولی حالات کے اندر انسان کا نصب العین اس کی استعداد اور دسترس کے مطابق ہوگا۔ ان حالات کے اندر ایک اوسط درجہ کے دماغ کا آدمی اپنا نصب العین بخوبی حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی دسترس سے باہر نہ ہو۔ احساس کمتری کی وجہ سے جس قدر بھی نصب العین قائم ہوتے ہیں وہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کو وہ اکیلا بیٹھ کر خیالی پلاؤ پکا کر پورا کرتا ہے۔ دن میں خواب دیکھنا (Day Dreaming) نفسیات میں اس فعل کو (Wish Fulfilment) یعنی خواہشات کا پورا ہونا کہا جاتا ہے۔

ہم نے ابھی عرض کیا ہے کہ انسان اکیلا بیٹھ کر خیالی پلاؤ پکاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حجابات کی بنا پر ایجو (E و) یعنی انا اپنے گرد و پیش سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے اور اس نئے ماحول کے مطابق وہ اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہے۔ جب انا علیحدگی اختیار کر لیتی ہے تو یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس پر سے تمام حجابات دور ہو جاتے ہیں۔

ہماری نگاہ میں صرفیائے کرام کے چلے اور مراقبہ بھی اسی اصول پر قائم ہیں مگر یہ حالت فقط خیالی و خوابی دنیا ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ اُس عالم تنہائی میں انا اپنے گرد و پیش پر چھا جاتی ہے اور فقط یہاں ہی اُس کے لئے یہ ممکن ہے اپنا وقار قائم رکھے۔ یہ علیحدگی اگر بیداری کے وقت اختیار کر لی جائے تو اس کو ہم نفسیاتی زبان میں (Day Dreaming) یا خیالی پلاؤ کہیں گے جیسا کہ عرض کیا گیا اس حالت میں بھی انسانی حجابات اٹھ جاتے ہیں اور جس رنگ میں بھی وہ اپنے آپ کو

دیکھنا چاہتا وہ دیکھ لیگا۔ یعنی جو کچھ وہ ہے ویسا نہیں، بلکہ جو کچھ وہ چاہتا ہے کہ ہو، اسی رنگ میں دیکھے گا۔ لیکن جب وہ پھر عملی دنیا میں واپس لوٹتا ہے تو اس کے حجابات بدستور اسی طرح قائم ہو جاتے ہیں اور پھر جب یہ خواب کی سی غنودگی دور ہوتی ہے تو وہ ایک مدہوش انسان کی طرح اپنی خیالی دنیا میں پھر محو ہو جاتا ہے۔

اگر ایک دلپسند خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل جائے تو انسان پھر سونے کی کوشش کرتا ہے کہ شاید وہ منظر پھر سامنے آجائے! ایسے فعل کا تکرار بے عملی کا پیش خمیہ ہے کیونکہ وہ اپنا نصب العین دن بھر میں کئی مرتبہ بناتا اور توڑتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان جس کا نصب العین بہت بلند ہوتا ہو اور جو براہ راست اس تک پہنچنا چاہتا ہے تو وہ اسے عملی دنیا میں حاصل نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ ہر وقت اس سے متعلق سوچتا رہتا ہے، اسے سوتے میں بھی اپنے خیالات سے آزادی حاصل نہیں ہوتی، طرح طرح کے خیالات مختلف شکلوں میں خواب میں آتے ہیں۔ گویا ناممکن اھصول چیزیں خواب و خیال میں ممکن اھصول بن جاتی ہیں۔

اس صدی میں اول اول شرر (Schermer) اور فرائد (Freud) نے خوابوں کے متعلق نظریے قائم کئے۔ ایڈلر (Adler) نے بھی ایک مستقل نظریہ قائم کیا۔ ہم ان میں سے اکثر کے نظریوں پر آئندہ صفحات میں جستہ جستہ تنقید کریں گے اور جو حیات ہمارے موضوع کے مطابق ہوگی اس کی تفصیل بھی کر دیں گے۔ ہم نے ابھی لکھا تھا کہ ہماری نگاہ میں خوابوں کی تعبیر کا علم کوئی مستقل علم نہیں جس کو ایک علم کی حیثیت سے ترتیب دیا گیا ہو، اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ پہلو ہی مفقود تھا۔ بلکہ ہمیں مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں کے اندر اس سے متعلق دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کلدانیوں، مصریوں، ہندوؤں، یونانیوں، اور مسلمانوں نے خوابوں کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام نظریوں کو اکٹھا کر کے کسی ایک رات پر پہنچا جائے جو وقت کے مطابق ہو یعنی موجودہ نظریوں سے تطابقت کرے۔ آسمانی صحائف، مثلاً انجیل، تلموذ اور قرآن میں

متعدد جگہ خوابوں کا ذکر ہے۔ تمام الہامی خواب نہیں، تاہم ان میں تعبیر سے انجام کا پتہ دیا گیا ہے اس طرح تعبیر کا علم پیدا ہو سکتا ہے۔

فرائد کا نظریہ تعبیر اگرچہ اشاری (Symbolical) ہے تاہم اس میں جنسی عنصر یعنی (Sexual Element) اس قدر ہے کہ اس نظریہ کو قبول نہیں کیا جاسکتا اور اکثر حالتوں میں توہم نے اسے غلط بھی پایا ہے۔ البتہ اس کا طریقہ تحلیل خواب جو ہے اس کی ترکیب بعض حالات میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ خوابوں کی ترتیب اور ساخت (Arrangement & Structure) کے متعلق فرائد کے نظریے کا دار و مدار جنسی خواہشات پر ہے۔ مختصراً یہ کہ اگر خوابوں کی ترتیب اور ساخت میں افراط و تفریط ہے تو جنسی خواہشات جو بچپن میں اثر پذیر ہو چکی ہیں ان کی تکمیل نہیں ہوئی ہوتی۔ ایڈلر (Adler) اور یونگ (Jung) کو اس سے اتفاق نہیں۔ اگرچہ الہامی خواب کے وہ بھی قائل نہیں۔ بہر حال ان دونوں نظریوں کے مطابق خوابوں کی تعبیر کو اشاری ضرور ہونا چاہئے مگر اس میں جنسی عنصر کو دخل نہیں ہونا چاہئے۔ ہم آئندہ صفحات میں اشاری تعبیر کی ایک مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے دیں گے کہ یہ امر واضح ہو جائے۔

الہامی خواب (Prophetic Dream) سے یہ مراد ہے کہ خواب کو تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی جس طرح کہ خواب دیکھا جائے وہ بعینہ اسی طرح واقعہ ہو جاتا ہے۔ ایڈلر ایسے خوابوں سے اتفاق نہیں رکھتا بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ اکثر خواب انسان کی مخفی قوتوں کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں جن کا انحصار مختلف حجابات اور تاثرات پر ہوتا ہے ہمیں اس حد تک اس سے اتفاق ہے مگر جہاں تک الہامی خوابوں کا تعلق ہے ہم ان سے متفق نہیں ہیں، ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ماہرین نفسیات الہامی خوابوں سے کس طرح انکار کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں انسانی زندگی کا طور و طریقہ تماماً اس قسم کا ہے کہ اس سے آسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ انسان کو مستقبل کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں یا حاصل

ہو سکتی ہیں۔ جب انسانی سیرت یعنی حرکات و سکنات کو سمجھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس کے مستقبل کے متعلق معلومات ہم پہنچائی جاسکتی ہیں تو پھر خوابوں کے درلئے ایسے الہام کیوں بعید از عقل معلوم ہوں؟ ہمارے افعال و حرکات اس نوعیت کے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں مستقبل کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہے۔ زندگی کے شکوک و شبہات (Doubts) کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم مستقبل کو بھانپ کر اپنا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم فیصلوں کو بھی اسی لئے ملتوی کر دیتے ہیں کہ ہمیں مستقبل کے متعلق غیر شعوری طور پر معلومات ہوتی ہیں اور ہم ایک مناسب وقت کی تاک میں ہوتے ہیں مگر یہ سب کچھ الہام نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم ہر بات کو صبح کی تیاری کر کے سو جاتے ہیں مگر ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کل دن چڑھے گا بھی یا نہیں! باوجود اس کے ہم غیر شعوری طور پر تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہاں ہمارے علم کی نوعیت مختلف ہے۔ اور اس علم کا وجود ہمارے شعور میں موجود نہیں ہوتا۔ مگر اس حقیقت سے کیسے انکار ہو کہ علم تو موجود ہے۔

ہم الہام کے ثبوت میں کئی مثالیں دے سکتے ہیں مگر کیا حاصل، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر علماء غریب الہام کے نظریے کو مان لیں تو ایک روز انھیں وحی و نبوت کا بھی اقرار کرنا پڑے گا! ہم آخریں یہاں ایک پاراولو (Paravolu) کا مختصر سا تجربہ بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ سائنس کے مطابق بھی الہام کی حقیقت کا ثبوت پیش کر دیں۔

پاراولو ایک پاروسکی سائنسداں تھا جس نے یہ تجربہ کیا کہ جب حیوانات کو خوراک دینے کا وقت آتا ہے تو ان کے معدے میں چند ایک اہم لعاب اُترنے شروع ہو جاتے ہیں جو باضمہ کے لئے مفید ہوتے ہیں یہ لعاب خود بخود معدے میں اُتر آتے ہیں گویا معدے کو بہتری سے معلوم تھا کہ خوراک آرہی ہے۔ ... علمائے نفسیات الہام کی حقیقت کا تو اعتراف کرنا پسند نہ کرتے تھے، بچاؤ کی صورت اختیار کی کہ اُسے ایک ایسا فعل اضطراری قرار دیا جو تجربہ کی بنا پر قائم ہوتا ہے اور اس کا نام رکھ دیا (Conditioned Reflex)۔

ہمارے نزدیک الہام بھی ایک ایسا ہی فعل اضطراری ہے جو تجربہ کی بنا پر حاصل ہوتا ہے اور یہ فعل ہر ایک سے سرزد ہو سکتا ہے اور اس کی نوعیت تجربہ پر منحصر ہوگی۔ لہذا اس کے غلط ہونے کا بھی امکان ہے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تو پھر اگر حیوانات کو بذریعہ الہام معلومات بہم پہنچ سکتی ہیں تو انسان کے بارے میں کیوں اس قدر تعجب ہو جو اشرف المخلوقات بھی ہے اور احسن التقویم بھی! ہم خوب جانتے ہیں کہ ماہر نفسیات کو اس حقیقت کا احساس ہے لیکن اگر وہ اس کا اعتراف کر لیں تو ان کا ایک بہت بڑا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ حقیقت بہر حال حقیقت ہی رہے گی اور انہیں ایک روز ماننا پڑے گا کہ الہامی خواب بھی ایک حقیقت ہیں!

اکثر خوابوں کا موضوع اور ان کی ترکیب خود انسان کے خیالات یا اس کی خواہشات کی پیدا کردہ ہوتی ہے وہ جو چاہتا ہے خود اپنے آپ کو خواب میں دیکھا سکتا ہے بعینہ اسی طرح جیسے خیالی پلاؤ خود ہی پکالیتا ہے۔ انسان کا صورت حال اس بات کا مقتضی ہوتا ہے کہ اسے خیالات و خواہشات کے متعلق جواب ملے۔ یہ جواب اس کو خواب کی شکل میں نمودار ہو کر دکھائی دیتا ہے جس کی تعبیر کا وہ اہل نہیں ہوتا مگر وہ اپنی کیفیت کے مطابق اس کی تعبیر کر کے اپنے دل کو تسکین دیتا ہے اور اگر وہ خواب کی تعبیر کسی دوسرے سے پوچھے جو اس کی مرضی کے خلاف تعبیر بتائے تو اسے تلخ اور ناگوار گذرتی ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے خواب کی تصویر پر جو نقش و نگار ہوتے ہیں وہ حجابات اور دیگر ذہنی علامات کے مطابق ترتیب پاتے ہیں جس میں خواب دیکھنے والے کا نصب العین پنہاں ہوتا ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ نصب العین حجابات پر مبنی ہوتا ہے اور اسی پر انسان کی شخصیت کا دار و مدار ہے۔ اگر اس عکس کی جڑی تحلیل کی جائے تو ہمیں ہر حصے میں ایک حجاب نظر آئے گا۔ مجموعی طور پر یہ عکس نصب العین کی تائید کرے گا گویا انسانی فطرت اس کو غیر شعوری طور پر مجبور کرتی ہے کہ وہ نصب العین کی تکمیل کے لئے ایک ایسا ذریعہ اختیار کرے جو اس کی خواہشات کے بالکل مطابق ہو۔ عملی دنیا میں

یہ ناممکن ہے لہذا خواب کے اندر اس کی تکمیل باسانی ہو جاتی ہے۔

فرانڈ اور ایڈلر کے نظریوں کے مطابق جو خواہشات عملی دنیا میں نامکمل رہ جاتے ہیں ان کا اظہار و تکمیل خواب کی زبان کرتی ہے، ہمیں اس سے قدرے اختلاف ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خواب کی زبان (Dream Language) بذات خود دھندلی ہوتی ہے، یا ہماری اصطلاح میں خواب کا عکس دھندلا ہوتا ہے۔ کیونکہ بااوقات جو معنی خیز جزو ہوتے ہیں یا تو وہ بھول جاتے ہیں اور یا پھر ادا نہ ہو سکتے جاتے ہیں، کیونکہ ان سے شخصیت کے حجابات کا انکشاف ہو جاتا ہے۔

ہمارے فکر کے مطابق خواب ایک دھوئیں کی مانند ہے جو صرف یہی بتاتا ہے کہ ہوا (حجابات) کا رخ کس طرف ہے۔ البتہ دھواں یہ بھی ظاہر کر دیتا ہے کہ ایک آگ موجود ہے اور وہ کہاں ہے! یہ مقام عکس کے جزو سے معلوم ہو جاتا ہے اور جب آگ کا مقام معلوم ہو گیا تو ہم بذریعہ استخراج و ثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی چیز جل رہی ہے! دھوئیں کو آپ غبار یا جوش سمجھئے اور آگ کو حجاب!! حجاب کا جو کھچاؤ ہم نے گذشتہ مقالے میں بیان کیا تھا بعینہ اسی طرح غبار اور جوش کا ایک کھچاؤ ہوتا ہے۔ عملی دنیا کا جوش خواب میں ظاہر ہو کر مختلف صورتیں اختیار کر لیتا ہے اور ہر صورت کا ایک مطلب ہوتا ہے جسے اس کی تعبیر کہتے ہیں۔ اگر ہم خواب کے مختلف حصوں کو علیحدہ کر کے ان سے متعلق خواب دیکھنے والے سوالات کریں تو ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہر حصے کی آڑ میں ایک حجاب پنہاں ہے جو ایک خوفناک قوت کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے اور اپنے مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس میں اس کی ایجو یا انا کو بہت دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ عملی دنیا میں بیدار ہو چکی ہوتی ہے اور اگر عملی دنیا میں انسان فوق الانا یعنی (Super Ego) تک رسائی حاصل کر چکا ہو تو اس کا رابطہ ایک ایسی قوت سے قائم ہو جاتا ہے جو اُس ہر قسم کی خبروں سے متنبہ کرتی رہتی ہے اور اسے خواب میں پیش از وقت مستقبل کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ ہم اسے الہامی خواب کہتے ہیں۔

جب ہم سے ایک شخص اپنا خواب بیان کرتا ہے تو ہمیں اس کے بیان میں اس کی زندگی کا ایک غیر شعوری خاکہ نظر آتا ہے (Unconscious Life Plan) اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو غیر محفوظ سمجھتا ہے کیونکہ اس کے ذاتی تحفظ کے نشانات جا بجا خلع کے پرنظر پڑتے ہیں۔ ہم اس سے انسان کے تعلقات اور اس کے طرز زندگی کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں۔ یہ تمام اثرات ذہن انسانی میں گھمکتے رہتے ہیں تاکہ وہ اس کا حل معلوم کر سکیں۔ لیکن چونکہ علی دنیا سے یہ چیز یا جدوجہد خیالی یا نوابی دنیا میں آچکی ہوتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ شعور سے غیر شعور میں چلی آتی ہے اس طرح اس کا انجام خواب و خیال میں ظاہر ہوتا ہے۔ عملی لحاظ سے پھر یہ چیز بے کار ہو جاتی ہے۔

ہم نے فرآئڈ کے نظریے کے متعلق تھوڑا بہت جو کچھ لکھا ہے وہ بھی سنبھل سنبھل کر لکھا ہے ہمارے نزدیک فرآئڈ کی نفسیات میں افادیت کا پہلو یک قلم ناپید ہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ فرآئڈ کو دنیا کی ہر چیز میں جنسی جھلک نظر آتی ہے ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرآئڈ خود ایک جنسی حجاب (Sexual Complex) میں گرفتار تھا اور اس پر اس نے آخر دم تک قابو نہ پایا، باوجودیکہ تحلیل نفسی کا ماہر تھا! ہمیں ذاتی طور پر اس کی زندگی کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں ورنہ بہت ممکن ہے کہ اس کے بچپن کے زمانے میں اس قسم کے اثرات نمایاں ہوں اور ہم اس کی زندگی کی تحلیل نفسی خود اس ہی کے نظریوں کے مطابق کر کے ثابت کرتے کہ وہ بذات خود جنسی حجابات کا شکار تھا۔

البتہ ایک بات روز روشن کی طرح صاف نظر آرہی ہے اور وہ یہ کہ فرآئڈ ایک جرمن یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو جرمنی حکومت کے مختلف دوروں سے گذرا۔ جرمن یہودیوں کا اخلاق جرمنوں نے بہت پست کر دیا تھا، اول تو یہودیوں کا اخلاق ویسے ہی پست ہوتا ہے۔ جرمنوں کا جنسی رویہ یہودیوں کے ساتھ کچھ نامناسب تھا۔ ہمیں تاریخ بھی بتاتی ہے اور ہم نے اس جنگ کے دوران میں بھی یہ اکثر سنا، غالباً انہی تاثرات کے ماتحت فرآئڈ نے اپنا نفسیاتی نقطہ نگاہ جنسیات پر پرکھا،

ورنہ فرائنڈ کے استادوں میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ تھی جس نے ہٹلر کو مجبور کیا کہ وہ فرائنڈ کی تمام کتابیں تباہ کر دے۔ ایک تو وہ اس کے قوم کے اخلاق کو پست کر رہی تھیں۔ دوسرے ان میں جرموں کی کرتوتوں کی جھلک تھی۔ تیسرے اس میں افادی پہلو منقود تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یورپ میں فرائنڈ کی نسیات ایڈلر اور ٹینگ سے بڑھ کر ہر دل عزیز تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب اقوام کا اخلاق پست ہو جاتا ہے تو ان کی ہر بات میں جنسیات دخل انداز ہوتی ہیں، یہ قوم کی پستی کی علامت ہے۔

آپ ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں کے فدا جید ترقی پسند اردو ادب کو ملاحظہ فرمائیے۔ بڑے بڑے ترقی پسند ادیب آپ کو یہاں ملیں گے جو اس بات پر ناز کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو ادب پر بہت احسان کیا ہے جو فرائنڈ کی جنسیات اس میں داخل کر دی ہیں۔ اپنے آپ کو وہ ترجانِ حقیقت کہتے ہیں مگر کج بحث یہ نہیں سمجھتے کہ اپنے حجابات کو بے حجاب کر رہے ہیں وہ افسانے لکھ کر لطف لیتے ہیں کیونکہ ان کی عملی زندگی میں وہ لطف ناپید ہے اپنے حق میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ ایک قدرتی امر ہے اور ہم مجبور ہیں۔ کیونکہ جب قوم کا اخلاق پست ہوتا ہے تو ایسی باتیں ابھر آتی ہیں۔ اللہ اکبر و انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گویا اپنی کمزوری کو بھی مانتے ہیں مگر اپنی مجبوریوں کو ایک ایسی آڑ دیتے ہیں کہ خود بری ہو جائیں، دوسرے الفاظ میں زمانے کو برا بھلا کہا اور اپنے سر سے الزام اٹھا دیا۔ سمجھ میں نہیں نہیں آتا کہ ایسے فعل میں کیا کمال ہے؟

درحقیقت ان لوگوں کی زندگیوں کے تجربات نے ان کے اندر اتنے حجاب پیدا نہیں کئے جس قدر فرائنڈ کے پڑھنے سے ہو گئے ہیں اور پھر زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس قدر بھی یہ جدید ادب کے پرستار اور ترقی پسند ادیب ہیں یہ اپنے آپ کو اشتراکیت پسند کہتے ہیں! بسیں تفاوتِ راہ از کجاست تا کجا!! حالانکہ اشتراکیت افادیت پسند ہے اور یہ فرائنڈ کے غلام افادیت سے دور بھٹکے ہوئے ہیں

اپنا تعلق کسی مذہب سے ثابت نہیں کرنا چاہتے کیونکہ پھر ان کی عربیائی ہر داشت نہیں کی جاسکتی۔ کوئی انہیں نزدیک نہیں بٹھکنے دیتا اور یہی وجہ ہے کہ اب عوام کا رویہ اُن کے لئے ایک حجاب بن کر نقلِ جوش میں اظہار کر رہا ہے اور وہ ان کی لائندہیت ہے۔ زمانہ بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی، جو خود نہ سمجھو اُسے زمانے کی ٹھوکر سکھا دیتی ہے۔

آسمانی صحائف اور احادیث سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ خواب دو قسم کے بیان کئے گئے ہیں۔ تیسری قسم جس کا ذکر جدید ماہرینِ نفسیات کرتے ہیں، اس کا ذکر موجود نہیں۔ یہ دو قسمیں جو میں تو ان میں سے ایک کو ہم الہامی خواب کہہ سکتے ہیں اور دوسرے وہ خواب جن کے سمجھنے کے لئے تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ الہامی خواب بعینہ اسی طرح واقع ہوتا ہے جیسے دیکھا جاتا ہے۔ اور اس میں تعبیر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ان کو رویائے صالح کہہ لیجئے یا کشفِ روحانی۔ ہم یہاں ہر دو کی مثال احادیث سے دینا چاہتے ہیں اور بعد میں پھر ان ہی سے متعلق نفسیاتی رنگ میں ان کی تعبیر کے دلائل پیش کریں گے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ان حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا
النبي صلى الله عليه وسلم قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم في المنام في ليلة
كانت امرأة سوداء تائزاة الرأس كالي پریشان بالوں والی عورت دیکھی جو مدینہ
خرجت من المدينة حتى قامت بهيعة سے نکل کر ححفہ میں جا ٹھہری ہے تو میں نے
وهي الحففة فادلت ان وباء المدينة اس کی یہ تعبیر کی ہے کہ مدینہ کی وبا وہاں
ينقل اليها۔ بھیجی گئی ہے۔

ہم اب کوشش کرتے ہیں کہ خوابوں کی جدید نفسیاتی تعبیر کے اصولوں کے مطابق اس حدیث کا جائزہ لیں۔ یہ خواب ظاہر ہے کشفِ روحانی یا رویائے صالح نہیں بلکہ ایک عام خواب ہے جس کے سمجھنے کے لئے تعبیر درکار ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیر خود ہی فرمائی۔

ہم لکھ چکے ہیں فرائنڈ اور رائڈ لری کے اصول تعبیر کے مطابق تعبیر اشاری یعنی (- Symbolical Interpretation) ہوا کرتی ہے۔ خواب کے ہر جزو یا حصہ کی مناسبت ایک خاص بات سے قائم کر لی جاتی ہے جو زیادہ موزوں معلوم ہو۔ مگر اس اصول کے لئے کوئی خاص قانون موجود نہیں تاہم یہ معتبر پر منحصر ہے کہ وہ شخص کے لئے کیا پسند کرتا ہے۔ مندرجہ خواب کو ہم اس کے مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے چار حصے ہیں جو اصول تعبیر کے مطابق بہت اہم ہیں اور وہ حصے یہ ہیں

۱۔ عورت

۲۔ سیاہ رنگ

۳۔ پریشان حالی

۴۔ حرکت و قیام

خواب میں عورت زندگی کی علامت ہے اگر صحیح و سالم ہو۔ اگر اس میں ذرا بھی نقص پیدا ہوگا تو تو زندگی کا مناسب پہلو بگڑا ہوا ہوگا۔ اس کا سیاہ رنگ اس کا مصیبت زدہ ہونا ظاہر کرتا ہے اور اس کا اضطراب یعنی بالوں کی پریشانی اس امر کی تصدیق کرتا ہے اس کا حرکت و قیام اس عارضے یا مصیبت کی نقل ظاہر کرتا ہے۔ عورت اگر خواب میں پریشان نظر آئے تو جدید نفیات کے مطابق بیماری ظاہر کرتی ہے۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا ہم نے کچھلی کسی قسط میں فرائنڈ کے عمل تحلیل نفسی کی ایک مثال دی تھی اس میں جس شخص کی تحلیل کی گئی تھی اس کا پہلا خیال جو اس نے فرائنڈ پر ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ ایک حسین عورت بلغ میں چلائی ہوئی اس کے پیچھے گھبرائی ہوئی بھاگ رہی ہے۔ اور اس خیال سے متعلق جو کچھ فرائنڈ نے کہا وہ یہ تھا کہ اس کی بیوی ایک ایسے عارضہ میں لاحق ہے جس کی وجہ حیض کے دنوں میں درد ہوتا ہے یعنی اس کو (Dysmenorrhoea) کا مرض تھا۔ تو گویا اس مثال میں بھی عورت کی پریشانی حالی بیماری ہی ظاہر کرتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک میں عورت حسین ہے اور دوسری میں سیاہ قام ہے اور

دوسرا فرق یہ ہے کہ ایک خواب ہے اور دوسرا خیال تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ خواب و خیال میں نفسیاتی لحاظ سے بہت کم فرق ہوتا ہے ایک کو Day Dreaming اور دوسرے کو Night Dreaming کہہ سکتے ہیں اب حدیث کا آخری حصہ حرکت و قیام ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہاں دینہ سے نکل کر حجبہ میں پہنچ گئی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارے اصول تعبیر کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر درست ہو بلکہ زیادہ مناسب یہ ہوگا اگر ہم ایسا کہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول تعبیری کے مطابق ہماری تعبیر ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ احادیث میں نفسیات کوٹ کوٹ کر بھری پڑی ہیں اور ان کے لئے ایک بہت گہرا نفسیاتی مطالعہ درکار ہے۔ ہماری نگاہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اس وقت تک دنیا میں کوئی بھی ماہر نفسیات پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا۔ آپ کی زندگی کے روزمرہ کے واقعات اس امر کی روشن دلیل ہیں آپ کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں اور یہ مصلحت ہی زندگی کا افادی پہلو ہے۔

اس قسم کی تعبیر انسان کے ذاتی مشاہدہ اور علم پر مبنی ہوتی ہے بعض لوگ خواب کے معانی واقعہ پیش آنے سے پہلے پا جاتے ہیں اور بعض کو اس کا احساس صرف اس وقت ہوتا ہے جبکہ واقعہ پیش آجاتا ہے۔ مثلاً ہم سے ایک مرتبہ ہمارے عم محترم نے بیان کیا کہ وہ سو رہے تھے اور کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے افق پر سرخ رنگ کے بادل کبھی ابھرتے ہیں اور کبھی اترتے ہیں۔ اتنے میں کسی نے ان کو بلا کر اٹھا دیا اور وہ جاگ اٹھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھانجا ان سے کہہ رہا ہے کہ جلدی گھر چلے تڑپا (اس کی چھوٹی بہن تھی) کی نبض کبھی بند ہو جاتی ہے اور کبھی چل پڑتی ہے اور وہ مرنے کے قریب ہو گئی ہے اس خواب کو ہم الہامی خواب نہیں کہہ سکتے کیونکہ مزید تعبیر چاہتی ہے۔ اگرچہ تعبیر انھیں خود بخود فوراً ہی معلوم ہو گئی۔

(باقی آئندہ)

تصحیح :- گذشتہ اشاعت میں جناب مہر صاحب کی غزل "فردوس خیال" کا ایک مصرعہ

افسوس ہو کہ غلط چھپ گیا تھا صحیح شعر یہ ہے

گرچہ شبنم سے پھولوں کو سہارا مل گیا آنسوؤں نے پھونک دی گلشن میں بوج تازگی

دستور الفصاحت اس کی ترتیب اور حواشی پر ایک تنقیدی نظر

از

محترمہ آمنہ خاتون ایم۔ اے لکچرر فارسی و اردو مہارانی کالج میسور

اردو زبان کے قواعد پر قدمائے جود و چار کتابیں لکھی ہیں ان میں میر انشا اللہ خاں انشا کی درپائے لطافت کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اُس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔ حالانکہ اسی زمانہ میں سید احمد علی بیکتا لکھنوی نے دستور الفصاحت کے نام سے اسی موضوع پر جو کتاب لکھی تھی وہ انشا کی کتاب کی طرح دلچسپ نہ تھی۔ بہر حال فنی افادی حیثیت سے کسی طرح بھی اس سے کم نہیں کہی جاسکتی۔

اس کتاب کے شروع میں مصنف نے اردو زبان کی پیدائش ترقی اور اس کی وسعت سے بحث کی ہے۔ پھر چند ابواب اور ذیلی عنوانات کے ماتحت صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، عروض اور قافیہ کے قواعد و ضوابط بیان کئے ہیں۔ خاتمہ میں ۳۵ ایسے شاعروں کا ذکر ہے جن کے اشعار کتاب کے اندر بطور سند پیش کئے گئے ہیں لیکن اپنی اس افادیت اور اہمیت کے باوجود اس کتاب کی گمشدگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں تھے۔ خوش قسمتی سے مئی ۱۹۳۹ء میں اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ عالیہ رامپور کے لئے خرید کیا گیا اور کتاب خانہ کے ناظم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کتاب کا مقدمہ اور خاتمہ اپنی تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کر کے اس خزانہ کو اربابِ ذوق کے لئے عام کر دیا۔ علاوہ

تفصیح و تحشیہ کے موصوف نے ایک نہایت فاضلانہ اور مفید و پراز معلومات مقدمہ بھی لکھا ہے جو عام ارباب ذوق اور تاریخ ادب اردو کے طلباء کے لئے خاص طور پر بڑے کام کی چیز ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی کتاب کی ترتیب اور اس کے حواشی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

چونکہ ہمارے اس مقالہ کا خطاب براہ راست کتاب کے فاضل مرتب سے ہے اس بنا پر ضمیر غائب استعمال کرنے کی بجائے ہم نے جگہ جگہ ”آپ“ لکھا ہے۔

دیباچہ مصحح

داوین میں جو عبارتیں ہیں وہ دستور الفصاحت کی ہیں اور لقیہ الفاظ میرے اپنے مخطوطے کے جملہ ورقوں کی تفصیل یوں لکھی ہے مثلاً

شروع کے فاضل + درمیان کے اہل + آخر کے فاضل

۲ + ۲۱۹ + ۱ = ۲۲۲ جملہ ورق

مثلاً ”ورق ۳ ب سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے“ حالانکہ کتاب کا آغاز ۳ الف سے ہوا ہے۔
مثلاً ”اسی قلم سے ورق ۲۲۱ ب میں قطعہ تاریخ کے مادے کے اوپر اعداد ۱۲۲۹ لکھے گئے ہیں“ اور متن مطبوعہ میں مندرج ہندسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی ۲۲۱ ب صحیح ہے لیکن دیباچے کے ضا کی پہلی سطر میں خاتے کے ختم کے ہندسے ۲۱۹ ب لکھے ہیں ”خاتمہ (ورق ۱۸۷ الف - ۲۱۹ ب)“ یہ کمپوزنگ کی معمولی غلطیاں ہیں۔

مخطوطے میں | ”ورق اب اور ۲ الف پر کتاب کا تھوڑا سا دیباچہ نقل کیا گیا ہے“ اس سے مفہوم مختلف تحریریں ہوتا ہے کہ کتاب کا جو اہل دیباچہ ۳ الف سے شروع ہوا ہے (سب صیغہ عبودیت) اسی کا تقریباً ڈیڑھ صفحہ فاضل اوراق پر نقل کیا گیا ہے۔ اگر یہ دیباچہ اہل دیباچے سے مختلف ہوتا تو آپ لکھتے کہ ایک ”ادھورا“ دیباچہ“ لکھا ہے۔ بہر حال اس کی صراحت ضروری ہے اور مخطوطے میں اس

تھوڑے سے دیا چے کے بعد دو قطعے لکھے ہیں اور ان کے نیچے لکھا ہے "کاتب الحروف ہندہ شیخ دلاور علی بہاری بمقام موتیہاری" جس طرح آپ نے اکبر پور کا محل وقوع لکھا ہے (مک) اسی طرح اگر موتیہاری کا محل وقوع بھی تحریر فرماتے تو قارئین کو واقعات کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی۔

ص ۱۳ "آخر میں کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے "الکاتب الخاتمہ ہدایت علی الموبانی" مگر یہ صرف خاتمہ کتاب کا کاتب معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائی ابواب کے کاتب کا نام مذکور نہیں ہے۔ غالباً وہ شیخ دلاور علی بہاری ہوگا۔"

میری رائے میں اگر دلاور علی ابتدائی ابواب کا کاتب ہوتا تو اس کا نام خاتمے سے پہلے ص ۱۸ پر لکھا ہوتا کیونکہ جو شخص ڈیڑھ صفحہ اور دو قطعے لکھنے کے بعد اپنا نام لکھنا ضروری سمجھے وہ ص ۱۸ پر لکھنے کے بعد ضرور اپنا نام لکھتا یا اگر دلاور علی کی تحریر اصل کتاب کی تحریر سے ملتی ہو تو وہی اس کا کاتب قرار دیا جاسکتا ہے اور جب آپ نے لکھا ہے کہ موبانی صرف خاتمہ کتاب کا کاتب معلوم ہوتا ہے تو خاتمے کی تحریر اصل کتاب کی تحریر سے ضرور مختلف ہوگی۔

ص ۱۲ "پہلے صفحے پر سیاہ مربع مہر ہے۔ مہر کے اندر "اللہ حافظ مہر کتاب خانہ محمد مردان علی خان رعنا ۱۲۸۲ھ" منقوش ہے۔"

ص ۱۳ "الف کے بائیں گوشے میں مولفہ نے ۱۲۴۹ھ از تالیف سید احمد علی یکتا لکھنوی" غالباً یہ رعنا کے قلم کی تحریر ہے اسی قلم سے ورق ۲۲۱ ب میں قطعہ تاریخ کے مادے کے اوپر اعداد ۱۲۴۹ لکھے گئے ہیں" ص ۱۲۵ ورق ۱۴۲ الف کے حاشیوں پر جو ترمیم و اضافہ ہوا ہے وہ آپ کی رائے میں یکتا کے قلم سے ہے۔

ص ۱۵ "آخر میں ایک ورق منضم ہے جس پر چٹنی کا ایک نسخہ جناب حکیم سید احمد علی خاں صاحب قبلہ" کا تجویز کیا ہوا درج ہے۔"

خلاصہ یہ کتاب تک مخطوط کی مختلف تحریروں کے جو کاتب آپ نے معین کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اب-۲ الف تھوڑا سا دیا چہ مع دو قطعات کاتب شیخ دلاور علی بہاری بمقام موتیہاری۔

(۲) ۳ الف - ۱۸۷ الف - ابتدائی ابواب کاتب شیخ دلاور علی۔

(۳) ورق ۴۵ اب اور ورق ۱۷۲ الف پتر مریم و اضافہ بشرطیکہ حاشیے کا خط من کے خط سے نہ ملتا ہو کاتب یکتا

(۴) ۱۸۷ الف - ۲۱۹ ب خاتمہ کاتب ہدایت علی موہانی

(۵) ۳ الف اور ۲۱۹ ب کاتب غالباً رعنا۔

(۶) ۲۲۲ الف چٹنی کا نسخہ کاتب نامعلوم

ان تحریروں کے پیش نظر آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے:-

۱۵ سطر ۲ - ۱۰ "میرا خیال ہے کہ ہمارا نسخہ (ج) مصنف کے اس نسخے (۱) کی نقل ہے

(ب) جو رمضان علی لکھنوی نے تیار کیا تھا۔ یعنی کیا ۲ نے پہلے ایک مسودہ لکھا اس کو آگئے۔ پھر اس کو

رمضان علی نے نقل کیا۔ اس کو ب کہئے۔ اب جو نسخہ آپ کے پیش نظر ہے وہ ب کی نقل ہے۔ اس کو

ج کہئے۔ اور ساری بحث اسی نسخہ ج سے متعلق ہے۔

غالباً اس میں (ب) بعض مقامات مشتبہ رہ گئے تھے جن کے مقابل حاشیے پر مصنف نے اپنا

شک ظاہر کیا تھا "یعنی نسخہ ب کے حاشیوں پر مصنف نے اپنا شک ظاہر کیا تھا یعنی مصنف کی پاس سچی کے

باوجود کہ نظر ثانی کرتے وقت اس کو حسب خاطر درست کرے بعض مقامات مشتبہ رہ گئے تھے۔

"ہمارے نسخے (ج) کے کاتب نے حاشیے کی عبارتوں کو بھی بعینہ نقل کر لیا۔ جب یہ نسخہ (ج)

مصنف نے دیکھا تو حاشیوں کو قلمزد کر کے متن میں ان مقامات کی تصحیح کر دی۔"

یعنی جب نسخہ ج کو جو آپ کے پیش نظر ہے لیکھتا ہے دیکھا تو ان

"نیز اس نظر میں وہ غلطیاں بھی درست کر دیں جو پہلے نسخے کے مطالعے کے وقت خیال میں نہ آئی تھیں

یعنی نسخہ ج کو دیکھتے وقت مصنف نے وہ غلطیاں بھی درست کر دیں جو نسخہ ب کے مطالعہ کے وقت خیال میں نہ آئی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ

(۱) آپ کے پیش نظر جو نسخہ ج ہے وہ یقیناً شیخ رمضان علی کا لکھا ہوا نسخہ ب نہیں ہے۔

(۲) نسخہ ج میں یکتا نے جا بجا اپنے قلم سے اصلاح دی ہے۔

(۳) نسخہ ج میں یکتا نے امکان بھر کوئی غلطی نہ رہنے دی۔

پہلے نتیجہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ آپ کے پیش نظر جو نسخہ ہے اس کے ابتدائی ابواب رمضان علی ہی کے لکھے ہوئے ہیں جیسا کہ یکتا نے لکھا ہے۔

”معنی مباد کہ عرصہ بعید و مدت مدید سیری گردیدہ کہ چہرہ تطیر این مقالہ و گردہ تصویر این

رسالہ بر صغہ وجود نقش گرفته و سالہا سال بسر آمد ہرگز طبیعت متوجہ نشد

کہ نظر ثانی پرداز دیا آں کہ بخوی کہ منظور بود، درست سازد۔ کہ دوستی از دوستان فقیر می

پیشخ رمضان علی سلمہ از باشندگان لکھنؤ کرمیت بہتہ نقلش پرداختند“

رسالے اور مقالے سے مراد صرف ورق ۳ الف سے ۱۸ الف تک ہے اور بخوی کہ منظور بود

درست سازد سے مراد فہرست مضامین و خاتمہ و تصحیح و تحشیہ وغیرہ ہے اور اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے

کہ ہر مصنف کی طرح یکتا نے بھی متعدد مرتبہ مسودے میں کاٹ چھاٹ کی تھی۔ لیکن پھر بھی جیسی کہ چاہئے

تصحیح نہ کر سکا تھا۔ اور آپ بھی نظر ثانی کو نہ سطر ۱۵ میں تسلیم کرتے ہیں۔

یکتا کے اس مسودے میں ورق ۱۴۵ ب پر استفہام تقریری کی بحث میں میر سوز کا یہ شعر

متن کے اندر مذکور تھا ہے

تو جو کہتا ہے گلہ میرا کیا جس تس کئے کب کیا، کس جا کیا، کس وقت، کس دم، کس کئے

اس شعر کے محاذ میں حاشیے پر لکھا تھا ”معلوم باد کہ شعر میر سوز مشتمل بر استفہام انکاری بود از سہو“

در تقریری نوشتہ شدہ“ شیخ رمضان علی نے اس کو جوں کا توں نقل کر لیا۔ اور اس عبارت کے بعد لکھ دیا
”النقل کا الاصل“ چوں کہ کہیں شعر کو بے محل لکھا اور حاشیے پر خواہ مخواہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بیجا
مکلف ہے۔ یکتا نے اس کو بہت مدت کے بعد محسوس کیا اور بیضے میں دونوں عبارتیں کاٹ دیں۔

اگر یکتا پہلے ہی یہ کام کرتا یعنی مسودے میں اس شعر پر یہاں خط کھینچ کر اس کو استغہام تقریری کی
مثال میں لکھ دیتا تو کس قدر رحمت سے بچتا۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ مسودے میں یہ شعر استغہام تقریری کی
بحث میں مذکور تھا۔ رمضان علی نے اس کو عین میں لکھ دیا۔ یکتا نے جب یہ بیضہ دیکھا تو شعر کو کاٹ کر قصہ
چکھنے کی بجائے اس پر ایک نوٹ لکھا، یہ تمام عبارتیں ایک اور کاتب نے نقل کر لیں۔ یعنی ”النقل کا الاصل“
اس دوسرے کاتب نے لکھا ہے اور جب یہ دوسری نقل یکتا نے دیکھی تو اس وقت اس نے وہی کام کیا جو وہ پہلے
ہی کر سکتا تھا یعنی تن میں کا شعر اور حاشیے کا اپنا لکھا ہوا نوٹ اور دوسرے کاتب کا نوٹ سب کو قلم زد
کر دیا۔ جو بات آپ دوسری نقل میں تسلیم کرتے ہیں اس کو پہلی ہی نقل میں تسلیم کر لینے میں کون امر مانع ہو
میرے قیاس میں ورق ۱۷۲ الف پر جو رباعی مسودے میں لکھی تھی اس کو رمضان علی نے ہوہو
نقل کر لیا۔ مصنف نے اس کو قلم زد کر کے دوسری رباعی حاشیے پر لکھ دی۔ اب آپ کے قیاس کے
مطابق اس کی توجیہ یہ ہوگی۔ یکتا نے یہ رباعی مسودے میں لکھی تھی۔ شیخ رمضان علی کے بیضے میں وہ نقل
ہو گئی۔ یکتا نے جب اس بیضے کو دیکھا تو رباعی میں ترمیم کا خیال نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ بیضہ دوبارہ
نقل ہو کر یکتا کے سامنے آیا۔ تب اس نے تن میں کی رباعی پر خط کھینچ کر حاشیے پر اصلاح شدہ رباعی رکھ دی
اگر میرا قیاس درست ہے تو ورق ۱۷۵ ب کے حاشیے پر جو نوٹ ہے اس کا اور تن کا ایک ہی خط
ہونا چاہئے کیونکہ دونوں خط رمضان علی کے ہیں اور تن میں کسی اور جگہ خط نسخ میں کوئی تحریر ہے تو
وہ بھی ”النقل کا الاصل“ کے خط سے ملنا چاہئے۔ لیکن حاشیے کی رباعی کا خط تن کے خط سے ضرور مختلف
ہونا چاہئے کیونکہ یہ یکتا کی تحریر ہے۔

خاتمہ لکھے جانے کے بعد کیتانے اس کو ہدایت علی الموبانی سے لکھوایا۔ پھر یہ کتاب انقلاب زمانہ سے بہار پنچمی۔ اور وہاں سے مراد آباد ہوتی ہوئی رامپور آئی۔ شیخ رمضان علی نے جن وجوہ سے سودے کی نقل کی ہے ان کے پیش نظر یہ بالکل غیر مناسب ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ آخر میں کاتب کی حیثیت سے اپنا نام لکھتا خصوصاً جب کہ مصنف خود احسان ماننے اور اعتراف کرنے کے لئے تیار تھا۔

اب ایک صورت یہ رہ جاتی ہے کہ جانشین پر کی رباعی کا خط تن کی رباعی کے خط سے مختلف نہیں ہے تو دستور الفصاحت کا موجودہ نسخہ نہ شیخ رمضان علی کا لکھا ہوا ہے اور نہ اس میں کہیں کیتانے اپنے ہاتھ سے اصلاحیں دیں ہیں بلکہ کسی کاتب نے رمضان علی کے نسخے کو جس میں کیتا کی اصلاحیں تھیں ہو ہو ہو نقل کر لیا تاکہ اس تصنیف کی ترقی کے مدارج محفوظ رہ جائیں۔ اور مصنف کی اس آرزو کے پیش نظر ہنجوی کہ منظور پورہ درست ساندہ اگر کہیں کہیں تن کے اندر یا حاشیوں میں کتابتی غلطیوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے تاہم تن میں بہت سی املائی غلطیاں باقی ہیں۔ ۱۷۱

تو ماننا پڑتا ہے کہ کیتا کے قول و فعل میں یکسانی نہیں تھی اور وہ کوئی ذمہ دار اور محتاط مصنف یا مصحح نہیں تھا اور اختلاف خطوط کی صورت میں کیتا پر کوئی اعتراض نہیں۔ ایک اور قیاس یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جیسا کہ اشرف علی خاں فناں کے مرتب کردہ انتخاب میں مرزا فاخر مکیں نے ”جا بجا استادوں کے اشعار کو کہیں بے معنی سمجھ کر کاٹ ڈالا، کہیں تیغ اصلاح سے زخمی کر دیا“ تھا (آب حیات ۱۶۵) اور جیسا کہ گلزارِ ابراہیم قلمی کے تن میں مصنف کے سوا کسی اور شخص نے بھی معتد بہ اضافے کئے ہیں (ماخذ حواشی ۱۷۱) ویسا ہی ممکن ہے کہ دستور کے مخطوطے میں بھی کسی نے تصرفات کئے ہوں۔ اس صورت میں جب تک ہمیں کیتا کی کوئی اور تحریر نہ مل جائے یا کسی اصلاح کے نیچے ان کا دستخط نہ ہو۔ ساری قیاس آرائیاں صرف قیاس آرائیاں ہی رہیں گی اور آپ جس تفصیل سے دستور الفصاحت کے مخطوطے کا تعارف کرانا چاہتے ہیں اس کے لئے یہ لازم ہے کہ اس میں جتنے مختلف طرز کے خط ہیں ان کے کاتب معین کرنے کی کوشش کی جائے

تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ مخطوط کن کن کے پاس سے اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا رام پور پہنچا ہے۔
 دستور الفصاحت کے مختلف کاتبوں اور خطوں کی آپ نے جو بحث چھیڑی ہے اس کا قطعی فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نسخہ یا اس کے متعدد عکسی نسخے مختلف نقادوں کے پیش نظر نہ ہوں۔ اب جو کچھ بھی بحث ہو سکتی ہے اس کا انحصار آپ کی تحریر کے اس مفہوم پر ہے جو پڑھنے والے کی سمجھ میں آئے۔ اب اگر آپ کا بیان اس قدر مستقل ہے کہ پڑھنے والا وہی ایک بات سمجھنے پر مجبور ہے جو آپ سمجھانا چاہتے ہیں تو پڑھنے والے کی سمجھ میں بھی وہی بات آئے گی جو آپ نے سمجھی ہے۔ اور اگر عبادت پہلو دار ہو گئی ہے تو پڑھنے والا نہ تو نسخے کی اصل کیفیت ہی سمجھ سکتا ہے اور نہ آپ نے جو سمجھا ہے وہی معلوم کر سکتا ہے یعنی باری بحث کا اصل کتاب سے وہی تعلق ہے جو آپ کی تحریر کا اس سے ہے۔

دستور کے اختتام | ط ۲۲ * ان پانچ شہادتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب سلسلہ ۱۴ اور
 کی تاریخ | سلسلہ ۲۳ کے درمیان تمام ہو چکی تھی " حالانکہ ان کی چار شہادتیں رقتیل
 شاہ نصیر، میر تقی، مرزا جعفر، خاتہ یعنی تذکرۃ الشعراء سے متعلق ہیں اور مقدمے میں جو مرزا جعفر کا نام
 آیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے۔

مقدمہ ۱۲۔ مرزا جعفر کے نام کے بعد مغفور اندلازال دولہ و اقبالہ " لکھا ہے اور کوئی دعا
 قلم زد نہیں اسی صنف پر مرزا حاجی کے نام کے ساتھ دام اقبالہ ہے۔

خاتمہ ۱۱، مرزا جعفر کے نام کے بعد دام اقبالہ اور مغفور و مرحوم ہر اور دام اقبالہ قلم زد ہے۔
 خاتمہ ۱۲ شاہ نصیر کے احوال میں مرزا حاجی کے لئے نہ کوئی القاب ہے نہ کوئی دعا۔ لیکن اس کا اقتباس
 جو آپ نے دیباچہ کے ۲۵ لکھا ہے اس میں " دام اقبالہ " موجود ہے۔

خاتمہ ۱۳ مرزا حاجی کے نام کے بعد دام ظلہ و اقبالہ " اور مرزا جعفر کے نام کے بعد دام اقبالہ " لکھا ہے

خلاصہ یہ کہ مرزا حاجی کی وفات ۱۲۴۵ھ میں ہوئی اور دستور پر نظر ثانی ۱۲۴۹ھ میں، اس لئے ان کے نام کے ساتھ مغفرت کی دعا کیوں کر آسکتی تھی اور جس وقت رمضان علی نے اس کی نقل لکھی مرزا جعفر مرچے تھے اور جہاں کہیں مرزا جعفر کا نام آیا ہے اور جو تعریفی اور توصیفی لفظ استعمال ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان کی زندگی میں لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے سب جگہ ان کی درازی عمر کی دعا آئی ہے اس لئے یا تو سب جگہ دعائے مغفرت لکھی جانی چاہئے تھی یا کہیں نہ لکھی جاتی ماب ایک جگہ دونوں دعائیں بجال ہیں (خاتمہ ص ۱) ایک جگہ صرف دعائے مغفرت بجال ہے (مسئلہ) اور ایک جگہ صرف دعائے زندگی (ص ۱۲) تو یہ سب شیخ رمضان علی کی کتابت اور یکیتا کی تصحیح نقل میں مسامحت کے کرتھے ہیں۔ البتہ جہاں دعائے بقا قلم زد کر کے دعائے مغفرت بڑھائی گئی ہے وہاں خط کے اختلاف سے ان کے لکھنے والوں کا پتہ مل سکتا ہے۔

ص ۲۴ "ان دونوں شہادتوں سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۳ھ سے پہلے تالیف ہو چکی تھی یہ شہاد میں احسن الشربیان اور قائم کے متعلق ہیں اور ان کا تعلق بھی تذکرہ شعرا سے ہے نہ کہ قواعد صرف و نحو و عروض و قافیہ و معانی و بیان و بدیع) اصل کتاب سے۔ اور اس تذکرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کو یکیتا نے ۱۲۱۳ھ سے پہلے ارادی یا غیر ارادی طور پر لکھنا شروع کر دیا تھا اور برابر لکھتا رہا یہاں تک کہ ۱۲۳۱ھ و ۱۲۳۹ھ کے بعد ہی اس کو ختم کر دیا گیا۔ تذکرے میں جن شعرا کا تذکرہ ہے ان کی موت و حیات سے تذکرے کی ابتدا اور انتہا کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

بیان کی وفات اگر ۱۲۱۳ھ میں ہوئی ہے اور تذکرے میں اس کو "تاحال زندہ ماست" لکھا ہے تو اس سے صرف اتنا نتیجہ نکلتا ہے کہ بیان کی وفات اگر ۱۲۱۳ھ میں پہلے قلمبند ہوئی تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جاسکتا ہے کہ اس سنہ میں تذکرہ ہی ختم کر لیا گیا تھا۔ اور پھر ۱۲۱۳ھ کی باہر یہ کہنا کہ "دستور القصاصت" کی تالیف کا کام انشا کی دریائے لطافت سے پہلے (۱۲۲۲ھ)

انجام پاچکا تھا۔ ۲ اور یہ کہ مصنف کی نظر میں دریائے لطافت کا نہ ہونا اس بنا پر تھا کہ یہ ابھی معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ ۳ خود یکتا کے اس جملے کے ہوتے "غواص بحر فصاحت" صاحب دریائے لطافت" ۴ خاتمہ حقیقت سے بعید ہے۔

یکتا کے اس جملے میں دو باتیں اظہر من الشمس ہیں۔ (۱) انشا کا احوال تذکرۃ الشعراء میں ۱۲۲۲ء کے بعد لکھا گیا ہے یا کم از کم یہ ٹکڑا اس سن کے بعد بڑھایا گیا ہے (۲) انشا دریائے لطافت کے مصنف کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہو چکے تھے کہ ان کے نام کے ساتھ اس تصنیف کا ذکر لازمی ہو گیا تھا۔ یکتا کو اتنی بھی رعایت حاصل نہیں ہو سکتی کہ اس نے یہ سن کر کہ یہین الدولہ نے انشا کو قواعد و مصطلحات زبان اردو لکھنے کا حکم دیا ہے۔ خود بھی انھیں مرتب کرنے لگ گیا ہو۔ کیونکہ دستور کا مقدمہ دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یکتا نے دریائے لطافت کے مقدمے اور ردائے اول و دوم و سوم اور بارغ و زر کو فراموش کر کے خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ دریائے لطافت فارسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو کے صفحوں کے حوالے سے چند ہم مطلب مقام درج ذیل ہیں۔ ان کی مطابقت سے ان تصانیف کی تقدیم و تاخیر واضح ہو جائیگی تو اردو کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

متحد مضامین	دستور	دریا
فردوس آرامگاہ	۶	۳۷
سودا	۶	۲۲
مرزا جان جاناں	۶	۱۷
ستی	۷	۳۶
خنجر	۷	۷
تعریف محاورہ و لفظ و تعریف اردو	۹	۳۷
دلی	۹	۲۲۱
سخیل		۲۲۲

پھر بھی اگر حکمتا فرماتے ہیں کہ ”ہیچ کتابی از کتب این فن در نظر نہ ا شتم“ تو اس کی صداقت بھی قائم کے اس قول سے کہ ”الی الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعراء ریختہ کتابی تصنیف نگردیدہ“ ملتی جلتی ہے۔

مد ”ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب میر انشا راشد خاں انشا کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو مرزا قلیل کی مدد سے ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں تمام ہوئی تھی“ مجھے اس جملے کے خط کشیدہ حصے سے اتفاق نہیں۔ دریائے لطافت بلاشبہ من حیث الکل قلیل کی مدد سے لکھی گئی ہے لیکن قواعد اردو اور مصطلحات زبان اردو میں قلیل کا کوئی حصہ نہیں۔ انشانے ازراہ کنفی اپنی فارسی عبارت تک میں اصلاح دینے کا قلیل کو اختیار دیا ہے لیکن وہ اس کے روادار نہیں کہ قلیل قواعد و مصطلحات زبان اردو میں کوئی ادنیٰ سا تصرف بھی کرے مرشد آبادی نسخے کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

* ”ایں ہمہ فرصت بدست نیامد کہ تنہا رنگ بر چہرہ این نقش بدیع کشم مرزا محمد حسین قلیل را

نیز کہ رو کردہ او بے تامل نو کردہ من و پسندیدہ او پسندیدہ این کر ہمر زبان بودہ است

و از صغر سن میا نہ من و اورادر ہر چیز حصہ بردار نہ قرار نہ پذیرفتہ شریک این دولت ابد

مدت ساختم و با ہم چنیں مقرر شد کہ خطبہ کتاب و لغت و محاورہ اردو ہر چہ صحت و سقم

آں باشد و مصطلحات شاہجہاں آباد و علم صرف و نحو این زبان ما را قلم مذنب یعنی کترین

بندہ در گاہ آسماں جاہ انشا بنو لید۔ و منطق و عروض و ظفیہ و بیان و بدیع را اول بقید قلم

در آور دو چوں بندہ را بیشتر بالنظم سروکار ماندہ و اورا بالنظم و تشریہ و چند سطر ی کہ می نویسم

نگاہداشتن آن نیز موقوف بر پسند و است۔ سوائے لفظ و محاورہ و اصطلاح اردو

داخل در عبارت ہمہ مقبول خاطر فقیر گشتہ۔

اس لحاظ سے یہ کہنا کہ ”قتیل نے ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب لکھنے میں انشا کی مدد کی۔

حقیقت کے خلاف ہے“

ہل کتاب کی وجہ تصنیف | بعضے عزیزان و شفیقان بنوشتن قواعد صرف و نحو وغیرہ بطرزیکہ

اجرای آہنا بزبان ہندی موافق محاورہ اردو لہجہ باشد اکثر تکلیف می کردند۔ وراقم

چوں قدرت تحریر آں بمرتبہ کہ پایہ ایں اعتبار را شاید در خودنی دید: متاں بود کہ دیں اثنا

..... مرزا حاجی صاحب نیز باصرار فرمودند: ناچار امتثالاً

للامر تسوید رسالہ پرداختم۔ و ہر قدر کہ نوستم قواعد مسطور از فارسی نقل نموده بہ ہندی

مطابق ساختم۔ پس مسعی گردانیدم مجموعہ مذکورہ را بہ دستور الفصاحت و مرتب نمودم

ترتیبش را بمقدمہ و پنج باب و خانہ“

مقدمے کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جوہر شناس اجاب مدت سے تقاضا کر رہے تھے

کہ مکتا قواعد صرف و نحو اردو پر نہ کہ احوال شعرا پر ایک رسالہ لکھے لیکن وہ کسر نفسی سے اپنے آپ کو

اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ مرزا حاجی نے بھی اصرار کے ساتھ اس تصنیف کی فرمائش کی

تو مکتا نے مجبور ہو کر اس کو لکھنا شروع کیا ”ناچار امتثالاً للامر بہ تسوید رسالہ پرداختم“ اور قواعد اردو کو

قواعد فارسی کے سانچوں میں ڈھالنے لگا۔ ان مراحل کے بعد اس نے اس کتاب کا نام ”دستور الفصاحت“

رکھا۔ پس مسعی گردانیدم مجموعہ مذکورہ را بہ دستور الفصاحت“

یعنی کتاب کے مطالب مکتا کے ذہن میں خواہ کتنی ہی مدت سے رہے لیکن اس نے انھیں ۱۲۲۹ھ

یا ۱۲۳۰ھ میں مرزا حاجی کے حکم سے قلمبند کرنا شروع کیا۔ پھر جب اس کا خاکہ تیار ہو گیا تو کئی وجوہ سے

ساہا سال تک حسب درخواست نظر ثانی کر کے اس میں رنگ بھرنے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔

”عرضہ بعید و مدت مدید سیری گردیدہ کہ چہرہ تطیر ایں مقالہ و گردہ تصویر ایں رسالہ بر صفحہ

وجود نقش گرفتہ بہ سبب تردد خاطر و محل تعطیل افتادہ بود۔ و درین تعطیل کہ ساہا سال

بسرآمدہ ہرگز طبیعت متوجہ نشد کہ بنظر ثانی پرواز دیا آں را بخوی کہ منظور بود درست سازد

یعنی انیس برس تک یہ کتاب سودے کی حالت میں رہی اور سال ۱۲۲۹ء میں اس کا تاریخی نام رکھا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حاجی کے حکم سے جب کتاب لکھی جانے لگی تھی تو قواعد صرف و نحو اردو کے سوا کوئی اور نام مصنف کے ذہن میں نہیں تھا۔ اگر بقول آپ کے یہ کتاب ذہنی طور پر نہیں بلکہ خارجی طور پر سال ۱۲۲۹ء سے پہلے تالیف ہو چکی تھی تو یکتا نے اپنے اس بیان میں کہ ناچا امثالہ لامر بہ تسویر سالہ پر داختم "صریح جھوٹ کہا ہے اور آپ یکتا کو اس مقام میں جھوٹا تسلیم کر لیں جو ناگزیر ہے تو پھر آپ اس کی کس بات کی حمایت میں دلائل پیش کر سکتے ہیں۔

رقعات قبیل "معدن الفوائد" سے پتا چلتا ہے کہ دریائے لطافت کی متعدد نقلیں لکھی جا چکی تھیں اور یہ امر ناممکن ہے کہ آٹھ برس (۱۲۲۲ - ۱۲۳۰) بلکہ ستائس برس (۱۲۲۲ - ۱۲۴۹) کے عرصے میں باوجود اس شہرت اور اعتراف شہرت کے یکتا نے دریائے لطافت کا مطالعہ کرنا ضروری نہ خیال کیا ہو اور یوں خیال کرنا یکتا پر ظلم کرنا ہے۔ علاوہ یکتا کے اس بیان کے۔

"ہیچ کتابی از کتب این فن و رسائل این ہنر کہ مفید مطلب و معین مقصد دیں باب می شد

در نظرند اشم کہ موافق آں می نوشتم و از خطا مصون می ماندم"

یہ معنی کہاں نکلتے ہیں کہ یکتا نے اس فن صرف و نحو اردو کی سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں دیکھی تھی یا کوئی ایسی کتاب معرض وجود ہی میں نہ آئی تھی بلکہ یکتا کا کہنا یہ ہے کہ "اس فن پر ملیکوں اور غیر ملیکوں کی کتابیں تو بہتیری ہیں مگر میں جس طرز پر لکھنا چاہتا تھا اس طرز کی یا اس پائے کی کہ میں اس سے استفادہ کروں یا اس کے نقش قدم پر چل کر غلطیوں سے محفوظ رہوں کوئی کتاب میری نظر میں نہیں تھی۔" اُس نے صاف صاف لکھا ہے کہ۔

"اس فن کی کتابوں میں سے کوئی کتاب یا اس ہنر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ جو

اس بارے میں مفید مطلب ہو و معین مقصد ہو میری نظر میں نہیں تھا کہ میں اسی کے

موافق لکھتا اور غلطیوں سے محفوظ رہتا۔

کسی فن کی کتابوں اور رسالوں کو دیکھے بغیر ایک مصنف کیسے کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی مفید مطلب اور معین مقصد نہیں، پھر کسی فن پر اس فن کی کتابوں سے جو پہلے سے موجود مشہور ہیں آنکھیں بند کر کے لکھتے چلے جانا اور یہ سمجھنا کہ بس قواعد صرف و نحو اور میرے ہی افکار کے محتاج ہیں جہالت ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یکتا نے ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ بخلاف اس کے قائم کی ڈھٹائی قابلِ داد ہے۔ کس دلیری سے لکھتا ہے۔

”الی الا ان در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے رنجتہ کتابی تصنیف نگردیدہ، دتا میں

زماں سچ انسانی از اجرا ی شوق افزای سخنوراں این فن سطری تالیف نرسانیدہ“

اب یکتا نے جو یہ کہا ہے کہ دریائے لطافت بھی دستور فصاحت کی تصنیف میں مفید و معین نہ ہو سکی یا یہ کہ دستور بہ نسبت دریائے بہت جامع اور فنی کتاب ہے اس کی تصدیق یا تکذیب دنیائے ادب اسی وقت کر سکتی ہے جب اس کے سامنے پوری کتاب چھپ کر آئے اور وہ بذاتِ خود اس پر کوئی رائے قائم کر سکے۔ اب اس پر جو کوئی بھی جو کچھ بھی رائے قائم کرے گا اس کی بنیاد آپ کی رائے پر ہوگی۔

خاتے کی وجہ تصنیف ”خاتمہ در تذکرۃ الشعرا یعنی مدبران اسامی و قدیری احوال بعضی از شعرا کہ

تقریب مثال۔ کلام فصاحت نظام این بزرگواران دیں رسالہ مندرج گردیدہ تا مطالعہ

کنندہ را از حالت و قوت مرتبہ ہر یک فی الجملہ وقوف و آگہی بودہ باشد“

اصل تصنیف سے خاتے کا صرف اتنا تعلق ہے کہ اس کے پڑھنے سے اصل تصنیف میں جن

شعرا کے اشعار مثال کے طور پر آئے ہیں، ان میں سے بعض کے رتبے اور حالات معلوم ہوتے ہیں

یگانے یہ نہیں لکھا کہ اس نے کب سے اور کس کے حکم سے یہ تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ اندرونی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ ایک مدت سے یہ طور خود تذکرۃ الشعر امرتب کر رہا تھا۔ اس کا آغاز ۱۲۳۱ھ سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور ۱۲۳۹ھ تک اس میں برابر ترمیمات اور اضافے کرتا رہا۔ اسی کا ایک انتخاب بطور خاتمے کے دستور کے آخر میں ملحق ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا کا اصل کتاب قواعد صرف و نحو اردو کی ابتدا اور انتہا سے کوئی تعلق نہیں اور یہ دونوں مستقل اور مختلف تصانیف ہیں۔

جس شاعر نے جس قدر اردو کی خدمت کی ہے اور اس کی نشوونما میں حصہ لیا ہے اسی تناسب سے ہمیں اس کے سوانح زندگی کی تلاش رہتی ہے۔ خدمتِ اہل دربار کا درجہ اول ہے اور احوال زندگی کا ثانوی۔ ہم میر تقی میر کو اس سنے عزیز نہیں رکھتے کہ وہ خان آرزو کے بھانجے تھے یا خود آصف الدولہ نے انھیں لکھنؤ طلب کیا تھا یا وہ اپنے اور سودا کے سوا کسی کو پورا شاعر نہ مانتے تھے۔ بلکہ ان کا کلام ان کے کمالاتِ شاعری کا شاہدِ عادل ہے اور اسی کے ضمن میں ہم ان کی شاعری کو قابلِ مطالعہ سمجھتے ہیں اور اپنے عزیز اوقاف کو اس میں صرف کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ورنہ وہ خان آرزو کے بھانجے تو کیا نوح علیہ السلام کے بیٹے بھی ہوتے تو انھیں کون پوچھتا اور کون اس کی تحقیق کرتا کہ دلی سے لکھنؤ جاتے وقت میر کے پاس ساری گاڑی کا کرایہ تک تھا یا نہیں۔ وہ لوگوں سے کم التفاتی و بے اعتنائی سے پیش آتے تھے یا بجا جت اور چاہلوسی سے اور وہ اپنی کمر میں پستول لے کر ایک پورا تھان لپیٹ لیتے تھے یا رسی باندھ لیتے تھے اور اسی طرح انشانے جو کچھ بھی اردو کی خدمت کی ہے اگر وہ نہ کی ہوتی تو کون اس کی پروا کرتا کہ مرزا فرحت اللہ کی تالیف ”انشا“ پر انشا کی جو تصویر بنی ہے اس میں سر پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ حال آنکہ تکریمۃ الشعر کے مولف نے جو انشا کا معاشرہ تھا لکھا ہے ”بطور آزادان باصفائی چہار برومی ماند“ تو ان دونوں میں کون مستند ہے۔ یا یہ کہ انشا آخری وقت میں مجنوں ہو گئے تھے یا مجذوب و علیٰ ہذا القیاس۔ یہ سب ذیلی اور ضمنی باتیں ہیں۔ تحصیل زبان و ادب میں ان باتوں کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی

کوئی گٹاؤ یا بڑھاؤ نہیں ہوتا۔ آج دنیائے اردو میں افسانوں کی ہوا چل رہی اور ہر ادیب ارادی یا یا غیر ارادی طور پر اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس لئے شعرا کی سوانح عمریاں پڑھنے میں جو لطف آتا ہے وہ ان کے کلام کی خصوصیات اور اردو پران کے احسانات کے فنی مطالعہ سے نہیں آتا۔

جراتِ معاف۔ دستور الفصاحت کے دو حصے ہیں پہلا ایک سوتاسی صفحے کا نادر اور قیمتی تحقیقات کا خزانہ اور دوسرا اس خزانے کے بعض نادر روزگار طلائی سکوں کی تفصیلات کا صرف بتیں صفحوں کا خاتمہ۔ آپ نے دنیائے اردو کو خزانے سے محروم کر کے صرف اس کی تفصیلات کے خاتمے کو مزید نایاب و کمیاب تفصیلات کے ساتھ شائع کر دیا۔ یکتا کی ہیں ایک تصنیف مل گئی۔ اس کے حالات نہیں ملے۔ خیر زبان و ادب کا کوئی معتد بہ نقصان نہیں ہوا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا یعنی یکتا کے صرف حالات ملتے اور تصنیف نہ ملتی تو کس قدر نقصان اور افسوس ہوتا۔

ماخذ حواشی میں جو چھپا سی صفحے کچے ہیں ان میں چھوٹے ٹائپ میں اصل کتاب کے ۱۸۷ صفحے سما جاتے۔ یہ صفحے آپ نے جس دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے لکھے ہیں اس محنت شاقہ کی داد کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں جنہوں نے اس قسم کے کام کئے ہیں۔ یہ حصہ اس قابل تھا کہ تذکرہ تذاکیر الشعراء کے نام سے علیحدہ شائع کیا جاتا۔ یہ ایک مستقل اور ضخیم تالیف ہو سکتا ہے اور بہت ہی صبر شکن اور حوصلہ آزمایا کام ہے۔ دنیا اردو داں شعرا کے حالات سے اگر کیا منفی نہیں تو تھوڑا بہت پہلے سے واقف تھی ہی۔ آپ نے اس معلومات میں اور اضافہ کیا۔ یہ بیشک آپ کا احسان ہے لیکن احسانِ عظیم ہوتا اگر آپ اس نایاب حصے کو جس سے دنیائے اردو مطلق واقف نہیں ہے شائع کر دیتے۔

دریائے لطافت | میں خواص کا ذکر نہیں کرتی متوسط بلکہ اس سے کچھ اونچے درجے کے ادبا میں کتنے اور قلیل | ایسے ہوں گے جنہوں نے دریائے لطافت کا مکمل نسخہ دیکھا ہے اور اس کے دریائے کو جس کا اقتباس میں نے اوپر لکھا ہے بغور پڑھا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ دریائے لطافت

میں یہاں قواعد اردو کی کتاب انشا راشرخاں کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو مرزا قاتل کی مدد کے ۱۲۲۲ء میں تمام ہوئی تھی۔ مدد کے لفظ سے ہر اس عبارت کو پڑھنے والے کا دماغ قواعد اردو کی تدوین میں قاتل کی مدد کی طرف منتقل ہوگا۔ میری دانست میں اس عبارت میں یہ ترمیم ہونی چاہئے۔

”ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب میر انشا راشرخاں کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو ۱۲۲۲ء میں تمام ہوئی تھی۔ اس میں منطق و عروض و قوافی و معانی و بیان پر جواہر اب ہیں وہ مرزا قاتل نے لکھے ہیں۔“

مدد یا شرکت کا لفظ بہت ہی مغالطہ انگیز ہے مثلاً ”حضرت جوش نے مولانا حسرت کی مدد یا شرکت سے منتخب نظموں اور غزلوں کا ایک گلدستہ شائع کیا ہے“ تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہر غزل کے انتخاب میں حضرت جوش اور ہر نظم کے انتخاب میں مولانا حسرت کی صلاح اور شور سے کو دخل ہے۔ حالانکہ کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ

”حضرت جوش نے منتخب نظموں اور غزلوں کا ایک گلدستہ شائع کیا ہے جس میں غزلوں کا انتخاب مولانا حسرت نے کیا ہے۔“

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا ”قواعد اردو کی کتاب موسومہ بہ دریائے لطافت کی تالیف میں قاتل شریک تھے یا وہ ان کی مدد سے لکھی گئی؟“ ذمہ دار تحریروں میں کوئی ایسے جملے جن میں ابہام ہو کیوں باقی رہیں۔

ماخذ حواشی میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تذکروں میں جو سن آغاز و اتمام لکھا جاتا ہے وہ محض برزخی کیفیت رکھتا ہے اور تذکرے کا حقیقی آغاز و اتمام اس سے بہت قبل اور بعد ہوتا ہے مثلاً مجمع النفائس کے اختتام کا ۱۱۶۴ھ لکھا گیا ہے حالانکہ اس کی تالیف کا زمانہ اندرونی خواہر کے مطابق ۱۱۵۵ھ سے ۱۱۶۳ھ تک کا ہے اور واقعی آپ نے اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

مجمع النقائس کے آغاز کے متعلق حزیں کے حالات سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کی ترتیب ۱۱۵۲ء سے پہلے سے ہونے لگی تھی اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ”مصنف (آرزو) نے دیباچے میں یہ بھی بتایا ہے کہ انھیں اس کی ترتیب کا خیال کس طرح اور کب ہوا“ اگر مصنف کی یہ عبارت بھی شائع ہو جاتی تو آپ کی تحقیق کی مزید تائید ہو جاتی۔

کسی تذکرے کا آغاز و انجام معین کرنے کے لئے صرف اُمور اہم ہیں۔ ایک یہ کہ مولف نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو کب تذکرے کی صورت دینے کا ارادہ کیا اور دوسرا یہ کہ اس نے اپنے تذکرے کو پہلے پہل کب قابل اشاعت سمجھا۔

مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو طالب علمی کے زمانے سے اساتذہ فارسی کے منتخب اشعار ایک بیاض میں لکھنے لگے صرف اپنی دلچسپی کے لئے نہ کہ اشاعت کی غرض سے۔ شدہ شدہ وہ ایک اچھا خاصا ناوارد انمول ذخیرہ بن گیا تو انھیں بطور خود یادو ستوں کے اصرار سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس علمی خزانے کی افادی حیثیت سے دوسروں کو کیوں محروم رکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو منظم اور مرتب طور پر شائع کرنے کا قصد کر لیا۔ اور یہی زمانہ اس تذکرے کے آغاز کا ہے ممکن ہے کہ اس سنہ آغاز سے بیس سال پہلے اس بیاض کی ابتدا ہوئی ہو لیکن وہ مدت معتبر نہیں۔ ورنہ یوں کہنا غلط ہو گا کہ زید ۱۹۲۲ء میں بی اے کی جماعت میں داخل ہوا اور دو سال کا نصاب ختم کر کے ۱۹۲۴ء میں بی اے پاس ہوا۔ کیونکہ بی اے کی جماعت میں داخلے کے لئے اس کو تیرہ سال پہلے سے تیاری کرنی پڑی تھی اور آج تک وہ برابر ان مسائل کی تحقیق میں ہے جنھیں وہ دو سال کے عرصے میں امتحانی نقطہ نظر سے سمجھ تو چکا تھا، لیکن حل نہ کر سکا تھا اور یوں کہنا حقیقت کے خلاف ہو گا کہ وہ ۱۹۲۹ء سے بی اے کی جماعت میں داخل رہا تھا اور اب امتحان پاس ہو جانے کے بعد بی اے کے درجے کی جو میاری لیاقت ہے وہ جامع اور مانع طور پر زید کو حاصل ہو چکی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خوش نصیب سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں بی اے پاس کر لیتا ہے محض اس لئے کہ قدرت نے اسباب فراہم کئے تھے اور وہ امتحانات پاس ہوتا ہی چلا گیا اور کوئی دھن کا بچکا بڑی عمر میں بی اے ہونے ہی کے قصد سے ابتدائی مراحل طے کرتا ہے۔ اگرچہ یہ تمثیل بیش یا افتادہ ہے لیکن میرا مفہوم اور تذکروں کے مولفین کا حال اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

آرزو دیا ہے میں لکھتے ہیں کہ مجھے فلاں سنہ میں (۱۹۷۱) تذکرے کی ابتدا کا خیال پیدا ہوا تو وہی اس کے آغاز کا سنہ ہے خواہ اس سے پہلے کے کسی سنہ کے کسی واقعے کا ذکر مولف نے بصیغہ حال کیا ہو۔ لیکن مولف اگر آغاز کا صراحتاً یا کنایتاً ذکر کرے تو تذکرے میں جن مختلف زمانوں کا حال ملتا ہے۔ ان میں سب سے مقدم زمانے کو آغاز کا زمانہ قرار دینے کے لئے یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اس مولف کے سوانح حیات سے بخوبی واقف ہوں کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت کہاں پائی۔ اس کے طبعی رجحانات اور مشاغل زندگی کیا تھے۔ تلاش معاش میں کہاں کہاں کا سفر کرنا پڑا۔ تصنیف و تالیف کے لئے جس آسودگی اور سکون کی ضرورت ہے وہ اس کو عمر کے کن زمانوں میں میسر ہوئی۔ اس تذکرے کی تالیف کے محرکات کیا تھے وغیرہ۔

اب رہی تاریخ اختتام وہ بلاشبہ وہی رہے گی جو مولف نے لکھی ہے اس میں کوئی تبدیلی روا نہیں۔ پہلے زمانے میں طباعت کی سہولتیں نہ تھیں اس لئے تذکرہ ختم ہو جانے کے بعد بھی مولف ہی کے پاس دھرا رہتا تھا اور صرف خاص خاص لوگوں کی نظروں سے گزرتا تھا۔ ایک آدمہ شائق کو اس کی نقل لینے کی اجازت ملتی بھی تھی تو وہ نقل اہل تذکرے کی ضخامت کے لحاظ سے ہفتوں اور مہینوں میں پوری ہوتی تھی۔ یہ ضروری ہے کہ ہر تالیف میں کچھ کمیاں رہ گئی ہیں یا بعض مقام تفصیل یا اختصار چاہتے ہوں مولف انھیں وقتاً فوقتاً درست کرتا رہتا تھا۔ یہ گویا تذکرے کے کئی ایڈیشن ہیں مثلاً آپ حیات کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں نکلا اس میں میرضا حک اور مومن کے حالات نہیں تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں

یہ بڑھائے گئے تو یہ کہنا کہ ۱۹۸۷ء میں یہ تذکرہ ختم نہیں ہوا تھا اور اس کا سال اختتام اس سنہ کے بہت بعد ہے حقیقت نہیں۔

دستور الفصاحت کی آئندہ اشاعتوں میں آپ ترمیمات اور اضافے کرتے ہی جائیں گے لیکن اس کا سال اختتام یعنی اشاعتِ اول کا سنہ وہی ۱۹۸۳ء رہے گا اور حق یہ ہے کہ کوئی مولف یا مصنف اپنی تالیف یا تصنیف ختم کر لینے کے بعد اس میں جو عبارتیں گھٹانا اور بڑھانا ہے وہ اس کی انصاف پسندی اور اصابتِ رائے کی کسوٹی ہوتی ہیں اور اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کوئی مولف اپنے ماضی اور اپنے زمانے سے کس قدر گہری اور سطحی واقفیت رکھتا ہے اور اگر ہم کسی تذکرے کے اختتام کا سنہ اس میں کے آخری اضافے کے سنہ کو مان لیں تو نفعیاتِ انسانی کا ایک اہم باب حذف ہو جائے گا کہ وہ کس طرح اپنی سعی کو کسی خاص درجے پر پہنچ کر مکمل تصور کر لیتا ہے اور امتدادِ زمانہ اس فیصلے کو نظر ثانی کا محتاج ثابت کر دیتا ہے۔

زمانے میں تذکروں کی اس نہایت ہی محدود اشاعت سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ مولف جس کے بارے میں جو جی چاہتا تھا لکھتا تھا اور کوئی معارض نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پورا زمانہ گزر جاتا تھا۔ تاخرین کو اگر مولف اور اس کی تحریروں کے متعلق کافی ذخیرہ معاصرین کا لکھا ہوا مل جاتا ہے تو آسانی ہو جاتی ہے ورنہ وہ وثوق کے ساتھ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ایک اور مشکل یہ ہے کہ جب تک مولف کی شخصیت ایسی نہ ہو کہ اس کے قلم سے نکلا ہوا لفظ لفظ سنبھل جانے کا امکان رکھتا ہو تو معاصرین اس سے تعرض بھی نہیں کر سکتے۔ اور اگر کریں بھی تو جب تک خود معرض یا اس کے معاصران اعتراضات کو قلم بند نہ کریں وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کسی ایسے تذکرے میں جس کا معاصرین نے ذکر نہیں کیا اور جس کو مولف اور اس کے کرنا کاتبین کے سوا کوئی چوتھا نہیں جانتا تھا کسی مافی ہونی بات کے خلاف کوئی امر لکھا ہو تو ایک سو سال کے بعد یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اگر یہ امر

واقعہ نہ ہوتا تو اسی زمانے میں لوگ اس دروغ بیانی کا تاؤ پود بکھر کر رکھ دیتے۔
عوام میں مشہور ہے کہ لوگ خود مشہور ہو جانے کے لئے کسی مستند شخص پر تنقید کر دیتے ہیں،
لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ حقیقی شہرت کا سودا اگر اس قدر سستا چک سکتا ہے تو اس میں زبان اور
ادب کا کوئی نقصان نہیں۔ سراسر نقصان تو اس امر میں ہے کہ کوئی غلط بات ایک مستند شخص کے
قلم اور زبان سے نکل کر صحیح مشہور ہو جائے لیکن تاریخ زبان و ادب گواہ ہے کہ ہر دور میں بعض مشاہیر
کی شخصیتیں اس قدر ”تنقید سہا“ ہوتی ہیں کہ ان کے معاصرین کی مقول سے مقول تنقید بھی ان کے
فیصلوں کو بدل نہیں سکتی اور وہ آئندہ نسلوں پر اس کا فیصلہ چھوڑ جاتے ہیں کہ مملکت علم میں یہ
”اٹل پن“ بقاوت تھا یا خروج۔

آپ نے ڈاکٹر عبد الحق صاحب سے دو جگہ اختلاف کیا ہے۔

(۱) ڈاکٹر اسپرنگریہ قیاس کرتا ہے کہ نکات الشعراء کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ء ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب
نے بھی اسے تسلیم فرمایا ہے (دیباچہ صفحہ ۴۳)

(۲) صاحب گلزار کی تاریخ وفات ڈاکٹر اسپرنگریہ اور بلوم ہارٹ نے ۱۲۰۸ء بتائی ہے۔ مخدومی
مولوی عبد الحق صاحب نے بھی گلشن ہند کے مقدمے میں اسی سنہ کو دہرایا ہے۔ اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے
تو الخ (دیباچہ صفحہ ۷۸)

”تسلیم فرمایا ہے“ اور ”دہرایا ہے“ کے یہ معنی ہوئے کہ انھیں اسپرنگریہ کے ان فیصلوں کو تسلیم نہ
فرمانا اور نہ دہرانا چاہئے تھا۔ لیکن نکات الشعراء کے متعلق آپ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ”میر صاحب
نے یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۱ء میں یا اس کے کچھ بعد لکھنا شروع کیا اور شعبان ۱۱۶۵ء کے قبل ختم کیا“ ۱۱۶۱ء
تو مولوی صاحب پر صرف اتنا اعتراض ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ”سنہ اختتام“ کی بجائے ”سنہ تالیف“
کا لفظ استعمال کیا جو سنہ آغاز و انجام دونوں پر حاوی ہے اس لئے دھوکا ہوتا ہے کہ میر نے اسی سنہ

میں تذکرہ شروع کر کے اسی سنہ میں اس کو ختم کر دیا تھا لیکن مولوی صاحب نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ کسی کتاب پر میرے رائے دے چکے یا اس کتاب پر کسی کی رائے کی تصدیق کر چکے کے بعد تحقیق کا دروازہ بند ہے اور کسی کو مزید تحقیق کا مجاز نہیں۔

ہم مولوی صاحب سے غلطیوں کا وقوع محال کیوں فرض کر لیں جو ہم کو ان کی کسی غلطی پر تعجب ہو۔ جیسا آج اردو کا ہر محقق آزادی کی آبِ حیات پر کوئی اعتراض ضروری سمجھتا ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب پر کوئی ایراد ضرور کرتا ہے۔ انھوں نے تاریخ ادبِ اردو میں بے شمار صحیح معلومات کا انکشاف کیا ہے کہیں کہیں غلطیاں بھی ان سے ہوئی ہیں۔ لیکن انھیں بطریقِ احسن رفع کرنا ہمارا فرض ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی تحقیق پیش کرنے سے پہلے اگر صرف اسی قدر لکھتے تو کافی تھا کہ ”ڈاکٹر اسپرنگر اور مولوی عبدالحق صاحب یہ قیاس کرتے ہیں کہ نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ء ہے اور صاحب گلزار کی وفات اسپرنگر اور بلوم ہارٹ اور مخدومی مولوی عبدالحق صاحب ۱۲۰۵ء بتاتی ہے۔“

مولوی صاحب پر جو دوسرا اعتراض ہے اس میں صاحب گلزار کی تاریخ وفات ۱۲۰۸ء کے صحیح نہ ہونے میں آپ کو جو شبہ ہیں ان کے وجوہ نہیں لکھے گئے۔ حالانکہ آپ صاحب گلشنِ ہند کی سند پر صاحب گلزار کو ۱۲۱۵ء سے پہلے متوفی مانتے ہیں۔

دیباچہ صفحہ ۲۲:۔ آپ لکھتے ہیں ”میر صاحب نے صرف ایک شعر اس غزل کا چنا ہے جو ۱۱۶۱ء کے کسی شاعر کی طرح میں لکھی گئی تھی۔ اگر میر صاحب نے حاتم کا حال زیادہ بعید زمانے میں لکھا ہوتا تو ان کی بعد کی ہی ہوئی غزلوں کے شعر بھی چنتے جو دلی کے شاعروں میں برابر پڑھی جاتی رہی تھیں“ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی غالب کے حال اور نمونہ کلام میں ان کا صرف یہ ایک شعر دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک

میرا سردامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

لکھے تو اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ مولف نے ۱۸۵۵ء یعنی ذوق کی وفات سے پہلے غالب کا حال لکھا ہے کیوں کہ بقول آزاد (آب حیات ملاہ) ذوق نے اس شعر کی تعریف کی تھی۔ ہماری نظر میں حاتم۔ خود بہت بڑے شاعر اور ایک سو فی صدی شاعر کے استاد ہیں اور ان کی اتادی کا حق اسی وقت ادا ہوتا کہ میر صاحب کم از کم پچیس شعر ان کے انتخاب کرتے لیکن اس کی کیا تدبیر کہ خدائے سخن حاتم کو ”مرد جاہل و ثکن“ سمجھتا تھا۔ یہ ایک شعر بھی ان کی طبع نازک پر گراں ہے۔

گلشن سخن، کی تالیف کا زمانہ آپ نے یوں معین کیا ہے: ”دیباچے میں مصنف نے آج پھولا سخن کا گلشن“ مادہ تاریخ لکھا ہے جس سے ۱۱۹۴ء برآمد ہوتے ہیں۔ چونکہ کتاب میں بھی جا بجا ہی سنہ انوں، یا ’احمال‘ کے ساتھ مذکور ہے اور مصنف کا دعویٰ بھی ہے کہ کتاب تھوڑے عرصے میں تصنیف ہو گئی تھی اس لئے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہو گا کہ اس ایک سال کے اندر کار تالیف سے متلا فارغ ہو گیا تھا۔ لیکن خاتمے کے صفحہ ستر کے حاشیے میں آپ لکھتے ہیں ”بتلا در گلشن سخن (۳۴ ب) می گوید شیخ محمد حاتم موطنش دہلی و معاصر نجم الدین، آبرو بودہ، زبانش بازبان ولی دکنی مناسبت دارد، میر عبدالحی تاباں از ملائذہ اوست، شاعر فصیح بیاں و سرآمد ریختہ گویاں (بود) دیوانش دو ہزار بیت بلکہ زیادہ“ تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ آبرو کا انتقال ۱۱۶۱ء کا مطابق سنہ عیسوی ۱۷۴۷ء ہے اور حاتم کا انتقال ۱۱۹۷ء میں ہوا یعنی گلشن ہند کے اختتام کے تین سال بعد اس لئے سرآمد ریختہ گویاں کے بعد بریکٹ میں (است) چاہئے نہ کہ (بود) ورنہ آپ کے اصول کے مطابق ماننا پڑے گا کہ تذکرے کا انجام ۱۱۶۷ء کے بعد ہوا ہے۔

دیباچہ صفحہ ۶۴:- نواب صدرباگ بجگ بہادر فرماتے ہیں۔

”تذکرہ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں شہنوی رموز العارفین

ہے۔ گلزارِ ارام نہیں ہے رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۸ء ہے اور گلزارِ ارام کا ۱۱۹۲ء ہے۔

رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔

تذکرے کا آغاز ۱۱۸۸ھ کے بہت بعد کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی تالیف کے زمانے میں رموز العارفین مشہور ہو چکی تھی اور اس شنوی کو کسی پہلے کے کارنامے کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں سے مشہور ہونا تھا۔ سحر البیان تو گیارہ سال بعد کی تصنیف ہے اور ۱۱۸۸ھ سے پہلے بھی اس کا آغاز ہو سکتا ہے وہ اس طرح کہ جب ۱۱۸۸ھ میں یہ شنوی لکھی گئی اور مشہور ہو چکی تو اس کا کام بھی پہلے سے لکھے جانے والے تذکرے میں درج کر دیا گیا۔ لیکن ۱۱۹۲ھ کی تالیف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں گلزار ارام نہیں ہے یعنی یہ تذکرہ ۱۱۹۲ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اب نواب صاحب موصوف کی تحقیق کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ خود میر حسن نے خاتمہ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ ”در تاریخ ۱۱۹۱ھ باتمام رسید“ اور اس تذکرے کے آغاز و انجام کے متعلق دیباچے کے چھ صفحوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ”میر حسن نے ۱۱۸۴ھ یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۹۱ھ میں ختم کر دیا تھا اور بعد کے اضافوں میں صرف شاہ نصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی ہے لیکن تاریخ انجام کے بارے میں آپ نے نواب صاحب کے صحیح تخمینے اور درست قیاس کی داد نہیں دی جو ضروری تھی۔“

دیباچہ صفحہ ۹۰ :- مخزن الغرائب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں ”دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۸ھ میں مصنف کو اس کی ترتیب و تالیف سے فراغت ہوتی ہے“ چند سطروں کے بعد لکھا ہے :- ”کتاب خانہ عالیہ رامپور میں اس کی جلد اول کے دو نسخے ہیں مگر دونوں ناتمام ہیں اس بنا پر اس کے آغاز و انجام وغیرہ کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔“

اس عبارت سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ (۱) مذکور نسخے جلد اول ہونے کے لحاظ سے ناتمام ہیں (۲) یا ان کے دیباچوں کے صرف اسی قدر حصے باقی رہ گئے ہیں جن سے تاریخ انجام مفہوم ہوتی ہے

آخر میں آپ لکھتے ہیں: "مخدومی نواب صدیق یار جنگ بہادر کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود ہے۔" جب یہ بات تو جو کتاب حسب ایامائے بندگان ہمایوں اعلیٰ حضرت فرماں روا کے رامپور ام القیام و ملکہ تصنیع و تحشیے کے ساتھ شائع ہوئی اور بیادگار عقد سعید نکاح حضور مرشد زادہ آفاق نواب یحییٰ بہادر ہے اس کی تکمیل کے لئے ناممکن تھا کہ نواب صاحب موصوف اپنا نسخہ مستعار دینے میں دریغ فرماتے یا آپ خود صیب گنج پہنچ کر اس کو دیکھ آتے جو کتاب ہمارے ملک میں ہے اور جس سے آغاز و انجام کے متعلق ہم خود قطعی فیصلوں پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے آغاز و انجام کے بارے میں ڈاکٹر اسپرنگر اور ڈاکٹر لائیٹ کے مشتبہ اقوال کیوں نقل کئے جائیں۔ مذکورہ بالا جملے سے آپ کا منہموم کچھ ہو لیکن قارئین بلاوجہ نواب صدیق یار جنگ بہادر پر افسوس کریں گے اور دلیل یہ ہوگی کہ نواب صاحب موصوف مذکور تذکرہ کی کوتاہی کے روادار نہیں ورنہ محال تھا کہ ریاست رامپور ایک شخص کے سفر اور صیب گنج میں چند ہفتوں کے قیام کے اخراجات برداشت نہ کرتی۔ اس لئے یا تو یہ آخری جلد حذف ہو جانا چاہئے یا مکمل نسخہ دیکھنے کے بعد ہی اس کے متعلق رائے لکھی جائے۔

دیباچہ صفحہ ۶۹۔ تذکرہ میر حسن قلمی کی عبارت یہ ہے: "از نجائے امروہہ مولدش اکبر پور کہ قصبہ ایت متصل" لیکن خاتمے کے صفحہ ۹۳ میں مولوی عبدالقادر حنیف رامپوری خود مصحفی کی زبانی فرماتے ہیں۔ "می گشت کہ مولد من بلم گذشت کہ متصل شاہجہاں آباد است" ان میں سے کس کا قول مرشح ہے۔

دیباچہ صفحہ ۱۰۴۔ (مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے سخن شعرا میں) داغ کا تذکرہ حالیہ صیغوں میں کر کے تحریر کرتے ہیں کہ ۱۲۸۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ کون داغ ہیں۔ نواب مرزا خاں داغ راہداد اعلیٰ حضرت و اقدس میر محبوب علی خاں) کا انتقال ۱۲۸۸ء مطابق ۱۲۹۵ء میں ہوا ہے۔

دیباچہ صفحہ ۱۸۴۔ انجمن ترقی اردو نے اسے (عقد ثریا از مصحفی) شائع کر دیا ہے مگر کوئی سطر غلطی و پاک نہیں۔ انجمن نے جو بعض نایاب قلمی کتابیں شائع کی ہیں ان میں یہ نقص موجود ہے خصوصاً دریائے لطافت کا جو فارسی نسخہ شائع کیا ہے وہ دریائے لطافت مطبوعہ مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد کا مہذب اور

مختصر ایڈیشن ہے میں نے اپنی تالیف "آشا" کے سلسلے میں ان دونوں کا مقابلہ کیا تو انجمن کے نسخے میں بیسیوں مقام غلط نکلے اور اس غلط فارسی نسخے کا مخدومی علامہ کسبی نے جو ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ اس پر آپ کا جملہ صادق آتا ہے۔ اس لئے کتاب کے اہم مطالب ضبط ہو گئے ہیں۔ مثلاً صرف اردو ترجمے کی مدد سے آپ "دردائے اول در بیان کیفیت زبان اردو و حروف تہجی اردو" سے "حروف نے کہ دریں زبان بہ تلفظ در می آید ہشتاد و پنج حروف است نزد نصیحان اہل تحقیق و نزد عوام و تحقیق نا آشنا یاں نو و پنج حروف است" کے مطابق ۸۵ اور ۹۵ حروف شمار کرنے کی سعی کیجئے گا۔ آپ یقیناً پریشان اور ناکام ہوں گے اور اسی سے میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔ ترجمہ مذکور ہندوستان بھر کے اعلیٰ نصابوں میں داخل ہے اور طلبہ قواعد کی ایک ایسی کتاب جو انشانے لکھی تھی مگر اب اس کے مطالب وہ نہیں رہے جو انشانے بیان کئے تھے۔ تبرکاً و تمیناً پڑھ جا رہے ہیں۔

ماخذ حواشی میں آپ نے جن کتابوں کی تفصیل لکھی ہے وہ اگر نادر اور کیاب قلمی کتابوں ہی تک محدود ہوتی تو دیا بچے کا وقار قائم رہتا۔ آپ نے چند ایسی کتابوں کا تعارف کرانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے جو چھپ چکی ہیں اور ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں ان کا صرف حوالہ دے دیا جاتا تو کافی تھا۔ موجود صورت میں یہ دیا بچہ "تاریخ ادب و زبان اردو" پر کسی کتاب خانہ کی فہرست کتب معلوم ہوتا ہے۔ خانے کے حاشیوں میں جو نوٹ لکھے گئے ہیں وہ تعریف سے مستغنی ہیں۔ اس کی افادی حیثیت عظیم النظیر ہے۔ میری نظر سے تاریخ ادب یا زبان اردو کی اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں اس قدر سیر حاصل اور جامع حواشی ہیا کئے گئے ہوں۔ التجا ہے کہ مجبور کے مدائح الشعرا رکاجو اقتباس آپ نے خاتمہ ملا پر دیا ہے اس میں "نواب سعادت علی خاں بہادر"

کے بعد کی عبارت نقل کرا کے روانہ فرمائیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت

اسلامی تعلیمات اور نفسیات کی روشنی میں

سعید احمد

(۴)

والدین کی محبت کی سچپہ گیاں | یوں تو محبت خواہ کسی سے بھی ہو ہر حال وہ ایک ایسی وادی ہے جس کی راہیں بڑی سچپہ اور مشکلات سے پُر ہیں۔ پھر بچہ کے ساتھ والدین کی محبت کا مسئلہ تو اور بھی سچپہ اور الجھا ہوا ہے کیونکہ اس میں حسب ذیل صورتیں پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱) والدین کو بچہ سے محبت خود اُس کے اپنے اندازہ اور توقع سے کم ہو۔

(۲) بچہ سے محبت بہت زیادہ ہو۔

(۳) ایک بچہ سے محبت بہ نسبت اس کے کسی اور بہن یا بھائی کے کم ہو۔

ان تینوں صورتوں میں نتائج و عواقب کے اعتبار سے بچہ کی آئندہ زندگی کے لئے بڑی مضر ہیں اور نقصانات ہیں۔ بچہ کی آئندہ زندگی انھیں تین قسموں میں سے کسی ایک قسم کی محبت کے سایہ میں نشوونما پاتی اور بھلتی پھولتی ہے اور وہ اس سے جو نفسیاتی اور ذہنی تاثرات قبول کرتا ہے اس کی زندگی کا پورا نقشہ ان کا حامل ہوتا ہے۔ اس اہمیت کی بنا پر ہم ذیل میں محبت کی ان تینوں صورتوں پر نفسیات کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔

ہر بچہ کی یہ طبعی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے والدین اس کے ساتھ محبت کریں اور اس سے اتنی دلچسپی لیں کہ اس کی موجودگی میں وہ نہ منہموم ہوں اور نہ اس کے علاوہ کسی اور سے خواہ وہ اس کا بھائی یا بہن ہی ہو۔ اپنی دلچسپی ظاہر کریں۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ آپ نے بار بار دیکھا ہوگا۔ ایک بچہ کسی بات پر ضد کر کے رو رہا ہے۔ آپ اسے خاموش کرنے کے لئے کوئی چیز دینا چاہتے ہیں، مگر وہ نہیں لیتا۔ اب آپ فوراً اس بچہ کے کسی بھائی یا بہن کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ اچھا! اگر تم نہیں لیتے ہو تو ہم اسے (اس بہن یا بھائی کو) دیئے دیتے ہیں۔ یہ سنتے ہی بچہ فوراً رونا بند کر دیتا ہے اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ چیز آپ سے اُچک لپکتا ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچہ کی یہ حرکت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اس چیز کو کسی اور بہن یا بھائی کو دینا نہیں چاہتا۔ حالانکہ اس کا اصل باعث یہ ہوتا ہے کہ بچہ جب آپ کی توجہ کو اس سے ہٹ کر کسی اور کی طرف منتقل ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو طبعی طور پر اُسے ناگواری ہوتی ہے اور وہ اس چیز کو آپ سے جھپٹ کر کسی اور کی طرف آپ کے التفات کے دروازہ کو بند کر دیتا ہے۔

اب اگر روزمرہ کی زندگی میں بچہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے والدین اس سے خاطر خواہ محبت نہیں کرتے تو اس میں ایک خاص قسم کا ضعف دماغی پیدا ہو جاتا ہے۔ فرائڈ نے اس کے لئے ایک خاص اصطلاح (*The Oedipus Complex*) وضع کی ہے۔

یونانی روایات کے مطابق اوڈیپس (Oedipus) کا بیٹا تھا جو تھیبس (Thebes) کا بادشاہ تھا۔ اوڈیپس کی ماں کا نام جوکاسٹا (Jocasta) تھا۔ کسی نجومی نے لاؤس کو بتایا کہ جوکاسٹا سے اس کے جو بچہ پیدا ہوگا وہی اس کی موت کا باعث ہوگا۔ چنانچہ جب اوڈیپس پیدا ہوا تو پیشین گوئی کے ڈر سے لاؤس بڑا رنجیدہ ہوا اور اس نے بچہ کو کہیں باہر بھیج دیا۔ اتفاق سے اوڈیپس کسی چرواہے کے ہاتھ لگ گیا۔ جس نے اس کو پالا پر دیا اور وہ نمودن و جوان ہو گیا۔ اس وقت اوڈیپس نے لاؤس کو اپنا باپ جانتا تھا اور نہ جوکاسٹا اس کے علم میں اس کی ماں تھی۔ اس لاعلمی کا نتیجہ یہ ہوا

کہ ایک جنگ میں اوڈیس نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے باپ لائوس کو قتل کر دیا اور پھر اپنی ماں جو کاسٹا سے شادی کر لی۔ دیوتاؤں نے جب قاتل کی تحقیق کی اور اصل حقیقت کا انکشاف ہوا تو اوڈیس کی ماں جو کاسٹا نے پھانسی کا پسند اڑال کر خودکشی کر لی اور اوڈیس کی آنکھیں نکال لی گئیں۔

والدین اور خصوصاً باپ کی محبت کی کمی کے احساس سے بچہ میں جو ضغطہ دماغی پیدا ہوتا ہے، مذکورہ بالا واقعہ کی مناسبت سے ہی فرائڈ اس کو اوڈیس کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس ضغطہ دماغی کے پیدا ہو جانے کے بعد بچہ کے دل میں بسا اوقات اپنے باپ کی نسبت بری خواہشات اور تمنائیں پیدا ہوتی ہیں جن کا وہ اظہار تو کیا کرتا اور ان پر خود اپنے نفس کو لعنت ملامت کرتا ہے لیکن بہر حال یہ خواہشات موجوں کی طرح اس کے دل میں ابھرتی اور فنا ہوتی رہتی ہیں اور ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بچہ میں جسم (Sense of guilt) اور احساس کمتری (Sense of inferiority) پیدا ہو جاتی ہیں اور مستقبل میں ان کا انجام بڑا تباہ کن ہوتا ہے جو بچے ان دوسوں کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں وہ بڑے ہو کر برے ساتھی، بے وفادار دوست اور بد قسمت شوہر یا بیویاں ثابت ہوتے ہیں۔

مشرقی تخیل کے ماتحت ممکن ہے بعض لوگوں کو بیٹے کے دل میں باپ کی نسبت بری خواہشات کے پیدا ہونے پر حیرت و استعجاب ہو، لیکن حقیقت یہی ہے جو علمائے نفسیات نے بیان کی۔ اگر ہم خود اپنی ہی تاریخ پڑھیں تو اس کی متعدد شہادتیں باسانی فراہم ہو سکتی ہیں۔ غیاث الدین بلبن کے انتقال کے بعد کیتباد کا اپنے بیٹے بخر خان کی بے عنوانیوں پر اس کو متنبہ کرنے کے لئے دہلی آنا اور بیٹے کا باپ کے خلاف صف آرا ہونا۔ اکبر کے خلاف جہانگیر کی بغاوت۔ جہانگیر کے خلاف شہزادہ خسرو کی ساز باز اور پھر شاہجہاں بادشاہ کے خلاف اورنگ زیب عالمگیر کی سعی و کوشش یہ سب دراصل اسی ضغطہ دماغی کے مظاہر ہیں جس کو فرائڈ Oedipus Complex کہتا ہے۔

انافرائڈ (Anna Freud) نے یہ صحیح کہا ہے کہ بچہ کا باپ کی نسبت یہ رجحان تنفر

زیادہ تر امیر اور دولت مند گھرانوں میں پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امرائے عیش پرستی میں مبتلا ہونے، نوکریاں کر کے افراط اور بعض اور اسباب کی بنا پر بچہ سے ذاتی طور پر اتنا تعلق نہیں رکھتے جتنا کہ ایک غریب آدمی رکھتا ہے۔ عام طور پر ان لوگوں کے بچے آیاؤں اور گورنرس کے پاس رہتے ہیں خود ماں باپ سے علاقہ کم ہوتا ہے اور غالباً اسی طرز معاشرت کا نتیجہ ہے کہ یورپ میں والدین اور اولاد میں محبت و اطاعتِ خدا کا رشتہ دجاں نشاری کا وہ تعلق نہیں پایا جاتا جو مشرق کی اہل معاشرت کا طغرائے امتیاز ہے، علمائے نفسیات کے نزدیک بچہ میں ناپسندیدگی اور تنفر (Dislike and hostility) کے پیدا ہونے سے حسِ جرم پیدا ہوتی ہے اور اس کا سبب مافوقِ انا (Super Ego) کا عمل ہوتا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک بچہ جب دو برس کے قریب ہوتا ہے اس میں مافوق انا پیدا ہو جاتا ہے اور اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔^{۱۵}

ملین کلین (Melanie Klein) جو بچوں کی نفسیات کی ماہر خاتون ہے اس نے فرائڈ سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا ہے کہ بچہ تو چھ مہینے کا بھی فوق انا کا اثر محسوس کرنے لگتا ہے۔^{۱۶}

بہر حال اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جواں باپ بچہ کی شیر خوارگی کے زمانہ میں بھی اس کے ساتھ پورا اعتنائے کر کے اس میں ناپسندی کا احساس پیدا کر دیتے ہیں اور اس طرح اس میں حسِ جرم کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں وہ سوسائٹی کے سب سے بڑے مجرم ہیں کہ وہ اپنی بے پروائی، امارت کی اکثر، دولت و ثروت کی نمائش اور اپنی تن آسانی و عشرت کوشی کے لئے بچوں کے ذہن میں حسِ جرم کا بیج بو دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بچوں میں آئندہ چل کر اگر کسی قوی خارجی

^{۱۵} Group Psychology and Analysis of the Ego. Chapter x.

^{۱۶} The Psycho-Analysis of Children. Ch. VIII

موثر کے ماتحت یکایک کوئی انقلاب پیدا نہ ہو تو یہ بڑے ہو کر خود غرض اور مطلب آشنا ہوتے ہیں۔
پروفیسر مانتھیو لکھتے ہیں۔

”جس طرح ایک بچہ اپنی جسمانی نشوونما کے لئے اچھی خوراک اور اچھی غذا کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ معاشرتی اور جذباتی ارتقا کے لئے شفقت و محبت مادری و پدری کا ضرور تمند ہوتا ہے۔ اگر بد قسمتی سے کوئی بچہ بالکل یا کسی درجہ میں اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہے تو جب وہ زندگی کے میدان میں مختلف دشواریوں اور مشکلوں سے دوچار ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور اکیلا پاتا ہے اب اس کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے، اس کی تاب مقاومت اور قوت مقابلہ کمزور ہو جاتی ہے، خود اعتمادی کا جوہر اس سے مفقود ہو جاتا ہے، خوف و ہراس، مایوسی و ناکامی اور جبن و ہزولی اس پر غالب ہو جاتے ہیں، بیکسی اور بے چارگی کا احساس اسے کسی کام کا نہیں رکھتا وہ گوشہ نشینی کو ترجیح دینے لگتا ہے اور عزت پسند بن جاتا ہے، خارجی دنیا سے تعلق قائم رکھنے کی اسے جرأت نہیں ہوتی وہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے تئیں کمزور اور حقیر و بے بس سمجھنے لگتا ہے پھر چونکہ اس قسم کے بچے یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا اس لئے بڑے ہو کر وہ خود بھی زمانہ کے ساتھ کسی قسم کا انصاف یا رواداری برتنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایسے بچوں کو تباہ شدہ بچے *Spilt Children* کہنا چاہئے۔“ ۱۵

والدین کی غیر مساوی محبت کا اثر | یہی حال بچہ کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے والدین اس کے کسی اور بہن بھائی سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور اس سے کم اس احساس کی وجہ سے

۱۵ The Child and his upbringing P. 100.

بچہ میں ایک قسم کا چڑچڑاہن اور احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بسا اوقات اپنے مزاج کی اس خاص کیفیت کو چھپانے یا اس کا پھل کرنے کے لئے بعض ایسی حرکات کرنے لگتا ہے جو دوسروں کو ناگوار ہوتی ہیں مثلاً وہ زیادہ گفتگو کرتا ہے بات بات میں دخل در معقولات دیتا ہے، ہر کام میں اور بچوں سے پیش پیش رہنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی ان سب حرکات کا پس منظر یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی توجہات کا مرکز بننا چاہتا ہے اور اس طرح محبت والدین کی کمی کی مکافات کرنے کی کوشش کرتا ہے اس سلسلہ میں چند مثالیں دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

• امینہ ایک ذہین لڑکی تھی جب وہ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ کلاس روم میں استاد کے سامنے بیٹھتی تھی تو سب سے زیادہ گفتگو کرتی تھی اور استاد خواہ کوئی سوال کسی لڑکی سے پوچھے امینہ بہر حال سب سے پہلے اس کا جواب دینے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے اس شوق میں اس کی بھی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ درحقیقت اُسے سوال کا جواب آتا بھی ہے یا نہیں۔ استاد کو امینہ کے اس رویہ سے بڑی کوفت ہوتی تھی لیکن دراصل اس کا باعث یہ تھا کہ امینہ دو بہنوں میں سے بڑی بہن تھی۔ اس کی جب چھوٹی بہن پیدا ہوئی تو والدین نے اس سے محبت کم کر دی۔ امینہ غریب کے لئے یہی مصیبت کم نہ تھی کہ سمندر ناز پر ایک اور تازہ پیا یہ ہوا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور باپ نے دوسری شادی کر لی۔ ان وجوہ سے امینہ گھر کے ماحول میں جو بیچارگی محسوس کرتی تھی وہ زیادہ باتیں کر کر کے اسکول ماسٹر اور اپنی سہیلیوں کی توجہ کا مرکز بن کر اس کی مکافات کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

اسی قسم کا ایک واقعہ ڈاکٹر واشبرون نے (Dr. Washburne) جو ایک خاص تعلیمی اسکیم (Winnetka plan of Education) کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں اپنی کتاب (Adjusting the School to the Child) میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

”ایک اسکول کی معلمہ جس کا نام مس نوکس Miss Knox تھا، اڈورڈ نامی ایک بچہ سے بڑی تنگ آگئی تھی۔ یہ بچہ اپنی ذہانت اور تیزی طبع کی نمائش موقع بے موقع کرتا رہتا تھا ان حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے اسٹانی نے اس کو مارا پیٹا۔ لاکھ سمجھایا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر جب مس نوکس کا ناک میں رم آگیا تو ایک روز وہ اڈورڈ کے گھر پہنچ گئی، وہاں اُس نے دیکھا کہ اڈورڈ کی ماں نے اپنی تمام توجہ اور محبت اپنے ایک چھوٹے بچہ پر مرکوز کر رکھی ہے۔ باتوں باتوں میں اڈورڈ کی ماں نے مس نوکس کو بتایا کہ ابھی چند روز پہلے کی بات ہے اڈورڈ مجھ سے کہہ رہا تھا ”اماں جان! کیا آپ کے پاس کوئی منٹ ایسا نہیں ہے جس میں آپ مجھ سے بھی تھوڑی بہت محبت کر سکیں“ اب مس نوکس نے اڈورڈ کی ماں سے کہا کہ آپ کو بچہ کے ساتھ اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنی چاہئے ورنہ مستقبل میں اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ ماں نے اسی مشورہ پر عمل کیا اور ادھر اسٹانی نے بھی اس کے ساتھ اپنی روش بدل دی نتیجہ یہ ہوا کہ بچہ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس کی مشکلات باقی نہ رہیں۔“

والدین کی مفراط محبت | اب رہی مذکورہ بالا صورتوں میں سے ایک یہ صورت کہ والدین کو حد سے زیادہ محبت ہو تو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ محبت بھی مختلف صورتوں اور شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے اور ان کے اعتبار سے اس کے اثرات و نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر اس محبت کا ظہور اس طرح ہو کہ والدین ہر وقت بچہ کو سامنے رکھیں کسی ایک لمحہ کے لئے بھی اسے اپنے سے جدا نہ کریں، کوئی کام اسے اپنا ہاتھ سے نہ کرنے دیں، کسی بات پر اس کی روک ٹوک نہ کریں۔ اگر اُس سے کوئی غلط اور نادرست کام بھی سرزد ہو تو اسے شاباش دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ آرام طلب اور عیش پسند ہو جاتا ہے وہ کسی کام کو اپنی ذمہ داری پر نہیں کر سکتا۔ اُس میں کسی حادثہ یا واقعہ کے مقابلہ کرنے کی ہمت بالکل نہیں ہوتی، ایسا شخص محبت کا ایسا بھوکا اور نذیرہ ہو جاتا ہے کہ ہر جگہ سے اس کی ہی تلاش اور جستجو رہتی ہے۔ اسکول میں استادوں سے۔

دفتر میں محکمہ کے لوگوں سے، گھر میں بیوی اور بچوں سے، محلہ میں آس پاس کے پڑوسیوں اور قرابت داروں کے ہر ایک سے وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرے۔ اور اگر اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو وہ دوسروں کو اپنا بد خواہ دشمن اور اس سے بے پروا سمجھنے لگتا ہے بقول ای ڈیکسبرگ کے (E. Weisburg) اس قسم کے بچے بڑے ہو کر بھی ہمیشہ عہد طفولیت کی گشدرہ جنت کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور بچپن میں وہ جس زندگی کے عادی رہے ہیں اسی کو قائم رکھنے کی تمنا اور آرزو کرتے ہیں ڈاکٹر اسٹیکل (Dr. Stekel) لکھتے ہیں ان بچوں میں پیار کی آرزو اور تنہائی کی لاشکی پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی بھتی ہی نہیں۔

لڑکیوں کا حال اس معاملہ میں اور بھی بدتر ہوتا ہے کیونکہ جب وہ بیاہی جاتی ہیں تو بچپن میں والدین کی بے پناہ محبت کی عادی ہو جانے کے باعث وہ شوہر کی بیوی نہیں بلکہ محبوبہ بن کر رہنا چاہتی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ہر بیوی محبوبہ نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر ان کے زنا شوقی تعلقات بگڑ جاتے ہیں اور دونوں کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔

لڑکیوں کے سلسلہ میں ایک اہم بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے اور جس کا غالباً ہمارے گھروں میں عام طور پر خیال نہیں رکھا جاتا یہ ہے کہ بہت سے باپ اپنی سادگی اور ناواقفیت کی وجہ سے سات برس سے زیادہ کی عمر کی بچیوں کو بھی پیار کرتے ہیں، ان کا بوسہ لیتے ہیں انھیں چمٹاتے اور بدن کر دیتے ہیں۔ حالانکہ نفسیاتی طور پر یہ نہایت خطرناک اور بید مضر فعل ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے غیر شعوری طور پر بچی میں جنسی حس بیدار ہو جاتی ہے اور پھر بلوغ کے بعد باپ اسے پیار کرنا ترک کر دیتا ہے تو وہ دوسروں کی اس کی متمنی ہوتی ہے کہ وہ اسے پیار کریں۔ اس طرح پہلے اس میں اشتیاق (Anxiety) پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ اشتیاق اپنی تکمیل کی مختلف راہیں پیدا کر لیتا ہے اور اگر گھر کے ماحول اور اخلاقی تعلیمات کے باعث وہ اس اشتیاق کو دبانے کی مصنوعی کوشش کرے تو اس کی مختلف ذہنی اور دماغی انجھیں اور اعصابی

بیماریاں رونما ہو جاتی ہیں۔ فریڈ تو خیر! ہر محبت کا سر شہہ اور اس کا اصل محرک جنسی خواہش کو ہی قرار دیتا ہے جس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم علمائے نفسیات جن میں بعض خواتین بھی شامل ہیں۔ اپنے تجربات کی بنا پر کہتے ہیں کہ متعدد آوارہ اور بدچلن لڑکیوں کے حالات کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کا اصل سبب ان کے باپ، بھائی، اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کی غیر محتاط محبت ہی تھی۔

ظاہر ہے نفسیات کا یہ باریک نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر فیض اثر سے کس طرح اوجھل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:-

نزد الاولاد کم بالصلوة و ہم ابناء سبع تم اپنی اولاد کو نماز کا حکم کر دیجکہ وہ سات برس
سنین اضر و ہم علیہا و ہم ابناء عشر کی ہو اور نماز نہ پڑھنے پر مارو جبکہ وہ دس سال
سنین فرقا بینہم فی المضاجع (ابوداؤد) کی ہو۔ اور بستروں میں ان کو الگ لگ سلاؤ۔

ہمیں اس جگہ حدیث کے صرف اس آخری ٹکڑے سے بحث ہے بغور کیجئے کس قدر صاف لفظوں میں اس کا حکم ہے کہ دس برس کی عمر کے بعد بچوں کو ایک ہی بستر پر نہیں سونے دینا چاہئے۔ علمائے اس میں کلام کیا ہے کہ آیا یہ حکم مطلق ہے یا مقید۔ یعنی ایک بہن اور بھائی کے لئے تو دس برس کی عمر کے بعد ایک جگہ لیٹنا ممنوع ہے ہی۔ لیکن اگر دو بھائی یا دو بہنیں اس طرح لیٹیں تو اس کا حکم کیا ہے؟ بعض فقہار کے نزدیک یہ جائز ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں جب حدیث کے الفاظ میں عموم و اطلاق ہے تو حکم بھی عام اور مطلق ہونا چاہئے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ایک ہی صنف کے دو افراد کا ایک جگہ لیٹنا شرعاً جائز ہو یا ناجائز تہذیب اور شائستگی کے بہر حال خلاف ہے۔ اس بنا پر بچوں کو شروع سے ہی اس کا عادی بنانا چاہئے مذکورہ بالا حدیث کے علاوہ جہاں تک لڑکیوں کا تعلق ہے ایک اور حدیث خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے ارشاد ہے:-

اذا اتی علی الحارثۃ تسبع سنین ففی امرأۃ - لڑکی جب نو برس کی ہو جائے تو وہ عورت ہے۔
(کنز العمال ج ۸ ص ۲۷۶)

اس سلسلہ میں غالباً یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ اس غیر محتاط منفرط محبت کو علمائے نفسیات اپنی خاص اصطلاح میں ”قابضانہ محبت“ (Possessive Love) کہتے ہیں یعنی یہ ایک ایسی محبت ہے جس میں محبوب سے متعلق محب کی ذہنیت وہی ہوتی ہے جو ایک قابض کی اپنے مقبوض کی نسبت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے صرف اپنے جذبہ خواہش کی تسکین ہوتی ہے وہ اس کو پیار کرتا ہے۔ اسے مس کرتا ہے اپنے ذوق محبت کی حظ اندوزی کے لئے اس وقت اسے اس کا بالکل خیال نہیں ہوتا کہ محبوب کا بھی اپنا کوئی مفاد ہے اور اس پر اس کی ان محبت پاشیوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ نفسیات میں اس کی تعبیر اس طرح بھی کی جاتی ہے کہ یہ محبت ایک خاص قسم کے ضغطہ دماغی کی پیداوار ہے جسے (Narcissus Complex) کہتے ہیں۔ نرسیس یونان کا ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا جو ایک مرتبہ دریا میں اپنی شکل دیکھ کر خود اپنے اور پر عاشق ہو گیا۔ اس ضغطہ دماغی کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی اولاد کے ساتھ حد سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ گویا اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ان کی اولاد خود ان کی شخصیت کا ایک منظر ہے۔ اس لئے ایک انسان کو جس قدر خود اپنا نفس اور اپنی شخصیت محبوب ہوتی ہے اتنی ہی محبت وہ اپنی شخصیت کے خارج منظر یعنی اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔

اب اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بھی قابضانہ اور بالکانہ محبت کی نفی کرتا ہے۔ اولاد کی نسبت اسلام کا تخیل یہ ہے کہ اولاد والدین کے پاس ایک امانت الہی ہے ان کی اولاد ایک مستقل شخصیت ہے اور اس بنا پر جس طرح والدین کے حقوق اولاد کے ذمہ ہیں۔ اسی طرح اولاد کے حقوق بھی والدین کے ذمہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے بچہ کا انتقال ہونے لگا تو زبان وحی ترجمان نے ارشاد فرمایا۔

ان الله ما اخذ ولد ما اعطى بے شبہ اللہ کے لئے ہی ہے وہ سب کچھ جو اس نے لے لیا

وکلّ عندہ باجل اور اس کے لئے ہیں وہ سب کچھ جو اس نے عطا فرمایا
مسمیٰ۔ اور ہر چیز کے لئے اس کے نزدیک ایک مقررہ مدت ہے۔

پھر خود اپنے صاحبزادہ ابراہیم کی وفات پر آپ نے جو الفاظ کہے وہ بھی انھیں کے قریب قریب
ہیں۔ ارشاد ہوا۔ ”آنکھ اشکبار ہے اور دل غمگین، لیکن ہم بہر حال وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہو۔“
یہی وہ اسلامی تخیل ہے جس نے ایک بوڑھے قیدی باپ (مولانا محمد علی مرحوم) کی زبان سے
اپنی پیاری بیٹی آمنہ کی خطرناک علالت کی خبر سنتے ہی بے ساختہ یہ شعر ادا کر دیا تھا جو اسی بیمار کو
خطاب کر کے کہا گیا تھا۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں
پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ والدین سے متعلق یہ سمجھنا شدید غلطی ہے کہ وہ ہمیشہ اولاد سے محبت
ہی کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعدد وجوہ و اسباب سے والدین کو اپنے کسی ایک بچہ
سے یا سب بچوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور کبھی یہ نفرت اتنی شدید ہوتی ہے کہ غیر شعوری طور پر ماں
باپ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بچہ کی موت کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ اہل مشرق میں تو ایسا خال خال
ہی ملے گا۔ مغربی اقوام میں یہ مرض بہت عام ہے۔ کیونکہ مغربی تہذیب نے مادی منفعت اور ذاتی رشتہ
و آرام کو ہر شخص کا مطمح نظر بنا دیا ہے۔ فرائڈ نے اس قسم کے رجحان کے لئے ایک خاص اصطلاح
(Ambivalence) کی وضع کی ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں خون سپید ہو جانے کا ایک محاورہ ہے
وہ اسی قسم کے موقع پر بولا جاتا ہے جب کہ باپ کو اولاد کے ساتھ۔ اولاد کو والدین کے ساتھ۔ بہن کو
بھائی کے ساتھ وہ محبت نہ ہو جو ان میں آپس میں قدرتی رشتہ کی بنا پر طبعی طور پر ہونی چاہئے۔ نفیات
کی کتابوں میں اس Ambivalence کی بڑی دلچسپ اور کثرت سے مثالیں ملتی ہیں
لیکن یہاں ہم ذیل میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔

مسٹر اے ایس نیل (A. S. Neil) اپنی تصنیف ”بچہ کی گتھی“ *The Problem Child* میں لکھتے ہیں ”ایک عورت جھکو بڑے بڑے طویل خطوں میں اپنی بچی کے متعلق ہدایات لکھتی تھی کہ اس کو کس وقت کیا کھانا چاہئے اور کیا نہیں کھانا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجھ کو ان خطوط سے شبہ ہوا کہ یہ عورت غیر شعوری طور پر اپنی بیٹی کی موت چاہتی ہے۔ بعد میں مجھ کو اس کی تصدیق بھی ہو گئی اور وہ اس طرح کہ ایک روز یہ عورت مجھ سے ملنے آئی اور باتوں باتوں میں کہنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب اگر میری یہ بیٹی زندہ نہ ہوتی تو میں آزاد ہوتی اور جس سے میں محبت کرتی ہوں اس کے ساتھ جاسکتی تھی“ موصوف اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ”اصل بات یہ ہے۔ ماں غیر شعوری طور پر بچی کی موت چاہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کی تندرستی سے متعلق جو تشویش اور غیر معمولی فکر و تردد کا اظہار کرتی تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح اپنی غیر شعوری خواہش کا زائد از ضرورت بدل

(Over-Compensation) کرنا چاہتی تھی۔

والدین کی محبت اور | مذکورہ بالا سطور سے یہ اندازہ ہو گا کہ والدین کو اولاد سے جو تعلق ہوتا ہے اس اسلامی تعلیمات میں نفسیاتی طور پر کس قدر الجھنیں اور پیچیدگیاں ہیں اور یہ صاف ظاہر ہے کہ

ان الجھنوں کے صحیح حل پر ہی بچوں کی اور اس طرح گویا پوری نسل کی فلاح و بہبود اور ان کو صحیح معنی میں ”انسان“ بنانے کا دار و مدار ہے۔ علمائے نفیات نے ساہا سال کے تجربات و تحقیقات کے بعد فطرتِ انسانی کی خام کاریوں کا سراغ لگایا اور ان کو دور کرنے کے لئے کامیاب حل کی جستجو کی۔ آپ کو گزشتہ بیانات سے اُن کا ایک اجمالی خاکہ معلوم ہو چکا۔ اب ذرا یہ بھی سن لیجئے کہ اسلام نے کس طرح انسانی فطرت کی ان کمزوریوں کو پہلے ہی بھانپ لیا اور ان کا حل بتا دیا تھا۔ ماہرینِ نفیات نے جو بات ساہا سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد ضخیم ضخیم مجلدات میں کہی ہے۔ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند فقروں میں ہی اس حقیقت کو آشکارا کر دیا اور زیادہ بہتر محکم تر اور قطعی تر طریقہ پر۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس رجحان سر دہری "یا جذبہ تنفر کو لیجئے جو والدین کے دل میں سب اولاد یا کسی ایک کی نسبت ہوتا ہے اور جیسا کہ ابھی مذکور ہوا۔ فرائنڈز اس کو Ambivalence کہتا ہے۔ اولاد سے متعلق بیزاری کا یہ جذبہ زیادہ تر اس سے ہوتا ہے کہ ماں باپ معاشی اعتبار سے تنگ دست ہوتے ہیں۔ انھیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ خود ہم دونوں میاں بیوی کی ہی گذرتنگی ترشی سے ہوتی ہے۔ اولاد ہوگی تو ادبھی مشکل ہو جائے گی۔ یا اس بیزاری کا سبب یہ ہوتا ہے کہ بالفعل تو انھیں اولاد کے ہونے سے کوئی دشواری اور تنگ دستی پیش آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ البتہ مستقبل کے بارہ میں ان کو یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر اولاد نہ ہو رہتی رہی تو پھر ان کے ذرائع معاش کفالت نہیں کر سکیں گے۔ قرآن مجید میں ان دونوں اسباب کی طرف الگ الگ اشارہ فرما کر اولاد سے متعلق بیزاری کا جذبہ رکھنے کی صاف ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ أَمْلَاقٍ تَمِ ابْنِیْ اَوْلَادِکُمْ تَنْکُحُوْنَ اَمْوَالتَکُمْ

نحن نرزقکم وایاھم ہم ان کو اور تم کو دونوں کو رزق دیتے ہیں۔

یہ آیت جو سورۃ انعام کی ہے اس میں لفظ "من اطلاق" کا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ افلاس بالفعل ہے اور موجود ہے۔ پھر یہی آیت بنی اسرائیل میں آئی ہے مگر وہاں لفظ "خشیتہ اطلاق" ہے۔ اس لفظ خشیتہ سے اشارہ اس طرف ہے کہ تنگ دستی بالفعل نہیں ہے۔ البتہ اولاد کی پیداوار کے بڑھتے رہنے سے اندیشہ ہے کہ آئندہ حالات پریشان کن ہو جائیں تو قرآن نے اس سے بھی منع فرمادیا ہے۔

اولاد کے معاملہ میں سب سے زیادہ بد قسمت سمیتہ بیٹیاں رہی ہیں۔ عہد جاہلیت میں اونچی ناک والے عرب تو ان غریبوں کو زندہ درگور ہی کر دیا کرتے تھے جس پر قرآن مجید نے انھیں یہ کہہ کر لٹکا را۔

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ

اور جبکہ زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائیگا

ذَمِّ قَتَلَتْ۔ کہ اُسے کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔

اگرچہ عرصہ دراز ہوا یہ انسانیت سوز رسم مٹ گئی لیکن واقعہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے اس جگہ گاتے

دور میں بھی بیٹوں کی نسبت عام انسانی ذہنیت مکمل طور پر درست نہیں ہوتی ہے۔ آج بھی اعلیٰ و اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ لڑکی کے پیدا ہونے پر اتنی خوشیاں نہیں منائی جاتیں جتنی کہ لڑکے کی پیدائش پر منائی جاتی ہیں۔ عام بول چال میں لڑکی ہوتی ہے تو باپ سے ازراہ ہمدردی اس کے دوست احباب ہی کہتے ہیں کہ آہ! غریب پر ڈگری ہو گئی، چونکہ یہ حد درجہ افسوسناک ذہنیت انسانی دماغوں میں بری طرح جڑ بکڑ چکی تھی۔ اس لئے قرآن نے اس پر خاص طور سے متنہ کیا۔ دیکھئے! کس عجیب و غریب اور انتہائی بلیغ و موثر انداز میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنْثَىٰ ۖ ظَلَّ
وَجْهَهُ مَسْودًّا ۖ وَهُوَ كَظِيمٌ ۝
يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ
إِيسَىٰ عَلَىٰ هُونٍ ۖ أَم يَدَّبْهُ
فِي التُّرَابِ ۖ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۚ

ان میں سے کسی ایک کو بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری
دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ فدا کا لاپڑ جاتا ہے اور وہ
جی ہی جی میں گھٹنے لگتا ہے اب وہ اس بری خوشخبری کی
وجہ سے لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے وہ نہیں جانتا کہ اس
مولود کو ذلیل ہوتے ہوئے زندہ رہنے دے یا اُسے مٹی میں
داب دے۔ سنو! کتنا برا ہے یہ فیصلہ۔

غور کرنا چاہئے اس آیت میں کس بلاغت کے ساتھ ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اولاد کے معاملہ میں بیٹا اور بیٹی میں تفریق کرتے ہیں اور بیٹی کے پیدا ہونے پر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

۱۔ اس موقع پر مجھے اپنی مرحومہ چھوٹی بہن کا جو نہایت ذہین اور قابل تھی ایک اقبہ یاد آیا۔ ایک روز اسلام میں عورتوں کے مرتبہ وحیثیت پر گفتگو کے دوران میں کہنے لگی ”بھائی! کفار عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے جب خدا انسان کی ترویج کی تو ان لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا ”تم اپنے لئے تو بیٹے رکھتے ہو اور خدا کیلئے بیٹیاں یہ کیا حکم کرتے ہو“ مرحومہ نے اس کو نقل کر کے کہا اس سے تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹیاں اللہ کے نزدیک بھی بیٹوں سے فروتر ہیں۔ میں نے جواب دیا ”اسلام میں عورت مرد کی نسبت صنف ضعیف و کمزور ضرور ہے لیکن فروتر بالکل نہیں، اور اس کا ضعیف ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آج کل کے تمام ماہرین طبیعات و عضویات اور تمام ڈاکٹر تسلیم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن میں مردوں کو تو ”امون علی النساء“ کہا گیا ہے یعنی عورتوں کے دیدبان و نگران، اب رہی آیت زیر بحث تو اس پر خدا نے ان لوگوں کے دل کے کھوٹ کا پردہ چاک کیا ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتاتے تھے۔ منشا یہ ہے کہ بیٹیاں تو تمہارے خیال میں ۲

بیٹوں سے کمزور و ذلیل ہوتی ہیں یہ بصریہ کیا بات ہے کہ اچھی چیز اپنے لئے ثابت کرتے ہو اور کم چیز کی چیز کا انتساب خدا کی طرف کرتے ہو۔ ورنہ ظاہر ہے تفریق میں متدور و متدور واقع ہو کر فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے لئے یہ بیٹیاں تمہارے گھر زخمی ہیں۔ اس کی ذات سمیع الصفات تو ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے۔

انجیبا نقشِ دوام

از جناب ماہر القادری

یہ کہہ رہی ہو بہت دن کر میرے دل کی اُمنگ جاب سے بھی ہے کمزور سطوتِ افرنگ
تری نظر ہے اسیرِ طلم محسوسات مری نگاہ، شہیدِ تجلی ہے رنگ
مری نگاہ میں پانی کی یہ لکیریں ہیں نگار خانہ بہزاد و صنعتِ ارتنگ^۱
تنزلات کی بجائیں یہ فرق و جمع کا راز^۲ یہی ہے خانقہ درسی در زبانِ چنگ
فقیرِ شہر کی یہ رخصتیں یہ تاویلین جوازِ سود کے پردے میں ہے خدا سے جنگ
سادگی، نہ صداقت نہ عصمتِ کردار کہ سازِ دل جو زباں سے نہیں ہے ہم آہنگ

جو دل میں سوز نہیں دل ہے جسِ ناکارہ

نہ ہو چمک تو ہے آئینہ ایک پارہ سنگ

۱۔ ایران کے مشہور مآنی کے مرقع کا نام۔ ۲۔ تصوف کی مشہور اصطلاحیں۔

قطعات

از جناب رشید ذوقی

کیسے کیسے وقت گزرے ہیں نہ پوچھ جیسے میری زندگی تھی لازوال
 جس ادا پر مسکرا دیتا تھا دل ختم ہوتی تھی وہیں حدِ جمال
 درد چپکا، آنکھ پر نم ہو گئی آگئی ہونٹوں پہ جانِ بیقرار
 دل بھی ڈوبا صبح کے تار کے ساتھ آہ، یوں ٹوٹا طلسم انتظار
 تیرے جلووں کی نضائیں قدرِ ثا زندگی بڑھتی ہے اہل درد کی
 لطف دیتی ہے فغانِ نیم شب بات بن جاتی ہے آہِ سرد کی
 آہ، وہ راتیں وہ مدہم روشنی نازہ آرائش، نئی رنگینیاں
 میرے استقبال کو چاروں طرف دور تک پھیلی ہوئی بیچینیاں
 افتراقِ جان و تن ممکن ہی غم فنا انجام ہو سکتا نہیں
 برق شاید چھوڑ دے دامنِ بار دل متاعِ درد کھو سکتا نہیں
 مدتیں گزریں کہ دیکھا ہی نہیں چشمِ ویراں نے کوئی عالم نیا
 اب کبھی مل بھی سکیں گے دیکھے چاندنی رات اور وہ جانِ جا
 یہ شبِ ہمتا یا یہ ٹھنڈی ہوا نور میں ڈوبی ہوئی ساری فضا
 ان چمکتے آئینوں میں آج بھر جگمگا اٹھی تری اک اک ادا

تبصرے

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
 تقطیع متوسط نائب جلی اور روشنی ضخامت ۳۵۲ صفحات قیمت

Muslim Conduct
 of State

معلوم نہیں۔ پتہ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ہمارے ملک کے اُن قابلِ فخر افاضل میں سے ہیں جو علومِ جدیدہ میں اعلیٰ قابلیت رکھنے کے ساتھ اسلامی نظامِ سیاست و احکام میں محققانہ اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ دل اور دماغ کے اعتبار سے بھی بچے اور سچے مسلمان ہیں۔ آپ کی متعدد تصنیفات اور مقالات عربی، انگریزی، فرنچ اور اردو میں شائع ہو کر ہندوستان اور اس سے زیادہ بیرونی ممالک کے علمی حلقوں میں بڑی وقعت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے ہیں زیر تبصرہ کتاب میں جو دراصل کتاب کا دسراڈیشن ہے، موصوف نے امن، جنگ اور غیر جانبداری سے متعلق اسلام کے بین الاقوامی قوانین و احکام پر بڑی فاضلانہ اور محققانہ بحث کی ہے۔ کتاب چار حصوں پر تقسیم ہے اور ہر حصہ میں متعدد ابواب ہیں۔ پہلے حصہ میں بین الاقوامی قانون کی تعریف، ابتدائی مصطلحات موضوعات بحث، مقاصد اور اسلامی قوانین، بین الاقوامی کے آخذ اور اصول پر بحث ہے۔ دوسرے حصہ میں زیادہ امن کے بین الاقوامی، اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور تجارتی معاملات و تعلقات پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ ان بین الاقوامی مسائل و امور سے متعلق ہے جو بڑا نہ جنگ پیش آتے ہیں۔ اس میں جنگ کی تعریف اور اس کی قانونی شکلیں بیان کرنے کے بعد تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں جنگ قانوناً کب جائز اور بعض اوقات ضروری ہوتی ہے پھر جب جنگ چھڑ جاتی ہے

تو اس میں کن کن امور کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جن لوگوں سے جنگ لڑی جاتی ہے ان کے مختلف حالات اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے دوران جنگ میں اور اس کے بعد ان کے ساتھ اور ان کے ملک کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں باغی مسلمان کافر راہزن۔ بحری ڈاکو۔ ذمی۔ حربی۔ غلامی۔ تاوان جنگ۔ ٹیکس۔ صلح۔ قیدیوں کا تبادلہ وغیرہ یہ سب مسائل زیر بحث آگئے ہیں۔ حصہ آخر غیر جانبداری کے شرائط اور اس کے قوانین و احکام کے لئے وقف ہے۔ اس کے بعد ضمیمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض خلفاء و صحابہ کرام کے خاص خاص احکام سے متعلق نہایت قیمتی فرامین کی نقلیں ہیں اور پھر کتاب کے مآخذ کی فہرست اور اعلامیہ و اشاریہ ہیں۔

کتاب میں جزئی اعتبار سے کہیں کہیں کلام کرنے یا اضافہ و ترمیم کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۰ پر لکھا ہے ”اگر کسی خلیفہ راشد کا عمل کسی عام مروج حدیث کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہئے کہ خلیفہ راشد کے پاس ضرور کوئی حدیث ہے“ اس کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ یہ نظری طور پر تو صحیح ہے لیکن مجھے اس سلسلہ کا کوئی قطعی واقعہ معلوم نہیں“ گذارش یہ ہے کہ اس طرح کے متعدد واقعات کتب حدیث میں موجود ہیں جن کی طرف موصوف کا ذہن منتقل نہیں ہو سکا۔ مثلاً فاطمہ بنت قیسؓ کی حدیث دربارہ مطلقہ کو حضرت عمرؓ کا رد کر دینا اور اقرع بن حابس کو تالیف قلب کی بنا پر زکوٰۃ دینے کو انکار کر دینا بہر حال اس میں شبہ نہیں کتاب بحیثیت مجموعی نہایت فاضلانہ اور محققانہ ہے اور مصنف کی آرزو اور غرض تصنیف کے مطابق اس لائق ہے کہ اس کو اسلام کی طرف سے یورپ کے سامنے پیش کیا جائے اور اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی جائے کہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد مغرب کے بین الاقوامی قوانین میں جس تغیر و تبدل کی عام ضرورت محسوس کی جا رہی ہے آیا اسلام کا یہ قانون اس ضرورت کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟ فجزاہ اللہ عن المسلمین جزاء خیراً۔

ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک | از مولانا مسعود عالم ندوی تقطیع متوسط طبعات و کتابت بہتر

ضخامت ۵، صفحات قیمت درج نہیں پتہ: دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن۔

ہندوستان میں حضرت سید احمد صاحب شہید اور ان کے رفقاء کرام کی تحریک سب سے پہلی تحریک ہے جس کا اولین مقصد تبلیغ و جہاد کے ذریعہ اس ملک میں خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنا اور اس طرح کلمۃ اللہ کو سر بلند و سرفراز کرنا تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ معرکہ بالاکوٹ کے بعد بھی یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ نہایت منظم اور مرتب شکل میں۔۔۔ ایک عرصہ دراز تک مشرقی بنگال سے لیکر درہ خیبر تک پھیلی رہی۔ تحریک کے بانی حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور اس ضمن میں تحریک کے مختصر حالات میں تو چھوٹی بڑی کتابوں کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی کی سیرت سید احمد شہیدؒ پہلے سے موجود ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں خاص تحریک کے تاریخی تسلسل سے بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں فاضل مصنف نے ان غلط فہمیوں کے ازالہ کی بھی کوشش کی ہے جو چند بیرونی اور اندرونی اسباب کی بنا پر بعض دماغوں میں پیدا ہو گئی ہیں مثلاً یہ کہ تحریک ”وہابیت“ بخدا اور تحریک سید احمد شہید دونوں ایک ہی ہیں۔ یا موخر الذکر پہلی کا شاخسانہ ہے۔ اس ضمن میں مصنف کے قلم سے ہندوستان کی موجودہ جماعت اہل حدیث کی نسبت جو چند مبایاختہ کلمات نکل گئے ہیں (ص ۴۷) وہ ان کی اسلامی دلسوزی کا بین ثبوت ہیں۔ البتہ اس کا افسوس ہے کہ موصوف کے قلم تنقید کی زد میں ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹریسے حق ناشناس و اسلام نا آشنا لوگوں کے علاوہ مولانا عبید اللہ سندھی ایسا مفکر اسلام اور دقیقہ رس عالم بھی آگیا ہے واقعہ یہ ہے کہ حضرت سید احمد صاحبؒ اور ان کی تحریک کا قدردان مولانا سندھی سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے لیکن جس طرح لائق مصنف نے مجاہدین کی کمزوریوں کا ذکر کر کے ان پر تنقید کی ہے اور اگر تاریخ کا یہ فائدہ ہے کہ ماضی کے واقعات سے مستقبل کے لئے کوئی عبرت حاصل کی جائے تو بلاشبہ ایک مفکر کو اپنی تاریخ کا مطالعہ تنقیدی زاویہ نگاہ سے کرنا چاہئے۔ اسی طرح مولانا سندھی نے بھی اپنے

علم اور فکر کے مطابق اس تحریک کے بعض متاخر علمبرداروں کا متفقہ جائزہ لیا ہے اور چونکہ مولانا تقریر و تحریر پر اور بعض اوقات اپنے جذبات پر بھی قدرت نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کے قلم سے کبھی کبھی ایسے الفاظ نکل جاتے تھے جو ان کے دل کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ علمائے صادق پور پرزیدیت اور شیعیت کا الزام اور دہلی کی سلطنت کے مضبوط بنانے کو تحریک کا مقصد بتانا یہ سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں جو قصور بیان سے پیدا ہوئی ہیں۔ بہر حال اگرچہ نفس تحریک کی اہمیت اور اس کی وسعت و اثر کے اعتبار سے جیسا کہ مصنف نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ یہ کتاب اب بھی تشنہ ہے۔ تاہم بڑی محنت اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ جملہ جملہ اور فقرہ فقرہ سے مصنف کا اسلامی درد اور سوز و گداز ٹپک رہا ہے اس کا مطالعہ دینی اور عظمیٰ دونوں حیثیتوں سے بہت مفید اور سرمایہ غیرت و بصیرت ہو گا۔ لیکن املا اور کتابت و طباعت کی غلطیاں بے شمار ہیں جنہوں نے کتاب کو داغدار بنا دیا ہے۔

فکر جمیل | از جناب سید جمیل واسطی صاحب تقیہ خود ضخامت ۱۲۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ ۱۔ بشیر احمد صاحب اینڈ ستر جونا مارکیٹ کراچی۔

روفیسر سید جمیل صاحب واسطی ایم اے (کنیٹ) سے قارئین برہان خوب واقف ہیں۔ موصوف جس طرح انگریزی اور اردو دونوں کے فاضل اور ادیب ہیں اردو زبان کے شاعر شیوا بیان بھی ہیں۔ آپ کی غزلیں اور نظمیں بچا کے وقیع ادبی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کتاب موصوف کی ہی منظوم کلام کا مجموعہ ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن معنی اعتبار سے اس کے بلند اور معیاری ہونے میں شبہ نہیں۔ شاعر پر قنوطیت اور حزن و الم کا غلبہ معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی یہ غم پسندی میدان سعی و کوشش میں تنگ نہ دو کرنے کی باز نہیں رکھتی۔ ان کے اشعار میں عمیق تفکر، بلند تخیل، کیفیات انسانی کا تجزیہ۔ احساساتِ دلی کا اثر آفریں پیرایہ بیان یہ سب اوصاف پائے جاتے ہیں اور بڑی بات یہ کہ فکر جمیل صدی اور معنوی دونوں حیثیتوں میں آج کل کی ترقی پسند شاعری کی گندگیوں سے محفوظ ہے۔ پیش لفظ سر شیخ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے جس میں انھوں نے شاعر کو دل کھول کر داد دی ہے امید ہے اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

۳۲۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعمہ مجلد ۵۰
اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب
جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ
پیش کیا گیا ہے قیمت ۳۰ روپے مجلد للعمہ

خلافت راشدہ۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں
عہد خلفائے راشدین کے تمام قابل ذکر واقعات
صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں
قیمت ۳۰ روپے مجلد للعمہ

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ ۴۴
۳۳۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغت قرآن
پر بے مثل کتاب ۳۰ روپے مجلد للعمہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا مختصر ششہ
ورفتہ ترجمہ قیمت ۳۰ روپے

اسلام کا نظام حکومت۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ
کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطہ حکومت کے
تمام شعبوں پر دفعات و اربکمل بحث۔ قیمت
۴۰ روپے مجلد سات روپے۔

خلافت بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے
بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ۳۰ روپے مجلد للعمہ

۳۴۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت
جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، انداز
بیان دلکش قیمت للعمہ مجلد ۵۰

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی
قیمت للعمہ مجلد ۵۰

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعمہ مجلد ۵۰
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی۔

قیمت ۳۰ روپے مجلد للعمہ
۳۵۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت

کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین
اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبودیت مع الالوہیت
مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور

اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح
کیا گیا ہے قیمت ۳۰ روپے مجلد ۵۰

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؑ
کے حالات مبارک کا بیان قیمت ۳۰ روپے مجلد للعمہ

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر قابل مطالعہ کتاب
صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ۳۰ روپے

نیچر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No.L. 4305

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

- (۱) محسن خاص :- جو مخصوص حضرات کم کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔
- (۲) محسنین :- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطہ نظر پر نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔
- (۳) معاونین :- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جن کا سالانہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔
- (۴) احتیاء :- نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے اجاب میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

- (۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔
- (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں
- (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائیگا
- س کے بعد شکایت قابل اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔
- (۴) جواب طلب امور کے لئے اگر کالمٹ یا جوابی کارڈ بھیجا ضروری ہے۔
- (۵) قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی دھروپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/-
- (۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قریب باغ شائع کیا

مصنفین دینی کا علمی و دینی کامہنا
ندوة اہلین

برکات

مرتب
سعید احمد کسرا آبادی

مطبوعات ندوۃ الدین لمصنفین دہلی

سلسلہ ۳۹: اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ جدید ایڈیشن جس میں حک و فک کے بعد ضروری اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین بنایا گیا ہے۔ قیمت ۳۰ روپے۔	سلسلہ ۳۹: اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے کئے گئے ہیں۔ ستر مجلد للعصر
سلسلہ ۴۰: قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات تک ۳۰ مجلد سے	تعلیمات اسلام اور سچی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ۱۰ روپے۔
وحی الہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب۔ ۱۰ مجلد سے	سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق فیمبر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ۔ ۱۰ مجلد للعصر
بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے جدید ایڈیشن جس میں نہایت اہم تازہ ترین اضافے کئے گئے ہیں حجم پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے اور ۱۰۰ روپے تک کی	ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۱۰
تمام بین الاقوامی معلومات آگئی ہیں۔ پانچ روپے۔	سلسلہ ۴۱: نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں میرتب سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے جدید ایڈیشن جس میں
تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید ایڈیشن دو روپے	اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ ۱۰
سلسلہ ۴۲: قصص القرآن حصہ دوم: حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ کے حالات تک۔ ۱۰ مجلد للعصر	فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہر اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب۔ ۱۰
اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا ایڈیشن ۱۰	غلامان اسلام۔ انہی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کاموں کا تفصیلی بیان جدید ایڈیشن۔ قیمت ۳۰ روپے
مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید ایڈیشن ۱۰	اخلاق اور فلسفہ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط

بہشت

شمارہ (۶)

جلد ہفتم

جون ۱۹۴۷ء مطابق رجب ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

۳۲۲	سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے	۱۔ نظرات
۳۲۳	سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے	۲۔ موجودہ فرقہ وارفادات اور اسلام
۳۵۴	پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے	۳۔ ۱۹۵۷ء سے پہلی کی دہائی
۳۶۹	مولوی حافظ رشید احمد صاحب ارشد ایم۔ اے	۴۔ عربی ادب میں بہار یہ مضامین
		۵۔ ادبیات :-
۳۸۱	جناب حامد عثمانی	عرض شوق
۳۸۲	ج۔ م	۶۔ تبصرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات

حکومت ہند کی جدید پالیسی کے مطابق آج کل آل انڈیا ریڈیو پر خبروں کے بلٹین میں اردو زبان کی جوگت بن رہی ہے اس پر کوئی شخص بھی ہندو ہو یا مسلمان جس کی مادری زبان اردو ہے بے چینی اور اضطراب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر ہندوستان کے نئے نظام کا نقشہ اسی پنج پر مرتب ہوا تو اس کے اس آغاز سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں تک ہمارے ادب اور زبان کا تعلق ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں سے قطع نظر شمالی ہند کے ہندوؤں میں بھی ایسے کتنے ہیں جو اختیار، جلسہ، انتظام، دستور، سلسلہ، امن کے اصول، مطابق، نکتہ چینی وغیرہ ایسے عام اور متداول لفظوں کے مقابلہ میں ادھیکار، بیٹھک، پرو بند، ودیان، سبندہ، شانتی کے اویالو، انوسار اور آلوچھا وغیرہ نامانوس واجبی الفاظ کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہوں پھر لکھنے والے کے مقابلہ میں لکھیت، وزیر ہند کے مقابلہ میں بھارت منتری اور جاننے والے کے بالمقابل جان کار ایسے لفظوں پر کوئی خوشنمائی اور خوبی و سہولت ہے کہ پرانے لفظوں کو ترک کر کے ان نئے لفظوں کو خواہ مخواہ ٹھونسنا جا رہا ہے۔

لیکن کوئی بتائے کہ اب ہم اس کی شکایت کریں تو کس کریں۔ اس کمیٹی سے کریں جو ایک ہندو اور دو مسلمانوں پر مشتمل تھی اور جس کی متفقہ رپورٹ پر ہی حکومت ہند نے یہ پالیسی بنائی ہے اور جس نے اصولی اور بنیادی غلطی ہی یہ کی ہے کہ اردو، ہندی، اور ہندوستانی۔ ان تین مختلف زبانوں کا وجود تسلیم کر کے گویا خود یہ مان لیا کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں ہے۔ یا اس کا الزام اس سیاست نافرجام کے سر لگائیں جس نے ہندوستان کو صحیح معنی میں "دونخ نشان" بنا کر رکھ دیا ہے اور جس کے باعث زبان ایسی مشترک چیز کے بھی تناسباً کے معیار پر حصے بخرے کئے جا رہے ہیں۔ آہ! وہ ہندوستان "جنت نشان" جو کل تک اتفاق و رواداری کا آسرا و شاداب چمن تھا، آج سراسر خارستان عداوت و منافرت بنا ہوا ہے۔

جیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوہر کو میں

موجودہ فرقہ وارفسادات اور اسلام

فاش می گویم واز گفتم خود دل شام
بندہ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

از

سید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے

نہایت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ ہندوستان میں فرقہ واکشیدگی۔ دونوں فرقوں کے بڑے بڑے اور ذمہ دار لیڈروں کے مشترکہ اعلانات کے باوجود فرقہ برز بڑھتی جا رہی ہے اور اس نے تمام ملک کو ایک جہنم کردہ شر و فساد بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس فرقہ واکشیدگی یا آپس کی ماردھاڑ کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہے۔ ایک مسلمان کسی ہندو یا سکھ پر یا کوئی ہندو اور سکھ کسی مسلمان پر حملہ کرتا اور اسے مارتا ہے، یا کسی اور قسم کا اسے دکھ پہنچاتا ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ حملہ آور مسلمان ہے یا ہندو یا سکھ ہے، اور اس کے برخلاف جس شخص پر حملہ کیا گیا ہے وہ حملہ آور کے مذہب کے برعکس کسی اور مذہب کا پیرو ہے، اگر مذہب کا یہ اختلاف درمیان میں حائل نہ ہوتا تو یقیناً حملہ آور اپنے حریف پر حملہ نہ کرتا۔ پس جب فرقہ واکشیدگی اور موجودہ تباہ کن صورت حال کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہے تو اب ہر فرقہ کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس پر غور کریں کہ فرقہ پروری کی جس راہ پر وہ آج گامزن ہیں اس کے

بارہ میں خود ان کے مذاہب کے احکام کیا ہیں؟ کسی شخص کے لئے اس سے بڑھ کر بد نصیبی اور بد قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ مذہبی جذبہ سے ایک نہایت خطرناک کام کرے، حالانکہ خود مذاہب اس کو ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے اور اُس کام کے کرنے پر اُس کو وعیدِ الہی اور عذابِ اخروی سے ڈراتا ہے قرآن مجید کی زبان میں اسی قسم کے لوگ ہیں جو خسر الدنیا والآخرۃ ذلک ہوا لخسران المبین۔ دنیا اور آخرت دونوں گنہگارے اور یہی بڑا ٹوٹا ہے ”کا مصداق ہیں۔

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے انہیں بتانا چاہئے کہ اس باب میں اُن کے مذاہب کی تعلیمات کیا ہیں؟ انہوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے یا اب کر رہے ہیں کیا اُن کے مذاہب اس کو جائز قرار دیتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اُن کو اخلاقی جرأت سے کام لیکر صاف لفظوں میں اس کا اعلان کرنا چاہئے۔ اور اگر واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اُن کے لیڈروں کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے ان کا مذاہب اس نوع کے وحشیانہ اور غیر انسانی اعمال و افعال کو ایک لمحہ کیلئے بھی جائز نہیں ٹھہراتا تو اب اُن کا فرض ہے کہ وہ ماضی میں جو کچھ کر چکے ہیں ایک شریف اور سچے انسان کی طرح اس پر صاف دلی کے ساتھ اظہارِ ندامت و افسوس کریں اور عملاً اس کی مکافات کی سعی کریں۔

اب رہے مسلمان! تو جہاں تک ان کا تعلق ہے ہم چاہتے ہیں کہ ایک بار صاف صاف لفظوں میں بتا دیں کہ اس باب میں اسلام کی تعلیمات کیا ہیں! تاکہ ان کی روشنی میں مسلمان یہ فیصلہ کر سکیں کہ جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں وہ جو کچھ کر رہے ہیں اسلام کی نظر میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی موجودہ مسموم فضا میں آئے دن دونوں طرف؟ اس قسم کے واقعات پیش آرہے ہیں جو دوسرے فرقہ کے لوگوں کے لئے حد درجہ اشتعال کا سبب ہوتے ہیں لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ وہ ہر لحاظ سے کامل

اور مکمل دین ہے۔ جنگ ہو یا امن، اپنوں کے ساتھ معاملہ کا سوال ہو یا غیروں کے ساتھ۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق کوئی قطعی روشنی اسلام کی تعلیمات میں موجود نہ ہو، اور ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اشتعال انگیز حالات اور شدید ترین مہیجات کی موجودگی میں بھی وہی کام کرے جس کا اس کو خدا اور رسول نے حکم دیا ہے۔ پھر کسی شخص یا جماعت کے بلند کمر یا اعلیٰ مکارم اخلاق کا ثبوت بھی اُسی وقت ملتا ہے جبکہ وہ سخت نامساعد اور مخالف حالات میں بھی اپنے مخصوص نظام اخلاق پر سختی کے ساتھ قائم رہے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اُس کے جماعتی کردار یا ملی وقار کی پشیمانی کا بدنامدار غ ہو۔

اس بنا پر ہم چند بنیادی حقائق بیان کرتے ہیں، امید ہے اگر مسلمانوں نے ان کو پیش نظر رکھا اور اس پر عمل بھی کیا تو وہ اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنے لئے فلاح اور عافیت کا سامان پیدا کر سکیں گے بلکہ اپنی اخلاقی عظمت کا دوسروں کے دلوں پر ایک ایسا نقش قائم کر دیں گے جو مٹانے کی لاکھ کوشش کے باوجود مٹ نہ سکے گا۔ بقول اقبال مرحوم

سجدۂ تو بہ آوردا ز دلِ کافراں خروش
اے کہ دراز تر کنی پیش کساں نماز را

انسانی جان کا احترام | اسلام چونکہ مذہبِ امن و عافیت ہے اور دنیا میں امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ بنی نوع انسان اپنے سینکڑوں قسم کے باہمی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کی انسانی زندگی کا احترام کرنا سیکھیں۔ تاکہ خدا کی یہ وسیع سرزمین ظلم و فساد کی آماجگاہ بننے سے محفوظ رہے۔ اس بنا پر قرآن مجید میں بڑے شد و مد اور تکرار و اصرار کے ساتھ انسانی جان کا احترام کرنے کی تاکید فرمائی گئی اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کیلئے شدید ترین عذابِ الہی کی وعید نازل کی گئی،

قرآن مجید میں حضرت آدمؑ کے دو بیٹے قابیل اور ہابیل کا واقعہ بیان کرنے کے بعد جس میں ایک نے دوسرے کو بلا کسی وجہ کے قتل کیا تھا ارشاد فرمایا گیا ہے۔

من اجل ذالك كتبنا على اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے حق میں یہ لکھ دیا کہ
بنی اسرائیل نہ من قتل نفساً بغير جو کوئی شخص کسی شخص کو قتل کرے بغیر اس بات کے
نفس او فساد فی الارض کہ مقتول نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد
فکانما قتل للناس جميعاً ومن کیا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا اور
احياها فکانما احيا الناس جو شخص کسی کی جان بچائے تو گویا اس نے تمام
جميعاً۔ انسانوں کی جان بچائی۔

انسانی زندگی کے احترام کے متعلق اسلام کا جو نقطہ نظر ہے مندرجہ بالا آیت اس میں ایک بنیاد اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے پھر اسی آیت میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

ولقد جاءتهم رسلنا بالبينات ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر کھلی کھلی نشانیاں لیکر
ثم ان كثيرا منهم بعد ذلك فی آئے لیکن اس کے بعد بھی ان میں ایسے بہت ہیں
الارض مسرفون۔ جو زمین میں حدت تجاوز کرتے ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ انسانی جان کے احترام کا فرض کسی خاص نبی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں ان کی تعلیمات میں یہ حکم امر مشترک کی حیثیت سے ہمیشہ قائم اور باقی رہا ہے ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے جہاں شرک اور قتل اولاد کی ممانعت اور والدین کے ساتھ احسان کا حکم فرمایا ہے ارشاد ہے۔

ولا تقتلوا النفس التي حرم الله اور جس جان کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اس کو قتل
الا بالحق ذلکم وصاکم به لعلمکم مت کرو مگر اس وقت جبکہ حق کا تقاضا ہو اللہ

تعقلون۔ نے ان باتوں کی تمہیں تاکید کی تاکہ تمہیں عقل آئے۔

علاوہ بریں ایک اور جگہ نیک بندوں کی صفات کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا۔

لَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر

الْبَاطِلِ وَالْظَّالِمِ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ حق کے قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو

ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا۔ کوئی ایسا کرے گا پاداشِ عمل بھگتے گا۔

غور کیجئے ان آیات میں مطلق قتلِ نفس بغیر حق کی سخت ممانعت بیان کی گئی ہے۔ مسلم یا غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو بھی بغیر حق کے قتل کرے گا تو اس کو وہی سزا ملے گی جو کسی ایک مسلمان کے بلا وجہ قتل کرنے پر اس کو ملنی چاہئے، اہل عز کے خمیر میں چونکہ قبائلی عصبیت جمی ہوئی تھی اور وہ انسانی جان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس بنا پر علاوہ قرآن مجید کی آیات کے احادیث میں بھی کثرت سے انسانی جان کے احترام اور اس کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس طرح بار بار کی تکرار سے اسلام نے ان لوگوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ انسانی جان کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہے کہ کوئی شخص جب چاہے اپنے کسی جذبہ ناراضگی سے متاثر ہو کر ہلاک کر دے۔ انھیں وجہ سے جس طرح کسی انسان کو بغیر حق یعنی بغیر کسی شرعی اور قانونی وجہ کے قتل کرنا شدید ترین معصیت ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی صدمہ سے متاثر ہو کر یا کسی اور سبب کی بنا پر خودکشی کر لینا بھی عظیم ترین گناہ ہے۔ خودکشی کی ممانعت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی انسان کی زندگی اسلامی نقطہ نظر کے ماتحت خود اس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے جس کو وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے ہلاک اور برباد کر سکے۔ بلکہ درحقیقت وہ اس کے پاس خدا کی ایک امانت ہے جس میں وہ صرف خدا کے حکم کے مطابق ہی تصرف اور تغیر و تبدل کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ اپنے ذاتی اور نفسی احساسات و جذبات سے متاثر ہو کر حکم خداوندی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے، مثلاً

خودکشی کر کے اپنی زندگی ختم کرتا ہے یا کسی ایسے شخص کو قتل کرتا ہے جس کو قتل نہیں کرنا چاہئے تھا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی امانت میں ناجائز تصرف کر رہا ہے اور اس طرح وہ گویا اپنے عمل سے خدا کو چیلنج دے رہا ہے۔

قومیت، وطنیت | اسلام سے پہلے عربوں میں قبائلی عصبیت کی بنا پر آئے دن لڑائیاں ہوتی تھیں ایک اور شعوبیت | قبیلہ دوسرے قبیلہ کا جانی دشمن تھا۔ آج کل کی تہذیب میں قومیت اور وطنیت نے قبائلی عصبیت کی جگہ لے لی ہے اور یہی وہ معصبیتِ عظمیٰ ہے جس نے دنیا کے اسٹیج پر ہولناک ترین خونی ڈرامے کھیلے۔ اور آج بھی دنیا میں جو عام تباہی و بربادی، سفاکی و خونریزی اور وحشت و بربریت کا بازار گرم ہے اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ ایک قوم اپنے قومی خصائص کی وجہ سے جن کے عناصر سے اس کی قومیت کا ہیولی تیار ہوا ہے یا ایک باورِ بادۂ وطنیت کے نشہ سے سرشار ہو کر صرف اپنے آپ کو آزادی اور خوشحالی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دار سمجھتی ہے اور اپنے سوا خدا کے دوسرے بندوں کو جو اس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں انھیں ان حقوق سے محروم کر دینا چاہتی ہے۔ اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں میں تنازع و لہذا کی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کشمکش منافرت و عداوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور بالآخر آدم و حوا کی اولاد جنگل کے بھڑیلوں اور درندوں کی طرح لیک دوسرے کو چیر بھاڑ کرنے پر تل جاتے ہیں۔

انسانیت عامہ کا تصور | اسلام جو مذہبِ امن و عافیت ہے اس صورتِ حال کو کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ اسی بنا پر قرآن نے جہاں قتلِ نفس بغیر حق کی صاف لفظوں میں ممانعت کی۔ ساتھ ہی ان تمام اسباب کی بھی نفی کر دی جو انسانی فطرت کی بے اعتدالیوں کے باعث عام طور پر اس نوع کے قتل کا سبب ہوتے ہیں اور زندگی کے محدود تصورِ قومی و وطنی کی بجائے انسانیتِ عامہ کا ایک اعلیٰ، بلند ترین اور ہمہ گیر تصور پیدا کیا۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من لے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت
ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و
قبائل لتعارفوا۔ اس لئے بنائے کہ تم پہچانے جاؤ۔

بعض آیتوں میں ”من ذکر و انثیٰ“ کی جگہ ”من نفس واحدۃ“ آیا ہے یعنی ہم نے سب
انسانوں کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے۔ غور کیجئے ان آیات میں خطاب صرف مومنوں یا مسلمانوں سے
نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں سے ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام تمام انسانوں کی پیدائش خواہ وہ
مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ ایک ہی نفس سے ملتا ہے اور جہاں تک مرتبہ انسانیت کا تعلق ہے وہ اس میں
سب انسانوں کو ایک ہی حیثیت دیتا ہے۔ رہا شعوب اور قبائل کا اختلاف تو یہ محض تعارف کے لئے
ہے اور بس! ورنہ اس اختلاف کی بنا پر ایک گروہ یا ایک قوم کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے گروہ
یا دوسری قوم کو انسانی حقوق سے محروم کر دے یعنی اس کو قتل کرے، اس کا مال لوٹے، اس کے
گھروں کو آگ لگائے۔ اس کو مذہب بدلنے پر مجبور کرے اور اسے زندگی کی ضرورتوں سے عاری کر دے یا یہ
بنادے۔ اسی مضمون کو بعض احادیث میں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث
میں ہے: ”تم سب برابر ہو، تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ ایک اور جگہ
ارشاد ہوا ”کسی عربی کو عجمی پر، یا کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر، یا کسی گورے کو کالے پر
کوئی فضیلت نہیں ہے۔“

البتہ ہاں! اسلام میں ایک انسان کی فضیلت کا دوسرے انسان پر دار و مدار اعمال
صالحہ اور اخلاقِ حسنہ پر ہے چنانچہ فرمایا گیا۔

انّ اکرمکم عند اللہ

اللہ کے نزدیک تم سب میں زیادہ عزت والا وہ شخص ہے

اتقاکم۔ جو تم سب میں زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو۔

لیکن اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ”اگر تم عند اللہ“ فرما کر یہ بات صاف کر دی گئی کہ ایک نیک عمل کو بد عمل بہ یا ایک دین حق کے ماننے والے کو باطل پرست پر جو فضیلت حاصل ہے وہ اللہ کے نزدیک ہے۔ اور اس خوش نصیبی پر وہ جتنا مسرور ہو جائے۔ لیکن بہر حال جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے ایک نیک عمل کو یہ ہرگز نہ چاہئے کہ وہ اپنے لئے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حقوق کا طلبگار ہو، بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ایک پرہیزگار کو ایک فاسق کے مقابلہ میں اور اسی طرح ایک مسلمان کو ایک غیر مسلم کے مقابلہ میں اس مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے کہ چونکہ وہ متقی ہے اور مسلمان ہے اس بنا پر روٹی، کپڑا، پانی اور ہوا یہ چیزیں اس کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ اچھی اور عمدہ چاہئیں خوب یاد رکھئے ان تمام چیزوں کا تعلق خدا کی شان ربوبیت و پروردگاری سے ہے اور جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے وہ رب العالمین ہے اُس کی اس شان ربوبیت کا فیض جمادات و نباتات اور حیوانات کی طرح تمام انسانوں کو بلا تفریق مذہب و نسل یکساں طور پر پہنچ رہا ہے اور اس بنا پر کسی شخص کو نیکی یا بدی۔ اسلام اور غیر اسلام کی بنیاد پر اس میں قطع و برید کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

آج بد قسمتی سے ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت و عداوت کی جو فضا قائم ہو گئی ہے اس کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہی ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ حقیقت بالکل واضح اور غیر مشتبہ ہے کہ اسلام ہرگز اس کا روادار نہیں ہے کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سے محض اس کے غیر مسلم ہونے کے باعث دشمنی رکھے اور وہ اس کی جان و مال کے درپے ہو اسلام انسانیتِ عامہ کے جس بلند ترین تصور کا داعی و حامل ہے شیخ سعدیؒ نے اُسے نہایت بلیغ پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

بنی آدم اعضاء یک دیگر اند کہ در آفرینش زیک جو ہر اند

یعنی پوری انسانی سوسائٹی من حیث المجموع ایک جسم کی طرح ہے اور مختلف افراد انسانی

اس کے اعضاء و جوارح ہیں جس طرح اعضاء و جوارح میں آپ دیکھتے ہیں ایک عضو تندرست ہوتا

اور دوسرا بیمار۔ ایک سڈول اور موزول ہوتا ہے اور دوسرا ہمارا اور ناموزول۔ ایک عضو خوبصورت ہوتا ہے دوسرا بد صورت۔ ایک قوی ہوتا ہے دوسرا کمزور۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود بہر کیف وہ سب ہوتے ہیں ایک ہی جسم کے اجزاء، جن کے باہمی تعاون و اشتراک پر ہی جسم کے زندہ رہنے کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح تمام افراد انسانی خواہ وہ مذہب۔ تمدن۔ رنگ و نسل اور قوت و ضعف کے اعتبار سے کیسے ہی مختلف ہوں بہر حال وہ سب انسانی سوسائٹی کے جسم کے اعضاء ہیں اور اس سوسائٹی کی خیریت اسی میں کہ یہ سب افراد باہم تعاون و اشتراک سے رہیں۔ پھر اسی طرح اگر ایک عضو تندرست اور مضبوط ہے تو وہ دوسرے بیمار اور کمزور عضو کا دشمن ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ ازراہ خیر خواہی اور ہمدردی و غمگساری کے جذبہ سے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ بیمار عضو کی بیماری اور کمزوری چلی جائے اور وہ بھی اسی کی طرح مضبوط اور تندرست ہو جائے۔ البتہ ہاں اگر بیمار عضو کو اپنی بیماری پر اصرار ہو اور وہ تمام خیر خواہانہ مشوروں کو اپنا دشمن جان کر اپنے فساد اور مرض کو دوسرے اعضاء تک متعدی کرنے لگے تو اب اس وقت اعضاء صالحہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ جسم کی بقا و حفاظت کی خاطر اس عضو فاسد پر آپریشن کرائیں اور اگر دفع فساد کے لئے آپریشن بھی ناکافی ہو تو سرے سے اس عضو کا ہی خاتمہ کر دیں، آپریشن یا عضو بردگی کے وقت تمام اعضا کو شدید کرب اور درد محسوس ہوگا لیکن بہر حال انھیں یہ انگیز کرنا چاہئے۔

بس یہی حال انسانی سوسائٹی کا ہے جو افراد یا جو قوم دین حق پر قائم ہے، اعمال صالحہ کرتی ہے، دنیا میں نیکی کی زندگی بسر کرتی ہے وہ تندرست اور مضبوط و قوی عضو کی مانند ہے اور اس کے برخلاف جو قوم یا جو انسان ان صفات کا حامل نہیں ہے وہ بیمار اور شکستہ و خستہ عضو کی طرح ہے۔ پس اب سابق الذکر قوم کو دوسری قوم کے ساتھ ہمدردی اور غمگساری تو ہونی چاہئے اور اس بنا پر اسے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ بیمار و ضعیف قوم کا مرض جاتا رہے لیکن اس کے ساتھ دشمنی

رکھنے یا اُس کے بر خلاف اپنے دل میں جذباتِ عداوت و منافرت کے پرورش کرنے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے، آپ ذرا خود اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھئے! اگر آپ خوبصورت ہیں تو کیا اس بنا پر آپ کو بد صورتوں کے ساتھ دشمنی رکھنا اور ان کو اپنا دشمن سمجھنا جائز ہوگا! اگر آپ نیک ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بد عمل انسانوں کو اپنا دشمن سمجھیں اور ان سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو تبلیغِ اسلام کے لئے یمن بھیجا تو انھیں تاکید کی کہ دیکھنا! تم دونوں نرمی کرنا، سختی نہ کرنا، خوش کرنا اور نفرت نہ دلانا! غور کیجئے کیا یہ رویہ دشمنوں کے ساتھ ہو سکتا ہے؟

خوب اچھی طرح یاد رکھئے! اسلام اپنے پیروں کو ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ وہ خود کلمہ پڑھ کر دنیا بھر سے دشمنی مول لے لیں۔ غیر مسلموں کو اپنا دشمن سمجھیں ان سے کسی قسم کا کوئی اشتراک نہ کریں۔ اگر اسلام واقعی ایک پارس کی تھری ہے تو ایک مسلمان بشرطیکہ وہ سچا مسلمان ہے آپ اس کو ایک لاکھ غیر مسلموں کے حلقہ میں تنہا چھوڑ دیجئے وہ ایک تہا سینکڑوں اور ہزاروں کو متاثر کر کے اپنے اندر بذب کر لے گا اور خود ذرا متاثر نہ ہوگا۔

قانونی مساوات | اس عام انسانی مساوات و برابری کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ اسلامی قانون کی نظر میں ایک مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہوں اور کسی مسلمان کو محض مسلمان ہونے کی بنا پر قانون سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے، چنانچہ اسلام میں یہی ہے اور اسی کا نام عدل ہے جس طرح اگر مسلمان باغی ہو جائے یا وہ کسی شخص کو بے گناہ قتل کر دے، یا وہ شادی شدہ ہونے کی حالت میں زنا کر لے تو اس کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح اگر کسی غیر مسلم سے اس قسم کا کوئی فعل صادر ہوگا تو وہ بھی اسی سزا کا مستحق ہوگا اور جس طرح ایک مسلمان کے پُر امن اور غیر مجرم ہونے کی حالت میں اس کی جان و مال کی حفاظت اسلامی حکومت پر ہے، ٹھیک اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم اسلامی حکومت

کے ماتحت پُر امن طریقہ پر رہتا ہے تو اُس کی جان و مال کی حفاظت بھی حکومت کا فرض ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان بھی اس کو بے گناہ قتل کر دے تو مسلمان سے اس کا قصاص لیا جائے گا ایک غیر مسلم اپنی حفاظت کا ٹیکس جس کو اصطلاح شرع میں جزیہ کہتے ہیں۔ اس کو ادا کرنے کے بعد جان و مال کے اعتبار سے بالکل ایسا ہی محترم ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک مسلمان چنانچہ صاف لفظوں میں فرمایا گیا۔

دماء ہمہ کد ماء ناو ذمیوں کے خون ہمارے خون جیسے اور

اموالہمہ کا موالنا اُن کے مال ہمارے مال جیسے ہیں۔

تاریخ کے صفحات کھلے ہوئے ہیں، ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، صحابہ کرام کا طرز عمل، سلاطین اسلام کا اپنوں اور دوسروں کے ساتھ معاملہ صوفیانے کرام اور بزرگان اسلام کا طور طریق کیا رہا ہے؟

اسلام اور عدل | اگر پوچھا جائے کہ کیا کوئی لفظ ایسا ہے جس میں اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعتِ غرا کے تمام احکام و مسائل کی روح سمٹ کر آگئی ہو تو ہم کہیں گے کہ ہاں بیشک ایک ایسا لفظ موجود ہے اور وہ لفظ ”عدل“ ہے۔ عدل کے معنی وضعِ اشیٰ فی محلہ کے ہیں یعنی کسی چیز کو اس کی اپنی جگہ پر رکھنا اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا جو ہونا چاہئے۔ اس کی ضد لفظ ”ظلم“ ہے جس کے معنی وضعِ اشیٰ فی غیر محلہ ہے، عدل اور ظلم کے اس مفہوم و مطلب کی روشنی میں کسی مجرم کو بالکل سزا نہ دینا یا جرم کی نوعیت سے زیادہ سزا دینا ایسا ہی ظلم ہے جیسا کہ ایک بے گناہ انسان کو بلا وجہ زود کو بکرتا اور اسے آزار پہنچانا۔ مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے خدا کے قانونِ عدل کو نافذ کرنے میں اپنے اور پرانے کی کبھی کوئی تمیز نہیں کی، انھوں نے اپنے ساتھ بھی انصاف کیا اور دوسرے کے ساتھ بھی! انھوں نے قانونِ عدل کے سامنے اپنی ذاتی وجاہت و شخصیت اور اپنے قلبی جذبات

کیفیات کی ذرا پروا نہیں کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں اسلام کی بے پناہ اشاعت ایک بڑی حد تک اسلام کے اسی قانونِ عدل کی وجہ سے ہوئی۔

اسلام میں عدل کی کتنی اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ آپ کو قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوگا۔ ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَلَا يَحْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی
کسی قوم کا بغض تم کو اس پر مجبور نہ کر دے کہ تم
اَن لَّا تَعْدِلُوْا اَعْدِلُوْا هُو
انصاف ہی نہ کرو (نہیں) تم انصاف ہی کرو یہی
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔
پرہیزگاری سے زیادہ قریب کرنے والا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:-

وَلَا يَحْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَن صَدَقْتُمْ
عن المسجد الحرام اَن تَعْدُوا
بغض تم کو اس پر مجبور نہ کر دے کہ تم زیادتی نہ کرو۔
وَتَعَاوَنُوْا عَلٰی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا
اور نیکی اور پرہیزگاری پر تم ایک دوسرے تعاون کرو۔
تَعَاوَنُوْا عَلٰی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔
اور گناہ اور زیادتی پر تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ
ڈرو۔ بیشک اللہ شدید عذاب والا ہے۔

اس دوسری آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کثیر کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو ظلم و زیادتی کا کوئی دقیقہ نہیں تھا جو اس وقت مشرکین مکہ نے فروگذاشت کر دیا ہو۔ انھوں نے اللہ کے شعائر کی بے حرمتی کی نہ مسلمانوں کے احرام کا لحاظ رکھا اور نہ کعبہ کی حرمت کا خیال کیا اور مسلمانوں کو مکہ میں جا کر عمرہ ادا کرنے سے صاف روک دیا۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا صبر آزما اور اشتعال انگیز وقت ہو سکتا تھا۔ وہ اس حالتِ اشتعال میں جو کچھ بھی کر بیٹھے

کم تھا۔ لیکن اسلام کا ڈسپن اور اس کی سیاست دیکھئے ان حالات میں بھی مسلمانوں کو زیادتی کرنے اور اٹم و عدوان پر باہمی امداد کرنے سے منع کیا گیا اور اس کی خلاف ورزی کرنے پر انہیں شدید عذاب خداوندی سے ڈرایا گیا۔ مفسرین نے "ولا تعاونا علی الاثم والعدوان" کا یہ بھی مطلب لکھا ہے کہ "اگر مشرکین مکہ عمرہ کرنا چاہیں تو چونکہ پہلے وہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک چکے تھے اس بنا پر اس کا انتقام لینے کے لئے اب مسلمانوں کو نہیں چاہئے کہ وہ مشرکین کو عمرہ کرنے سے باز رکھیں۔"

عدل کے سلسلہ میں قرآن مجید میں ایک اور آیت بھی ہے جو مندرجہ بالا دونوں آیتوں سے زیادہ واضح اور مکمل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

یا ایھا الذین آمنوا قوامین	لے ایمان والو تم انصاف پر سختی کے ساتھ قائم رہو
بالقسط شهداء اللہ ولو علی	اور اللہ کے لئے گواہ بنو۔ اگرچہ وہ انصاف خود تمہارے
انفسکم والوالدین و	اپنے یا والدین کے یا اعمام اقرباء کے خلاف پڑتا ہو
الاقربین ان یکن غنیاً	دیکھو! خواہ کوئی دولت مند ہو یا فقیر بہر حال اللہ
او فقیراً فاللہ اولیٰ بمعہما	ان دونوں سے زیادہ بہتر ہے۔ تم اپنی خواہشات
فلا تتبعوا الهویٰ ان تعدلوا	کی پیروی میں عدل و انصاف سے مت پھرو اگر
وان تلوّا و تعرضوا فان	تم نے ایچ پیچ کی بات کی یا حق سے روگردانی کی
اللہ کان بما تعملون	تو سمجھ لو کہ جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس کو جاننے
خبیراً۔	والا ہے۔

عدل کے چند تاریخی واقعات | مسلمانوں نے عدل و انصاف کرنے کے ان احکام پر کیونکر اور کس طرح عمل کیا اور ان کے اس عمل نے قوموں پر کیا اثر کیا۔ تاریخ کی کتابیں ان سے پڑھیں، ہم ذیل میں بطور

مشتے نوشاز خواہ کر صرف چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ ایک یہودی نے بعض صحابہ کرام کی موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہو گئی۔ حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا انھوں نے فوراً تلوار میان سے باہر نکال لی اور چاہا کہ یہودی کا سر قلم کر کے اس کو بارگاہ نبوت میں گستاخی کی سزا دیں۔ لیکن سرکار دو جہاں نے فرمایا "عمر! میں اس یہودی کا مقروض ہوں اور لصاحب الحق یدر" ایک صاحب حق کو اپنے حق کے مطالبہ کا ہر وقت اختیار ہے۔ اگر تم کو میرے ساتھ ہمدردی ہے۔ تو میری طرف سے قرض ادا کرو۔ قرض خواہ پر لگڑنے کی کیا ضرورت ہے!

(۲) بنو مخزوم قبیلہ کی ایک معزز عورت فاطمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چوری کے الزام میں پیش ہوئی، قریش نے اُس کی سفارش حضرت اسامہ بن زیدؓ کے ذریعہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حد درجہ عزیز اور محبوب تھے آپ کی خدمت میں پہنچائی کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹاجائے زبان حق ترجمان سے ارشاد ہوا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ تم سے پہلے بڑی بڑی قوموں کے برباد ہونے کی وجہ یہی ہوئی ہے کہ وہ کم درجہ کے لوگوں پر قانون جاری کرتے تھے اور ان میں سے اگر کسی معزز اور شریف آدمی سے جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اُسے چھوڑ دیتے تھے۔

(۳) جنگ بدر میں قریش کے دوسرے سرداروں کے ساتھ خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاصؓ گرفتار ہو کر آئے تو عام اسیران جنگ کی طرح انہیں بھی قید کر دیا گیا۔ پھر زیدؓ فدیہ کا سوال سامنے آیا تو اس وقت اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ حکم ہوا کہ گھر سے مال منگا کر دو۔ ورنہ رہا نہیں ہو سکتے۔ اب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اور اپنی بیوی حضرت زینبؓ کے پاس پیغام بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے اس کے جواب میں اپنا وہ ہار بھیج دیا جو حضرت خدیجہؓ نے

نے اُن کو جہنم میں دیا تھا۔ ہار دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیاضہ اپنی اول رفیقہ حیات کی یاد تازہ ہو گئی اور چشمِ مبارک سے آنسو نکل پڑے۔ تاہم عدل کا تقاضا ہے کہ خود اپنے اختیار سے اپنے داماد کا فدیہ معاف نہیں کرتے۔ عام مسلمانوں سے اجازت طلب کرتے ہیں کہ اگر وہ پسند کریں تو بیٹی کو اس کی ماں کی یادگار واپس کر دی جائے پھر جب سب مسلمان اس کی اجازت دیدیتے ہیں تو ابوالعاص کو بغیر فدیہ کے رہا کر دیا جاتا ہے۔

(۴) حضرت عمر بن العاصؓ مصر کے گورنر تھے، اُن کے بیٹے عبداللہ نے ایک قبیلہ عیسائی کو بلاوجہ مارا تھا۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع اور تصدیق ہوئی تو آپ نے باپ کے سامنے خود مضروب کے ہاتھ سے بیٹے کے کوڑے لگوائے اور کوئی دم نہ مار سکا۔

(۵) نجران کے عیسائیوں نے حضرت عمرؓ کے خلاف بغاوت و سرکشی کی تیاریاں کیں اور اس مقصد کے لئے چالیس ہزار آدمی اکٹھے کر لئے تو آپ نے صرف یہ حکم دیا کہ ان لوگوں کو عرب سے نکال کر دوسرے ممالک میں آباد کر دیا جائے اور وہ بھی اس رعایت کے ساتھ کہ ان کی جائداد وغیرہ کی مناسب اور واقعی قیمت انھیں ادا کر دی جائے۔ علاوہ بریں آپ نے عاملوں کو لکھ بھیجا کہ راستہ میں جہاں کہیں سے ان کا گزروا ان کے لئے راحت و آسائش کے سامان بہم پہنچائے جائیں اور جب کہیں یہ مستقل قیام اختیار کر لیں تو دو سال تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔

(۶) حضرت عمرؓ کا ایک عیسائی غلام تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ وہ مسلمان ہو جائے لیکن جب اس نے مسلمان ہونے سے صاف انکار کر دیا تو آپ چپ ہو گئے اور فرمایا "لا اکلاہ فی الدین" یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

(۷) حضرت عمرؓ کے صاحبزادہ ابو محمد نے ایک مرتبہ شربِ پی لی تو باپ نے خود اپنے ہاتھ سے بیٹے کے کوڑے مارے۔ یہاں تک کہ وہ اسی صدمہ سے جان بحق ہو گئے۔ یہ واقعہ تاریخی

یہ واقعہ تاریخی ہے۔
ابو محمد نے شربِ پی کیا تو باپ نے خود اپنے ہاتھ سے بیٹے کے کوڑے مارے۔ یہ واقعہ تاریخی ہے۔
یہ واقعہ تاریخی ہے۔

اعتبار سے اگرچہ کچھ زیادہ مستند نہیں ہے تاہم حضرت عمر فاروقؓ کی کلاہ افتخار میں ایسے بہت گہرے شب چراغ ٹکے ہوئے ہیں کہ اس ایک واقعہ کے کم ہو جانے سے ان کی جلالت و عظمتِ شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

(۸) جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم لاکھوں کی فوج جمع کر کے مسلمانوں کو شام و فلسطین سے باہر نکال دینے اور اُن کی قوت کو کچل دینے کا عزم باجمہر کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے انتظامات کے لئے ایک ایک پیسہ کی ضرورت تھی لیکن اسلام کی شایعہ عدل ملاحظہ ہو۔ اس نازک گھڑی میں بھی انھوں نے حصّے کے عیسائی باشندوں کو جمع کر کے اُن سے وصول کیا ہوا خرچ یہ کہہ کر انھیں واپس کر دیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔

(۹) جنگ صفین کے موقع پر حلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ گم ہو جاتی ہے۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ زرہ دار الخلافہ کے ایک یہودی کے پاس ہے آپ نے اس سے مطالبہ کیا تو اس نے جواب دیا "یہ میری اپنی ہے اور ہمیشہ سے میرے ہی قبضہ میں رہی ہے۔ حضرت علیؓ کو یقین تھا کہ یہودی جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ حاکمانہ اختیارات سے کام نہیں لیتے اور اور قاضی شریح کی عدالت میں ایک معمولی مدعی کی حیثیت سے پہنچتے ہیں، قاضی اُن سے گواہ طلب کرتے ہیں تو آپ اپنے ایک غلام قنبرؓ اور اپنے صاحبزادہ حضرت حسنؓ کو پیش کرتے ہیں اس پر قاضی نے کہا "کہہ دیجئے کی شہادت باپ کے حق میں معتبر نہیں ہوتی۔ اس لئے امام حسنؓ کی گواہی آپ کے حق میں بالکل بے کار ہے۔ یہودی یہ منظر دیکھ کر بیاختہ کلمہ پڑھنے لگا اور بول اٹھا کہ جس دین میں عدل و انصاف کا یہ عالم ہو وہ کبھی جھوٹا دین نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) حضرت عمرؓ کے پاس جب ٹیکس اور محصولات کی رقمیں آتی تھیں تو آپ ذمہ دار افسروں کو جمع کر کے اُن سے بار بار قسمیں لیتے تھے کہ انھوں نے کوئی ایک پیسہ بھی کسی مسلمان یا غیر مسلم کو

جبراً یا ظناً وصول نہیں کیا ہے۔

(۱۱) فارس کے علاقہ میں مسلمانوں نے ایک شہر کا محاصرہ کیا۔ محصورین شکست کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے کہ اتنے میں اسلامی لشکر کے ایک غلام نے شہر والوں کے نام ایک امن نامہ لکھ کر تیر کے ذریعہ شہر میں پھینک دیا۔ محصورین یہ دیکھ کر شہر کا دروازہ کھول باہر چلے آئے۔ حضرت عمرؓ کے پاس یہ معاملہ گیا تو آپ نے فرمایا: "مسلمان غلام بھی عام مسلمانوں کی طرح ہے اس بنا پر اس کے امن دینے کی وقعت بھی وہی ہے جو عام مسلمانوں کے امن دینے کی ہے۔ پس امن نافذ کیا جائے۔"

یہ چند تاریخی واقعات جو آپ نے پڑھے عہد نبوت اور خلافت راشدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے قطع نظر اگر آپ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہاں بھی عدل و انصاف کے بیشمار حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ انتہا یہ ہے کہ سلطان محمد بن تغلق جیسا جابر و قاسر بادشاہ جس کو عام طور پر "خونی" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ابن بطوطہ خود اپنی آنکھوں دیکھا اس کے دربار کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "ایک مرتبہ ایک ہندو امیر نے سلطان محمد بن تغلق پر دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے میرے بھائی کو بلا سبب مار ڈالا ہے۔ بادشاہ نے میری ہتھیار کے پیدل قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا اور آداب تعظیم و تکریم بجالایا۔ پھر وہ کھڑ رہا اور قاضی حاکم کی جیت سے مقدمہ کی سماعت کرتا رہا۔ انجام کار فیصلہ یہ سنایا گیا کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اسے چاہئے کہ مدعی کو راضی کر لے۔ ورنہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔"

علاوہ ازیں ایک دوسرا واقعہ یہ لکھا ہے: "ایک مرتبہ ایک امیر کے لڑکے نے بادشاہ پر دعویٰ کیا کہ اس نے بلا وجہ اس کو مارا ہے۔ معاملہ قاضی کے سامنے گیا تو اس نے باقاعدہ مفہم کی سماعت کر کے فیصلہ دیا کہ "یا تو بادشاہ لڑکے کو راضی کر لے ورنہ قصاص دے۔ یہ تو خیر ہو گیا لیکن اس واقعہ

میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ابن بطوطہ لکھتا ہے ”میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے اس فیصلہ کے بعد دربار میں آکر لڑکے کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں چھڑی دیکر کہا کہ ”لے اب مجھ سے اپنا بدلہ لے لے“ اور مزید برآں اس کو اپنے سر کی قسم دیکر کہا کہ جیسا میں تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھ کو اسی طرح مار اب لڑکے نے بادشاہ کے اکیس چھڑیاں ماریں یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو اس کی ٹوپی بھی سر پر سے گر پڑی۔“

جنگ اور اسلامی اخلاق | کسی قوم کے قومی اور جماعتی اخلاق و کردار کے لئے سب سے زیادہ آزمائش اور ابتلا کا وقت وہ ہوتا ہے جبکہ وہ کسی قوم سے برسرِ پیکار و جنگ ہوتی ہے۔ اسی موقع پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون درحقیقت بلند اخلاق اور اعلیٰ گیر کٹر مالک ہے اور کون اس سے محروم ہے۔ مسلمان کا ہر کام یہاں تک کہ کسی کے ساتھ اس کی دوستی اور دشمنی، صلح اور جنگ یہ سب چونکہ محض احکامِ خداوندی کی تعمیل و بجا آوری کے لئے ہوتا ہے اور کسی چیز میں اس کے اپنے حظِ نفس اور ذاتی لطف و تملذذ کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی شان یہی ہے کہ جنگ کے نازک سے نازک موقع پر بھی انھوں نے اسلام کے قانونِ عدل و انصاف کا سرِ رشتہ اپنے ہاتھ سے نہیں دیا۔ اُن کو اسلامی قانونِ عدل کی سچائی کا اس درجہ یقین تھا کہ اگر کسی وقت اس پر غل در آمد کرنے میں انھیں بظاہر اپنی شکست کا اندیشہ یا کمتری و بے چارگی کا احساس پیدا ہوا بھی تو وہ اسے ہنسی خوشی انگیز کر گئے اور اپنے قدم کو سرِ جادۂ انصاف سے ایک لمحہ کھینچنے نہیں ہٹے دیا۔

قتل بغیر حق اور | شروع میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ قتل بغیر حق کی سخت ممانعت کی گئی ہے بغیر حق قتل بالحق کا فرق | کی قید ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ قتل بالحق نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ فتنہ و فساد اور جبر و ظلم کے قلع قمع کرنے اور دنیا میں حقیقی امن و امان قائم کرنے کے لئے واجب

۱۔ سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۸۔

اور ضروری ہے۔ قتل باحق کب واجب ہوتا ہے؟ قرآن نے اس کو ہم نہیں رکھا بلکہ اس کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک جزئیہ کی تشریح کی ہے۔ یہاں اُن تمام تفصیلات کو بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ البتہ ہاں ایک بات بالکل صاف ہے اور وہ یہ کہ قتل باحق کا اختیار کسی حالت میں بھی کسی فرد واحد کو نہیں دیا جاسکتا۔ یعنی اگر فرض کیجئے کسی ایک شخص نے کسی کو بے گناہ قتل کر دیا اور قاتل کو مقتول کے کسی وارث نے پکڑ لیا تو اب وارث مقتول کو خود یہ حق نہیں ہے کہ وہ قاتل کا سر قلم کر دے اور اس طرح اُس سے قصاص لے لے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ حکومت کے سپرد کر دے بہر حال خوب یاد رکھئے کہ کسی شخص واجب القتل کو قتل کرنے یا کسی قوم کے خلاف اعلان جنگ کرنے اور پھر اسی کے مطابق اُس سے معاملہ کرنے کا حق کسی ایک مسلمان کو انفرادی حیثیت میں ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ حق ہے صرف اسلامی گورنمنٹ کا۔ اور اگر گورنمنٹ باقاعدہ طور پر موجود نہ ہو تو پھر اس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت جس کو عام نمایندگی حاصل ہو وہ اس کا اعلان کر سکتی ہے۔

جنگ میں منوع افعال | باقاعدہ طور پر اعلان جنگ ہو جانے کے بعد بھی مسلمانوں کو جن اخلاقی احکام پر کاربند ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ بے شبہہ جنگی اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ جنگ کی حالت میں بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ صرف اُن لوگوں سے جنگ کریں جو اُن سے جنگ کر رہے ہوں یعنی باصطلاح شرع مقاتلین ہوں، ان کے برخلاف وہ لوگ جو پڑا من شہری کی حیثیت رکھتے ہوں اور جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہ ہو مثلاً بوڑھے، عورتیں، بچے، مذہبی پیشوا اور عبادت گزار لوگ ان میں سے کسی کا قتل جائز نہیں ہے۔ علاوہ بریں درختوں کا کاٹنا، کھیتوں کو آگ لگانا، مکانوں کو منہدم کرنا، یا فریق مخالف کے کسی فرد کو غیر انسانی سزا دینا۔ مثلاً اُس کو زندہ آگ میں جلا دینا۔ ہاتھ پاؤں کاٹ کاٹ کر مارنا یا اُسے بحیرہ مذہب کے تبدیل کرنے پر آمادہ کرنا۔ یہ تمام وہ اعمال و افعال ہیں جو اسلامی اصول و آداب۔۔۔ جنگ کے مطابق فریق متحارب کے ساتھ بھی نہیں کئے جاسکتے۔

جنگ میں معاہدہ | علاوہ بریں دوران جنگ میں اگر مسلمانوں اور فریق مخالف میں کوئی معاہدہ کی پابندی ہو جائے تو اسلام کا حکم ہے کہ مسلمان سختی سے اس کی پابندی کریں اور جب تک فریق مخالف ہی اس کی خلاف ورزی نہ کرے مسلمان برابر اس پر جے رہیں۔ معاہدہ کی پابندی کی خواہش عجیب و غریب اور انتہائی حیرت انگیز مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر دکھائی ہے واقعہ یہ ہے کہ تاریخ عالم کا پورا دفتر اس کی نظیر پیش کرنے سے یکسر عاری و قاصر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تقریباً ڈیڑھ ہزار جاں نثاروں کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مقام حدیبیہ پر آپ کو روک لیا جاتا ہے اور مشرکین مکہ بضد ہیں کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہو کر عمرہ ادا نہیں کرنے دیں گے۔ آخر دونوں میں ایک معاہدہ ہونا ہے جو بظاہر مسلمانوں کے لئے معلوبہ ہے لیکن دراصل یہ معاہدہ ہی بعد کی تمام شاندار فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہو اور اسی سا پر خود قرآن نے اس کو فتح کے لفظ سے تعبیر کیا۔ اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر آئے گا تو مسلمانوں پر ضروری ہو گا کہ وہ اسے مشرکین مکہ کے حوالہ کر دیں اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ادھر سے بھاگ کر مکہ میں پہنچے گا تو اہل مکہ پر ضروری نہ ہو گا کہ وہ معروفہ کو مسلمانوں کے حوالہ کریں۔

اتفاق دیکھئے کہ ابھی یہ معاہدہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ عین اس موقع پر ایک مسلمان ابو جندل بن ہبیل کفار کی قید سے بھاگ کر آتے ہیں پاؤں میں بو جھل بٹریاں ہیں جسم پر زخموں کے نشان ہیں اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! مجھے بچائیے۔ ابو جندل کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر حضرت عمرؓ بھی غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اسی تاثر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی سخت کلامی کر میٹھے ہیں جس کا ان کو عمر بھر افسوس رہتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود چونکہ ابو جندل کو واپس نہ کرنا معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا تھا۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرماتے ہیں ابو جندل!

صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لئے اور تمہارے ساتھ جو اور کمزور مسلمان ہیں ان کے لئے کوئی راہ نکالے گا۔ اب صلح ہو چکی ہے اور ہم ان لوگوں سے بد عہدی نہیں کر سکتے نتیجہ یہ ہوا کہ ابو جندل کو عہد نامہ کے مطابق اسی حالت میں پابز بخیر کہ واپس جانا پڑا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ایک لمحہ کے لئے یہاں ٹھہر کر خوب اچھی طرح غور کرو کہ یہ جو کچھ ہوا آخراں میں کیا حکمت و مصلحت تھی؟ اول تو بدرو حنین کے وہ فاتحین صف شکن جن کے جلو میں فرشتوں کے ان دیکھے شکرِ حمود لہو تر وہاں چلتے تھے ان کے لئے ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ صلح کرنے۔ سر و کائنات کا اس موقع پر اگر درابھی اشارا ہو جاتا تو جن تلواروں نے اس واقعہ کے تین سال بعد ہی مکہ فتح کیا وہ اب بھی پام سے باہر آکر اپنی خارا شگانی کا منظر دکھا سکتی۔ اور کفار مکہ کا قلع قمع کر سکتی تھیں۔ اچھا ابھر مغاہدہ ہوا بھی تو اب مغلوبانہ کہ حضرت عمرؓ ایسا شجاعت و حمیت اسلامی کا شیر عربی اس پر پل کھا کھا کے رہ گیا۔ پھر یہ سیکھ کس کی موجودگی میں، اور کس کے حکم سے ہوا؟ اس نبی برحق اور پیغمبر آخر الزماں کے حکم سے کہ جس کا ایک اشارہ چشم و ابرو گردشِ افلاک کے پورے نظام کو زیر کر دینے کے لئے کافی تھا! پھر آخر یہ کیا بات کہ یہاں عہد نامہ بظاہر دہرا کر کیا جا رہا ہے لیکن ادھر عالم غیب سے مژدہ سنایا جا رہا ہے۔

انما فتحنا ذلک فتحا مبینا ہم نے کچھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

اگر غور کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس پورے واقعہ میں ڈسپلن بہترین ساست اور اعلیٰ ترین ضبط نفس و تعمیل احکامِ خداوندی کا سبق موجود ہے اس میں اس بات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو موقع محل دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ وہ جب چاہیں جذبات سے بے قابو ہو کر تلوارِ میان سے باہر نکالیں۔ نیز یہ کہ اگر وہ کسی مصلحت سے کوئی معاہدہ کریں تو انھیں عواقب و نتائج سے بے پروا ہو کر اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہئے! اگر انھوں نے ایسا

توانجام کار فلاح و بہبود اور کامیابی و کامرانی انھیں کو ہوگی۔

اب اس سلسلہ میں ایک واقعہ عہدِ فاروقی کا بھی سن لیجئے اس سلسلہ میں مسلمانوں کی ایک فوج نے بیتان کے ایک شہر زینج کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ محصورین چند روز کے بعد اس شرط پر صلح کرتے ہیں کہ ان کی تمام زمینیں محفوظ رہیں گی۔ مسلمان اس شرط کو منظور کر لیتے ہیں اور پھر اس پر عمل اس طرح کرتے ہیں کہ جب کھیتوں کی طرف سے گذرتے ہیں تو جلدی سے گذر جاتے ہیں کہ زراعت چھوٹک نہ جائے۔

معاہدہ کی پابندی کے حکم کی انتہا یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا کافروں کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو چکا ہو اور ہر مسلمانوں کی ہی کوئی جماعت معاہدہ مسلمانوں سے ان کافروں کے خلاف کوئی مدد مانگے تو قرآن کا صاف حکم ہے کہ مسلمانوں کو معاہدہ کا خلاف کر کے کافروں کے مقابلہ میں ایڑ دینی بھائیوں کی بھی مدد نہیں کرنی چاہئے۔ ارشاد ہے۔

وان استنصروکم فی الدین اور اگر تم سے تمہارے بھائی دین کے معاملہ میں مدد
فعلیکم النصر الا علی قوم طلب کریں تو تمہارا فرض ہے کہ ان کی مدد کرو۔ مگر
بینکم و بینہم ہاں اس قوم کے خلاف ان کی مدد نہ کرو جن میں اور
میثاق۔ تم میں کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل اس عام غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی آیت میں صحابہ کرام کی شان یہ بیان کی گئی ہے اشداء علی الکفار صاع و میخہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اشداء علی الکفار کے معنی کافروں پر سختی کرنے والے ہیں۔ حالانکہ عربی زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جان سکتا ہے کہ اشداء جمع شدید کی ہے اور شدت سے مشتق ہے جو ضعف کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ پھر شدید کے صلیہ میں علی کا آنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں شدید کے معنی مضبوط

مستحکم اور قوی کے ہیں نہ کہ تشدد اور سختی کرنے والے کے اس بنا پر مفہوم یہ ہوا کہ صحابہ کرام آپس کے معاملات میں بڑے رحمدل، ہنسار اور نرم خو ہیں۔ لیکن جب حق اور باطل کا اسلام اور کفر کا معاملہ آجاتا ہے تو وہ پہاڑ کی طرح مضبوطی کے ساتھ امر حق پر جے رہتے ہیں اور اس وقت کسی قسم کی کوئی ممانعت نہیں دکھاتے اور اس طرح کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں اور درحقیقت یہی وہ صفت ہے جو ان کے اعتدال قوی اور توازن فکر و عمل کی دلیل ہے۔ یہی شدید کا لفظ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بھی آیا ہے ”اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ“ یہاں بھی شدید کے معنی مضبوط کے ہیں نہ کہ تشدد اور بے جا سختی کے۔ کیونکہ اِنَّ اللہ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیدِ فرما کر خود بے جا سختی کی جس کا دوسرا نام ظلم ہے نفی کر دی گئی ہے۔

موجودہ فرقہ وارانہ معاملات | سطور بالا میں آپ نے جو کچھ پڑھا اُس سے ایک اجمالی اندازہ اس بات کا ہو گیا ہو گا کہ حالت امن ہو یا حالت جنگ دونوں صورتوں میں اسلام کا نظام اخلاق و معاملات اس قدر اعلیٰ اور بلند رہتا ہے کہ اس پر کاربند ہونے سے انسانی شرف و مجدہ صرف یہ کہ پست نہیں ہوتا بلکہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حق کے لئے مسلمانوں نے تلوار اٹھائی اور شجاعت و بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ دنیا آج تک ان پر حیران ہے لیکن چونکہ ان کی جنگ بھی خالصہً لوجہ اللہ ہوتی تھی اور سخت غیظ و غضب کے عالم میں بھی خدا اور رسول کے احکام کی پابندی کرتے تھے اس بنا پر جو قوس ان کی تلوار کی زخم خوردہ ہوتی تھیں وہی ان پر پروانہ وار قدا ہونے لگتی تھیں۔ گویا وہی مثل ہوئی ”وہی درج بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا“

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہاں قیام کیا، پھر جب وہ عراق واپس بلا یا گیا تو اس کی محبت و عقیدت اہل سندھ کے دلوں میں اس درجہ جڑ پکڑ چکی تھی کہ یہ لوگ بے ساختہ روتے تھے اور انھوں نے مقام کیرج میں اس کا ایک اسٹیچو

بطور یادگار بنا کر رکھا۔

اب آئیے اس پر غور کریں کہ ملک کے موجودہ حالات کی روشنی میں مسلمانوں کا معاملہ برادران وطن کے ساتھ کیا ہونا چاہئے اور انہیں کس زبانہ کے نظام اخلاق پر عمل کرنا چاہئے! اس سوال کا فیصلہ اس امر کی تنقیح پر موقوف ہے کہ موجودہ حالت حالت امن ہے یا حالت جنگ؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کل دونوں قوموں میں کشیدگی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور متعدد مقامات پر اس کشیدگی کا بخار سخت ترین خونی اور شدید قسم کی سفاکی و بربریت کی شکل میں ظاہر بھی ہو چکا ہے! لیکن یہاں معاملہ پورے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایک قوم نے من حیث القوم دوسری قوم کے خلاف باقاعدہ و باضابطہ اعلان جنگ کر دیا ہے اور با اشتراک تعاون کے تمام تعلقات یک قلم منقطع ہو گئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور نہ بحالت موجودہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ صورت حال یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں برطانوی اقتدار اعلیٰ کے محکوم ہیں۔ خود مختار حکومت نہ ان کے پاس ہے نہ ان کے پاس۔ اس بنا پر نہ اعلان جنگ اور اس پر آزادی کے ساتھ عمل نہ ادھر سے ہو سکتا ہے اور نہ ادھر سے۔ پھر جنگ کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں متحارب فریق دو الگ الگ کیمپوں میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں، اور یہاں ایسا نہیں ہے ہندو اور مسلمان سب محلہ محلہ، بلکہ خانہ بخانہ اور کوچہ کوچہ رہتے ہیں ملازمتوں میں ایک افسر ہوتا ہے دوسرا ماتحت، دفتروں میں ساتھ بیٹھتے ہیں۔ تجارت میں دونوں ایک دوسرے کے شریک ہیں، ملوں میں اور کارخانوں میں دکانوں پر اور بازاروں میں دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں میں دونوں شریک ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر کوئی انسان بصحت ہوش و حواس یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ و پیکار ہیں اور ان کا حکم متحارب قوموں کا ہے۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ گاندھی جی

اور مشرجلح دونوں اپنے مشترکہ اعلان میں صاف صاف باہمی خیانہ جنگی اور آپس کی بازو ہاڑ کی شدید مذمت کر چکے اور اس کو ہندوستان کے روشن نام کی پیشانی پر ایک بدنما داغ بتا چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ دونوں لیڈر اور ان کے علاوہ اور دوسرے چھوٹے بڑے لیڈر بھی مسلسل اپیلیں کر رہے ہیں کہ دونوں قوموں کو رواداری اور سہار کے ساتھ برادری کی طریقہ پر رہنا چاہئے۔ اور اپنی قوم کے لیڈروں کی نسبت یہ سمجھا شدید ترین غلطی ہے کہ یہ لوگ زبان سے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اُن کے دل میں نہیں یا خلاف واقعہ ہے۔ ایسا سمجھنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ خدا نخواستہ ہمارے لیڈر بزدل اور کمزور بھی ہیں اور منافق بھی۔ ایسی صورت میں جبکہ کوئی اپنی گورنمنٹ قائم نہیں، کسی قوم کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں کہ وہ اپنے لیڈروں کی رہنمائی پر اعتماد کرے اور اُن کے کہنے پر چلے۔

علاوہ بریں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر خدا نے مسلمانوں کو صلح کرنے اور جنگ نہ کرنے کا جو حکم دیا تھا۔ خود خدا نے قرآن مجید میں اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ مکہ میں اس وقت کچھ مسلمان مرد اور عورتیں ایسی تھیں جن کا علم مسلمانوں کو نہیں تھا ایسی صورت میں اگر جنگ کا حکم دیدیا جاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ان مسلمانوں کی بے خبری میں مکہ میں رہنے والے قلیل التعداد مسلمان مرد و عورت برباد ہو جاتے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ۚ وَمَا تَعْلَمُونَهُ مِمَّا نَقُولُ لَكَ وَمَا نُفِصِّلُ مِنْهُ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ ۚ
اور اگر مومن مرد اور عورتیں جن کو تم نہیں جانتے تھے جن کو تم پامال کر دیتے اور ان کی وجہ سے تم کو نقصان پہنچ جاتا بغیر علم کے (اگر یہ بات نہ ہوتی تو خدا تم کو جنگ کا حکم کر دیتا۔)

اس آیت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی ایک مقام کے مسلمانوں کے جنگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ کسی دوسری جگہ کے مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں تو مسلمانوں کو ہرگز جنگ نہ کرنی چاہئے

بلکہ صلح کر لینی چاہئے۔ اب اس آیت کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان میں مختلف قوموں کی آبادیوں کی پوزیشن پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کہیں ہندو اکثریت میں ہیں اور کسی جگہ مسلمان۔ پس ایسی صورت میں اگر بالفرض اکثریت والے صوبہ کے مسلمان جنگ کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقلیت والے صوبہ کے مسلمانوں پر اس کی زد پڑے گی اور انھیں شدید ترین خطرہ لاحق ہو جائے گا اس کو ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ اشتر کے نزدیک ایک مسلمان کی جان اتنی ہی قیمتی اور وقیع ہے جتنی کہ دس پچاس مسلمانوں کی۔ اس بنا پر آیت بالا سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ جب تک اقلیت والے مسلمانوں کی حفاظت و بقا کا بندوبست نہ ہوا اکثریت کے مسلمانوں کے لئے جنگ کرنا یا جنگ کے اسباب پیدا کرنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ کوئی اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لئے اکثریت کا اقلیت کو بالکل نظر انداز کر دینا، ان کے مفاد کا خیال نہ رکھنا، یا بالفاظ صحیح تریاسی اعتبار سے اقلیت کو غیر مسلم حکومت کا محکوم بنا دینا۔ شرعاً اس کو بھی کیونکر گوارا رکھا جاسکتا ہے؟

تقریب مذکورہ بالا کی روشنی میں اب اس حقیقت کے واضح اور مبہر بن ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ موجودہ حالات میں ہندو اور مسلمان دو متحارب قومیں نہیں البتہ ہاں دو متخاصم قومیں ضرور ہیں یعنی دونوں نے ارباب خصومت کی حیثیت سے اپنا مقدمہ برطانوی اقتدار اعلیٰ کی عدالت میں پیش کر رکھا ہے۔ دونوں طرف کے وکیل اور نمائندے اپنی اپنی قوم کی طرف سے وکالت کر رہے ہیں اور مقدمہ اپنے حق میں جیت لینے کی سعی کر رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ از روئے فقہ اسلامی، متخاصم اشخاص یا گروہ کا وہ حکم نہیں ہوتا جو متحارب اشخاص و گروہ کا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں آئینی جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ آئینی جنگ کا تعلق عوام سے نہیں ہوتا بلکہ صرف سیاسی لیڈروں اور نمائندگان قوم کے ساتھ ہوتا ہے اس بنا پر موجودہ حالات میں خود عوام کے آپس میں لڑنے کے کوئی سبب ہی نہیں۔ انھیں باہم شانتی اور امن رہنا چاہئے۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے حسب ذیل نتائج و نتیجیات برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) ہندو اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ نہیں بلکہ حالت امن ہے، اس بنا پر جنگ کے احکام پر عمل کرنا قطعاً ممنوع اور حرام ہے۔

(۲) چونکہ آبادیاں مخلوط ہیں اور مجموعی اعتبار سے مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اس بنا پر مسلمانوں کا فرض ہے کہ جنگ سے حتی الوسع باز رہیں اور جن باب سے اشتعال پیدا ہوتا ہو مثلاً گالی گلوچ دینا۔ کسی کی تہذیب اور مذہب کو برا کہنا اور اس کا مذاق اڑانا۔ کسی قوم کے بڑے آدمی کی تضحیک کرنا، ان سب چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اسلامی شرافت اخلاق بھی اس کی مقتضی ہے اور موجودہ حالات بھی اس کے داعی ہیں۔

(۳) جو مسلمان بلا وجہ کسی غیر مسلم پر حملہ کرتا ہے اس کو صاف اور کھلے دماغ کے ساتھ مفسد اور خود مسلمانوں کا دشمن سمجھا جائے اور اس بنا پر کسی مسلمان کو اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس کے اس ایک فعل کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ایک مضروب کے بدلہ میں کسی جگہ دو مسلمان مارے جائیں گے۔

(۴) گھروں میں آگ لگانا، تبدیل مذہب پر جبر کرنا، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا، زنا کرنا، یہ تمام چیزیں تو خود حالت جنگ اور قتال شرعی کی صورت میں بھی ناجائز اور شدید معصیت ہیں۔ اس بنا پر حالت امن میں اس قسم کے اعمال کا ارتکاب کیونکر گوارا کیا جاسکتا ہے!

مداغت کے لئے | اس میں شک نہیں کہ آج حالات بڑے صبر آزما اور حوصلہ فرسا ہیں، غنڈے اور تیار رہنے کا حکم | بد معاش مذہب کا نام لیکر شہری امن کو تباہ و برباد کرنے کی مساعی میں لگے ہوئے ہیں۔ با اینہم چونکہ دونوں قوموں کے ارباب حل و عقد نے امن کی اپیلیں کر رکھی ہیں اس بنا پر غنڈوں کی ایک یا متعدد جماعتوں کے فعل کی وجہ سے یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ ایک قوم من حیث القوم متحارب ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حلوں کی صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے! تو اس کا صاف اور کھلا جواب یہ ہے کہ جو لوگ یا جو افراد بلاوجہ مسلمانوں پر اس طرح کے حملے کریں، وہ بے شبہ مفسد، فتنہ پرداز، ظالم اور دشمن انسانیت و شرافت ہیں۔ ان کا ہر نوع مقابلہ کرنا چاہئے اور اس پامردی، استقلال اور جو غمخواری سے کرنا چاہئے کہ جب تک ظالم اپنے کیفر کردار کو نہ پہنچ جائے دم نہ لیا جائے۔ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اسلام اور غمخواری دو ایسی متضاد و متناقض چیزیں ہیں جو اک ساتھ جمع نہیں ہوتیں۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے کسی سے رحم و کرم کی بھیک نہیں مانگتا بلکہ اپنی حفاظت خود کرتا اور دوسروں کی حفاظت کا فرض بھی انجام دیتا ہے کہ قرآن نے اسے قواموں بالقسط کا منصب سپرد کیا ہے۔ اسی قسم کے حلوں سے محفوظ رہنے کے لئے قرآن مجید کا حکم ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ ۖ وَارْجُوتُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَأَعِدُّوا لَهُمْ
وَمِنْ رِجَالِ الْخَيْلِ تَرْهَبُونَ بِهِمْ ۚ دُشْمَنُوهُمْ ۚ وَأَعِدُّوا لَهُمْ
عَدُوًّا لِلَّهِ وَعَدُوًّا لِرَسُولِهِ ۚ وَتَعِدُّوا لَهُمْ ۚ وَتَعِدُّوا لَهُمْ ۚ
مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُوهُمْ ۚ اللَّهُ ۚ عِلَّاهُ دُونَ سَائِرِ الْوُجُوهِمْ ۚ تَعْلَمُوهُمْ ۚ
يَعْلَمُهُمْ ۚ مگر اللہ جانتا ہے۔ ڈرا سکو۔

پھر اسی آیت میں آگے چل کر یہ بھی فرما دیا گیا کہ اس تیاری کے سلسلہ میں مسلمان جو کچھ خرچ کریں گے وہ سب اللہ کے راستہ میں ہوگا جس پر آخرت میں ان کو ثواب ملے گا اور دنیا میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان پر ظلم نہیں کیا جاسکیگا۔

وَمَا تَفْقَهُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ ۚ وَأَوْفَى ۚ وَأَوْفَى ۚ وَأَوْفَى ۚ
الیکم وَاَنْتُمْ لَا تَظْلُمُونَ (الانفال) دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ سورہ نساء کی ایک آیت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خذُوا
حِذْرَكُمْ فَاغْرَبْ وَأَثَابَتْ أَوَافِرُهَا
لَكُمْ وَأَوَافِرُهَا لَكُمْ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خذُوا
حِذْرَكُمْ فَاغْرَبْ وَأَثَابَتْ أَوَافِرُهَا
لَكُمْ وَأَوَافِرُهَا لَكُمْ

غور کیجئے! پہلی آیت میں دو چیزوں کے تیار رکھنے کا حکم ہے ایک ”قوة“ اور دوسرا
”رابط الخیل“ ان میں سے اول الذکر چیز سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بچاؤ اور حفاظت کیلئے
وہ تمام چیزیں تیار اور آمادہ رکھنی چاہئیں جو ان کے لئے قوت و طاقت کا ذریعہ ہوں۔ مثلاً
آج کل تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، علم اور سائنس، سیاسی و دراندیشی اور سمجھ بوجھ یہ وہ
تمام آلات و اسباب ہیں جن سے ایک قوم مضبوط اور طاقتور قوم بنتی ہے۔ اور ہمارے زمانہ میں تو
یہ اس درجہ کارگر اور موثر حربہ ہیں کہ انہیں کے ذریعہ ایک قوم دوسری قوم کو فتح کر رہی ہے۔

اب رہا ”من رابط الخیل“ تو اس سے مراد اسلحہ جنگ ہیں۔ پس اب آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ
مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے لئے ”بسطۃ فی الجسد“ کے ساتھ ”بسطۃ فی العلم“ بھی حاصل کرنا چاہئے
تاکہ کوئی قوم ان پر جبر و ظلم اور عدوان و زیادتی نہ کر سکے۔ یہی حال دوسری آیت میں لفظ ”حذر“
کا ہے۔ حذر کے معنی بچنے کے ہیں اور حذر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے بچاؤ کیا جاسکے۔ چنانچہ
اس کے مفہوم میں عقل و خرد، سیاست، ڈپلن، اقتصادی و معاشی خوشحالی، آلات و اسلحہ جنگ
یہ سب داخل ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں کو ان چیزوں
کے فراہم رکھنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے اس کا مقصد کسی کو ستانا، لوٹنا، کھوٹنا اور قتل و غارت کرنا
نہیں بلکہ خود اپنی حفاظت اور بچاؤ کرنا اور اپنے سے دفاع کرنا ہے۔ ایک مسلمان کی شان یہ جس
طرح یہ بعید ہے کہ وہ ظالم اور مفسد ہو، اسی طرح اس کے لئے یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ مظلوم و

مقبور اور نشاء شرفاد بنے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کو عام طور پر حکم دیا کرتے تھے۔

وعلموا اولادکم العوم والہمایۃ ثم اپنی اولاد کو تیرنا اور تیر چلانا سکھاؤ۔

بات چونکہ بالکل بے لاگ ہو رہی ہے۔ اس بنا پر یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں پر اے کے دے چلے ہونے لگیں تو ان کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان بھی اسی طرح جواب ترکی بترکی دینا شروع کر دیں۔ ورنہ اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا تو حملہ آور قوم کے لوگ شیر سہ جانیں گے اور وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان کو اور زیادہ ستائیں گے۔ ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام ایک دین حق ہے۔ اس کا نظام بہر جہت کامل و مکمل ہے اس کے احکام بالکل صاف اور کھلے ہیں جن میں کوئی ایچ پیج یا کسی قسم کا کوئی گنجلک نہیں ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ جس شخص نے کسی ایک راہ چلتے مسلمان پر حملہ کیا ہے وہ بے شبہ ظالم اور مفسد ہے اور اس کے ساتھ ہی معاملہ کرنا چاہئے جو ظالمین و مفسدین کے ساتھ از دئے قانون کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کو سہی کرنی چاہئے کہ ایسا فتنہ پرداز پکڑا جائے اور اس کو قرا اور واقعی سزا ملے۔ لیکن اگر بالفرض وہ گرفتار نہیں ہوتا تو اب اس کے اس فعل کا انتقام کسی دوسرے شخص سے لینا حالانکہ وہ بالکل پرامن ہے اور اس سے کسی مسلمان کو کوئی آزار نہیں پہنچا ہے، شرعاً عقلاً یا اخلاقاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے اگر مسجد میں کسی نے آپ کے جوتے چرائے ہیں اور اصل چوہ کا پتہ نہیں لگتا تو کیا آپ کے لئے یہ جائز ہے کہ گناہ چوری کی واردات کو روکنے اور اس کا سدباب کرنے کی غرض سے کسی دوسرے شخص کا جوتہ چرائیں۔

آج کل کا مغربی طریق فکر یہ ضرور ہے کہ *Ends Justify Means*۔ یعنی کسی عمدہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن خوب یاد رکھئے کہ اسلام اس طریق فکر سے کلی طور پر ایبا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک اعلیٰ اور

جائز و بلند مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کے لئے وسائل و ذرائع بھی نیک اور جائز اختیار کئے جائیں۔ اگر ایک طاقتور اور تندرست نوجوان شادی کے اخراجات برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اسلام صحت و تندرستی کی خاطر اس نوجوان کو زنا کرنے کی یا ایک غریب آدمی کو اپنے بال بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے علاج معالجہ کے لئے چوری کر لینے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ پھر ایک مسلمان پر انفرادی حملہ کے جواب میں کسی ایک غیر متعلق غیر مسلم پر انفرادی حملہ کرنے سے آپ کا مقصد بھی تو حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس سے اور اشتعال بڑھے گا اور اب اور دوسرے سمنوں پر حملے ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مجرم تو بچ جائے گا اور دوسرے بے گناہ لوگ طرفین سے خواہ مخواہ تیغِ ستم کا نشانہ بن جائیں۔ بہر حال جب تک ایک قوم من حیث القوم شرعاً متحارب قرار نہیں پاتی فاقلوہم حیث ثقفہم وہم پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج کل کے انتہائی صبر آزما حالات اور عقل و جذبات کی شدید ترین کشمکش کے زمانہ میں توازنِ فکر و عمل پر قائم رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے ”جام و سنداں بافتن“ کا پہلے بھی مظاہرہ کیا ہے اور اب پھر کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس یقین کے پیدا کرنے کی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود اور دینی و دنیوی کامیابی و کامرانی کا دار و مدار صرف قرآن کی تعلیمات اور اسلامی فضائل اخلاق پر کار بند ہونے اور ان پر جمے رہنے پر ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو قرآن کی بشارت انھیں کے لئے ہے۔

لَا تَقْنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَانْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی

علماء و مشائخ کا اجتماع

از جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے

دہلی، اسلامی ہند کی ابتدا سے صوفیاء اور علماء کا مرکز رہی ہے۔ درجہ و فرات سے علم و عرفان کی جو موجیں اٹھی ہیں وہ جتنا ہی کے کناروں سے آکر ٹکرائی ہیں۔ بغداد و بخارا سے جو علمی و روحانی قافلے چلے ہیں، وہ یہیں آکر ٹھہرے ہیں۔ اس کی رونق کا یہ عالم تھا کہ چپہ چپہ پر خانقاہیں تھیں، قدم قدم پر مدرسے تھے، کوچہ کوچہ میں مسجدیں تھیں، دور دور سے شائقین علم و فضل یہاں آکر جمع ہوتے تھے۔ تشنگان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے اور یہاں پہنچتے تھے۔ ہندوستان کا یہ دارالسلطنت "رشک بغداد و غیرت مصر" بنا ہوا تھا۔ یہاں کے شاعر اس طرح اس کی عظمت اور بلندی کا اعلان کرتے تھے۔

حضرت دہلی کشف دین و داد جنت عدن است کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات حرمہا اللہ عن الحادثات

۱۷ چودھویں صدی عیسوی کا ایک مورخ شہاب الدین العمری لکھتا ہے کہ صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے، دو ہزار کے قریب خانقاہیں اور شفا خانے ہیں۔ (مسائل الابصار۔ ص ۳۹) (انگریزی ترجمہ ۱۹۳۷ء مطبوعہ لاہور) ۱۷ تاریخ فیروز شاہی۔ از ضیاء برنی۔ ص ۲۴۱۔

(مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی سرسید انڈیشن)

ملک زرد روازہ اود فتح یاب سیرودہ دروازہ و صد فتح باب
نام بلندش رہ بالا گرفت تابہ ختن شد رہ بغا گرفت
گر شنود قصہ این بوستان مکہ شود طائف ہندوستان

انیسویں صدی میں جبکہ سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری تھا اور زوال و انحطاط کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، دہلی اپنی دیرینہ شان و شوکت کو خیر باد کہہ چکنے کے باوجود انتہائی بارونق تھی ابھی کچھ نقوش باقی تھے جن سے ”کاروانِ رفتہ“ کی عظمت و شوکت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی اگر کسی نے یہاں کے علماء سے دہلی کی حالت کے متعلق سوال کر لیا تو بے اختیار کہہ اٹھے

إِنَّ الْبَلَدَ أَمَاءٌ وَهِيَ سَيِّدَةٌ وَأَتَّهَا دُرَّةٌ وَالْكَلُّ كَالصَّدْفِ

(دوسرے شہر لونڈیاں ہیں اور دہلی ملکہ۔ یہ موتی ہے اور باقی سب سبیاں) سلہ
اور اس میں واقعی کوئی مبالغہ بھی نہ تھا۔ یہاں اب بھی علم و عرفان کے ایسے چشمے ابل رہے تھے جن سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ہند بھی مستفیض ہو رہا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ اسلامی ہند نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانہ میں دنیا کے مسلمانوں کو مشعلِ راہ دکھائی۔ ایک ایسے نازک دور میں جبکہ تمام دنیائے اسلام حدیث و سنت کو بھول چکی تھی۔ دہلی ہی نے اس کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ جس کا اعتراف مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا نے اس طرح کیا۔

۱۰ ایک مجلس میں خسروؒ کے یہ اشعار پڑھے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے لگے۔

”دقتیکہ خسرو گفتم دہلی ہم چنین بود کہ بچو نظام الدین اولیا سلطان المشائخ موجود بود کہ
می گویند چون آدم داخل غیاث پور می شد حالش دگر گوی می شد“

(ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ (مطبوعہ میرٹھ) ص ۶۳)

۱۱ یہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا شعر ہے۔ سرسید نے آثار الہ اودید ص ۴۲ پر نقل کیا ہے۔ میرے پیش نظر آثار کا سب سے پہلا نسخہ ہے بعد کے نسخوں میں بات چہام نہیں ہے۔

ولولا عنائۃ اخواننا علماء الهند "ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں جو علماء ہیں اگر
 بعلوم الحدیث فی هذا العصر حدیث کے علوم کے ساتھ ان کی توجہ نہ ہوتی
 لقضی علیہا بالزوال من امصار تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ
 الشرق فقد ضعف فی مصر الشام مصر، شام، عراق، حجاز میں دسویں صدی ہجری
 والعراق والحجاز منذ القرن العاشر سے یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا اور چودھویں
 للبحر حتی بلغت منتہی لنضعف فی صدی کے اوائل تک ضعف کی آخری منزل
 اوائل هذا القرن الرابع عشر۔" پہنچ گیا تھا۔

چند نفوس قدسیہ کی موجودگی نے دہلی کو تمام ممالک اسلامیہ کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ شاہ
 غلام علی صاحب کی خانقاہ میں شام، مصر، چین اور حبش کے لوگوں کے جھگٹے لگے رہتے تھے تو
 دوسری طرف شاہ عبدالعزیز صاحب کے خرمن کمال کے خوشہ چین ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے
 تھے اور علوم دینی کا چرچا کر رہے تھے۔ سلطنت دم توڑ رہی تھی، سیاسی زوال و پستی کی آخری منزلیں
 طے ہو رہی تھیں، لیکن "ذہنی شعور" ابھی مردہ نہ ہوا تھا۔ کچھ بیدار مغز انسان تجدید و احیاء کے
 نئے راستے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اس سیاسی زوال کو مذہبی اور ذہنی زوال کا پیش خیمہ بنانا نہیں چاہتے
 تھے۔ اللہ کے یہ فرماں بردار بندے حوادث کا مقابلہ کر رہے تھے اور ملت کو مذہبی انتشار اور ذہنی تنزل
 سے بچانے میں مصروف تھے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سلطنت کا جاہ و جلال ختم ہونے کے
 بعد بھی مذہب کی رونق کم نہ ہوئی۔ مذہب میں لوگوں کی دلچسپی اسی طرح برقرار رہی۔ مسجدوں
 کی وہی شان تھی۔ رمضان کے مہینے میں چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں دو دو تین تین جگہ تراویح

۱۔ شاگردان دے مراقبیم در دراز رسیدہ باب علوم دینی بروے خلق کشادند،
 خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۸۸۔

ہوتی تھی۔ جامع مسجد کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ وہاں جتنی جگہ تراویح ہوتی تھی اس کی تعداد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زبانی سن کر حیرت ہوتی ہے۔ ۱۷

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے یک دم دہلی کی بساط الٹ دی پرانی مجلسیں درہم برہم ہو گئیں علمی و مذہبی محفلیں سرور ہو گئیں۔ گھر کے گھر بے نور و بے چراغ ہو گئے۔ ۱۸

یاشب کو دیکھتے تھے کہ سرگوشہ بساط دامانِ باغیاں و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے اگر تو بزم میں نے وہ سرور و شور نہ جوشِ خروش ہے (غالب)
مسجدیں سمار ہو گئیں، خانقاہیں تباہ و برباد ہو گئیں، مدرسوں میں کھیتی ہونے لگی۔ مسجد اکبر آبادیؒ جس کی رفعت و شان کے آگے گنبدِ اختر بہت معلوم ہوتا تھا ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ مدرسہ رحیمیہ جہاں سے ولی اللہی حکمت کا چشمہ ابلا تھا اور جہاں شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ نے قرآن و حدیث کے درس دیئے تھے وہاں مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داسؒ کا تختہ لگ گیا۔ میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑ و دیدی کا غذ کا پرزا، سونے کا تار پشینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کا مقبرہ اجڑ گیا۔ کیا اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت نہیں تھے اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں۔ ۱۹

بڑے بڑے گھرانے تباہ و برباد ہو گئے۔ عزت و ناموس کا بچا نامحال نظر آنے لگا۔ جب مصائب ناقابلِ برداشت ہو گئے تو بڑے بڑے بزرگ اور عالم دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۷ آثار الصنادید ص ۱۳۳۔ ۱۸ ملفوظات شاہ عبدالعزیز (مطبوعہ میرٹھ)

۱۹ آثار الصنادید ص ۲۷

۲۰ واقعات دارالحکومت دہلی مولوی بشیر الدین ج ۲ ص ۱۶۷

۲۱ غالب کا خط سید احمد حسن مودودی کے نام۔ اردوئے معلیٰ (آگرہ ۱۹۱۳ء) ص ۱۸۲-۱۸۳۔

میاں کالے صاحب کے بیٹے میاں نظام الدین نے حیدر آباد کا رخ کیا۔ اور شاہ فخر الدینؒ کی خانقاہ سونی پڑ گئی۔ شاہ احمد سعید صاحب مجددیؒ نے حسین حسین الشریفین کی راہ لی۔ اور شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کا چراغ گل ہو گیا۔ ہر طرف حسرت اور بایوسی چھا گئی۔ جو اس ہنگامہ داروگیر سے بچے وہ کافور و کفنؒ کی تمنا کرنے لگے۔ زندگی و بال معلوم ہونے لگی۔ جب کسی نے ان گزشتہ محفلوں کا ذکر چھیڑا تو بے اختیار دل کو یکہ ذکر کہنے لگے۔

تذکرہ دلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز (حالی)

اس مضمون میں ہم ۱۸۵۷ء سے پہلے کے اُن شارح و علماء کا ذکر کریں گے جنہوں نے اس طوفانی دور میں اسلامی سوسائٹی کو ابتری اور انتشار سے بچایا اور حدیث و قرآن کا وہ چرچا کیا کہ مذہب، سیاسی زوال کے خطرناک اثرات سے بچ گیا۔ اس زمانہ میں علماء و صوفیاء کی کوشش تھی کہ عوام کو سنت و شریعت کا پابند بنایا جائے۔ وہ اسی میں مسلمانوں کے مرض کا علاج اور آئندہ ترقی کا راز پاتے تھے۔ چنانچہ خانقاہوں میں شریعت و سنت کی تلقین ہوتی تھی اور دروسوں میں حدیث و کتاب کا درس۔

حضرت شاہ غلام علی صاحب | حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۴۰-۱۱۵۶) کی خانقاہ اس زمانہ میں دلی کی سب سے زیادہ شاندار خانقاہ تھی۔ شاہ صاحب نقشبندیہ مجددیہ سلسلہ کے

۱۸۵۷ء غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "حال میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگے تھے وہ بھی بھاگ گئے۔" یہ وہی ہے، اورنگ آباد میں رہے۔ حیدر آباد میں ہے۔ اردوئے معلیٰ ص ۲۳۱۔

۱۸۵۷ء مجھے کافور و کفن کی فکر پڑی ہے وہ ستم گر شعر و سخن کا طالب ہے (غالب ص ۲۱۳) دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں (ص ۶۰)

جنوری ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں "زندہ ہوں مگر زندگی و بال ہے" (ص ۶۰)

۱۸۵۷ء خانقاہ کے محل وقوع کے لئے ملاحظہ ہو۔ واقعات دارالحکومت دلی۔ جلد دوم ص ۱۵۳

مشہور بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے عزیز مرید اور خلیفہ تھے۔ علم و فضل، زہد و ورع میں یکتائے عصر اور یگانہ روزگار تھے۔ ان کی خانقاہ بقول حالی ”دین دار مسلمانوں کا بلجا و ماویٰ تھی“^۱ ان کے ایک ہزار کے قریب خلیفہ اور لاکھوں مرید تھے۔ اور مرید بھی اس مرتبے کے کہ ان کی علمیت و فضیلت کے شہرہ سے مصر و ہندوستان گونج رہا تھا۔ دور دور سے لوگ شاہ صاحب کی خدمت میں عقیدت و ارادت کی نذر لیکر حاضر ہوتے تھے سرسید کا بیان ہے۔

”میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم و شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امڈے تھے“^۲

غلام محی الدین قصوری نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ صاحب خود فرمانے لگے کہ ”ہمارا فیض دور دور پہنچ گیا ہے۔ حضرت مکہ معظمہ میں ہمارا حلقہ بیٹھا ہے۔ حضرت مدینہ منورہ میں ہمارا حلقہ بیٹھا ہے۔ بغداد شریف، روم و مغرب میں ہمارا حلقہ جاری ہے۔“^۳

۱۔ ”حیات جاوید“ از حالی (رعد ایڈیشن سنہ ۱۹۰۷ء) جلد دوم - ص ۹
 ۲۔ ”جواہر علویہ“ از مولانا محمد رفیع احمد خلیفہ حضرت شاہ غلام علی (مطبوعہ لاہور) ص ۲۴۱۔
 ۳۔ شاہ صاحب کے ایک عظیم المرتبت مرید شیخ خالد کردی تھے جن کے مناقب میں علامہ شامی نے ایک مستقل رسالہ ”سل الحسام الہندی لنصرة مولانا خالد نقشبندی“ لکھا تھا۔
 ۴۔ سرسید اور ان کے گھرانے کو شاہ صاحب سے خاص عقیدت تھی۔ شاہ صاحب بھی ان پر خاص التفات فرمایا کرتے تھے۔ سرسید کا نام شاہ صاحب ہی نے رکھا تھا (حیات جاوید ص ۳۴) اور ان کی بسم اللہ بھی شاہ صاحب ہی نے پڑھائی تھی۔ (حیات جاوید ص ۴۱)

۵۔ آثار الصنادید۔ ص ۱۸ (باب چہارم)

۶۔ مشائخ نقشبندیہ مجددیہ از مولوی محمد حسن - ص ۳۰۹

شاہ صاحبؒ کی خانقاہ میں بڑی رونق رہتی تھی۔ پانچ پانچ سو فقیران کی خانقاہ میں ہوتا تھا اور وہ ان کے کھانے اور پہنے کا بندوبست کرتے تھے، توکل کا یہ عالم تھا کہ کوئی نواب یا رئیس جاگیر پیش کرتا تو قبول نہ کرتے بلکہ جواب میں فرمادیتے اللہ تعالیٰ کے وعدے ہماری جاگیر ہیں۔ ایک مرتبہ امیر محمد خاں والی ٹونک نے وظیفہ قبول کرنے کی درخواست کی۔ مولانا روفؒ احمد مصنف جواہر علویہ کو حکم ہوا کہ جواب میں یہ شعر لکھ دو۔

ما آبروے فقر و قناعت نمی بریم با میر خاں بگو کہ روزی مقرر است
قناعت اس قدر تھی کہ زبان پر شیخ ابن یسین کے یہ شعر ہتے تھے۔

نان جویں و خرقة پشیمین آب شور سیارہ کلام و حدیث ہمیری
ہم نسخہ دو چار ز علیکہ نافع است در دیں نہ لغو بعلی و ژاثر عنصری
تاریک کلبہ کہ پئے روشنی آں بیہودہ منتے نبرد شمع خاوری
بایکد و آشنا کہ میرزد بہ نیم جو در پیش چشم مہت اولک سنجری
ایں آں سعادت است کہ حشر برورد جو بایں تحت قبصر و ملک سکندری

شاہ صاحبؒ حدیث کے بڑے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے حدیث کی سند امام المحدثین حاجی محمد افضل صاحبؒ سے جو مرزا مظہر جان جاناں کے بھی استاد تھے حاصل کی تھی۔ وہ خود نہایت پابندی سے فجر اور ظہر کے بعد طلباء کو تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے

۱۷ آثار الصنادید ص ۱۸، جواہر علویہ ص ۱۲۲ - میں فقیروں کی تعداد دو سو لکھی ہے۔

۱۸ جواہر علویہ ص ۱۲۶

۱۹ جواہر علویہ ص ۱۲۶، آثار الصنادید ص ۱۸، مثنیٰ نقشبندیہ مجددیہ ص ۳۱۳

۲۰ جواہر علویہ ص ۱۵۳ - خزینۃ الاسفیاج ص ۶۹۷

۲۱ جواہر علویہ ص ۱۲۳، ایضاً ص ۱۲۳ و ۱۲۴۔

کہ میں کتابیں ایسی ہیں جن کی نظیر نہیں۔ کلام اشعر بخاری۔ اور ثنوی مولانا روم^۱۔
 شاہ غلام علی صاحب کو اتباع سنت و شریعت کا خاص خیال رہتا تھا۔ وہ اپنے مریدوں
 اور مخلصوں کو برابر نماز کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نماز تمام عبادات کی جامع اور
 تمام طاعتوں پر حاوی ہے۔ خلاف شرع و سنت لوگوں سے وہ بہت خفا ہوتے تھے اور اپنی مجلس
 میں ان کا آنا تک گوارہ نہ فرماتے تھے۔ غرض شاہ صاحب نے اپنی عمر شریعت و سنت کی تلقین میں
 بسر کی جب وصال کا وقت آیا تو وصیت نامہ میں بھی سنت نبوی پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی۔
 رسول مقبول سے ان کو عشق تھا۔ زبان پر نام آتا کہ ایک کیفیت طاری ہو جاتی۔ رسول پاک سے
 ان کی عقیدت اور اتباع سنت کا عالم بکچھ کر سرسید بے اختیار پکاراٹھتے ہیں "اور میں تو اس
 بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور مار خود رفتگی کے سر مو احکام شریعت سے تجاوز نہ تھا۔
 اور جو کام تھا بہ اتباع سنت تھا"۔^۲

شاہ صاحب سے آخری زمانہ میں جو فیض جاری ہوا وہ عدیم النظیر تھا۔ ان کے مریدین کا
 جال تمام عالم اسلام میں پھیل گیا تھا۔ ہندوستان میں کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں ان کے
 مرید و عقیدت مند نہ ہوں۔ ان کے مشہور خلیفہ خالد کردی نے ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے
 جس کے چند شعر یہ ہیں۔

امام اولیا سیاح بیدائے خدا بینی	ندیم کبریا سلج دیائے خداوانی
مہیں رہنمایاں شمع جمع اولیائے دیں	دلیل پیشوایاں قبلہ اعیان روحانی

^۱ جواہر علویہ۔ ص ۱۵۲۔ ثنوی کے متعلق تو صحیح کہا گیا ہے "ہست قرآن در زبان پہلوی"۔

^۲ " " " " ۱۵۵۔ " آثار الصنادید ص ۲۱۔ " جواہر علویہ ص ۲۳۶

^۳ " " " " ۱۴۷۔ " آثار الصنادید ص ۲۰۔

چراغ آفرینش ہر برج دانش و بینش کلید گنج حکمت محرم اسرار سبحانی
ابنِ قدس عبد اللہ شہ کز التفاتِ او و در سنگِ سہ قاصیت لعلِ بدخشان

حضرت شاہ ابوسعیدؒ | حضرت شاہ ابوسعید صاحبؒ (۱۲۵۰-۱۱۹۶ھ) حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے مرید اور خلیفہ تھے اور ان کے بعد سجادہ پر بیٹھے وہ بڑے جید عالم اور بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے غلام سرور نے لکھا ہے۔

”جامع بود میان علوم ظاہری و باطنی وفقہ و حدیث و تفسیر“ ۱۷

علوم ظاہری میں وہ مفتی شرف الدین صاحبؒ دہلوی اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور مولانا سراج احمد صاحبؒ بخند و حدیث کی سند حاصل کی تھی کلام اللہ حفظ تھا علم قرأت میں بکثرت روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور کمال قرأت سے پڑھتے کہ لوگ دور دور سے منے آتے تھے۔ ۱۸

شاہ صاحبؒ کے رات دن علوم دین کے درس میں صرف ہوتے تھے۔ وقت بچتا تو کلام اللہ لکھ کر وقف کرتے تھے ۱۹ اتباع سنت نبویؐ کا خاص اہتمام تھا۔ شاہ غلام علی صاحبؒ کے بعد ۱۰ یا ۱۱ سال تک سجادہ پر بیٹھے اور ہمیشہ متبع سنت کی تلقین کرتے رہے، آپ کی شکل بے حد نورانی تھی اور بے اختیار آپ کی صحبت میں حاضر رہنے کو جی چاہتا تھا ۲۰ اخلاق کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ہر ملنے والا یہ سمجھتا تھا کہ میں قدر خصوصیت مجھ سے ہے کسی سے نہیں۔ مولوی محمد حسین مصنف مشائخ نقشبندیہ لکھتے ہیں ”چونکہ آپ کے مزاج میں ایثار بدرجہ غایت تھا اس سبب سے تلخی و سختی

۱۷ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۷۱ — ۱۸ مولانا سراج احمد صاحبؒ بڑے عالم فاضل احمد علیہ تھے، آپ نے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں۔ مثلاً ترجمہ صحیح مسلم، صحیح ترمذی، شرح صدوق، شرح بنو سافرہ، بیان التاویل وغیرہ جواہر علویہ ص ۲۸۵ — ۱۹ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۷۱

۲۰ آثار الصنادید ص ۲۳ - ۲۴ ایضاً ص ۲۲ - ۲۳ ایضاً

نقد و فاقہ کہ حسن درویشی ہیں بہت جہلیں۔ تحمل و بردباری و شکست و مسکنت آپ کے مزاج میں اس قدر تھی کہ جو شاہ صاحب قبلہ کے منکر تھے وہ بھی آپ کے مرید ہو گئے۔ ۱۷

شاہ صاحب کا گھر بار بھی تھا اور بال بچے بھی۔ ان علاقہ کے باوجود وہ ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ شاہ غلام علی صاحب فرمایا کرتے تھے: ”مجھ کو ابو سعیدؒ پر فخر ہے۔ میں نے اگر فقیری کی تو کسی کا غم نہیں رکھا۔ ابو سعیدؒ کو دیکھو کہ باوصف علاقہ دنیاوی کے اپنے معبود کی عبادت میں مصروف ہے کہ گویا مطلق کوئی تعلق نہیں رکھتا۔“ ۱۸

شاہ ابو سعیدؒ سے ہزاروں آدمیوں نے فیض حاصل کیا۔ انھوں نے تمام غیر مالک سے جہاں سلسلہ مجددیہ جاری تھا اپنا رابطہ قائم رکھا۔ شیخ خالد کردیؒ کے خطوط برابر آتے جاتے تھے۔ ایک خط جس سے سلسلہ کی اشاعت کا پتہ چلتا ہے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

”مرکز دائرہ غربت و مہجوری خالد کردی شہر رفسی بعرض مقدس عالی مخدومی جناب ابی سعید مجددی معصومی میرساند اگرچہ بہ بین ہمت حضرت قبلہ عالم روحی فداہ فیوض فاندان عالیہ آبلہ واجداد کرام آں مخدوم عالی مقام کہ بیرون از حیز تحریر و خارج از حوصلہ تقریر است لما بغوائے مالایدرک کلمہ لایترک کلمہ بمقام شکر گذاری برآمدہ عرض حضور می نماید کہ یک قلم تہامی مملکت روم و عربستان و دیار حجاز و عراق و بعضے از مالک قلم و عجم و جمیع کردستان انجذبات و تاثیرات طریقہ علیہ سرشار ذکر و محامد حضرت امام بابیؑ آخر عمر میں آپ کو حرمین الشریفین کی زیارت کا شوق ہوا۔ راستے میں بمقام لونگ وصال فرمایا آپ کو دہلی لا کر حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔“

۱۷ مثنوی نقشبندیہ مجددیہ ص ۲۲۲ - ۱۸ آثار العبادید ص ۲۲ - ۱۹ ایضاً ص ۲۵ -

۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ -

شاہ احمد سعید صاحب | شاہ ابو سعید صاحب کے چار صاحبزادے تھے۔ آپ کے بعد بڑے لڑکے شاہ احمد سعید مجددی (۱۲۷۷-۱۳۱۷) سجادہ نشین ہوئے۔ شاہ احمد سعید صاحب حافظ تھے اور اپنے والد ماجد کی طرح عالم و فاضل تھے۔ حدیث و فقہ میں نہایت بہارت رکھتے تھے۔ مولوی فضل امام صاحب اور مفتی شرف الدین صاحب سے علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کئے تھے۔ اور مولوی رشید الدین صاحب سے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے علم حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ درس و تدریس آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ دور دور سے طلباء آپ کے پاس آتے تھے۔ علم دین پر پورے عبور اور کامل واقفیت کی وجہ سے استفتا آپ کے پاس بھیجے جاتے تھے اور آپ کے فتویٰ کو نہایت عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

شاہ صاحب اپنے بزرگوں کی طرح سنت و شریعت کی تلقین میں مشغول رہتے اور مریدوں کو اتباع سنت کی ہدایت فرماتے رہتے تھے۔ شاہ غلام علی جعفریایا کرتے تھے ”ابو سعید، رؤف، بشارت اللہ اور احمد سعید اس زمانہ میں ستون دین محمدی ہیں۔“

شاہ صاحب کے زمانہ میں شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کی شان و شوکت برقرار رہی، ان کے یہاں ہندوستان و خراساں سے لوگ آتے تھے اور ان کے خلفاء قندھار و کابل میں موجود تھے۔ انھوں نے شاہ غلام علی صاحب کے سلسلہ کے بین الاقوامی نظام کو قائم رکھا۔ ہندوستان سے باہر بھی ان سے عقیدت و ارادت کا یہی حال تھا۔ حاجی ابرار دانش صاحب ہاجر کی ”سے روایت“ ہے: ”شاہ احمد سعید مجھ سے پہلے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے جب میں وہاں پہنچا تو آپ بہت مریض تھے۔ ترک لگ قلعہ میں معالجہ کے لئے اٹھائے گئے تھے۔ ترک ان کی بہت تعظیم و توقیر کرتے تھے۔“

۱۔ آثار الصنادید ص ۷۷ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۷۹۔ ۲۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۷۹۔ ۳۔ ایضاً ص ۷۹۔ ۴۔ شام ابرار، ترجمہ انقبات مکیہ، الزحاجی محمد تعفیٰ خاں (مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ ص ۱۷۶)۔

غدر کے ہنگامہ میں شاہ صاحب اپنے اہل و عیال کو لیکر مجبوراً حرمین الشریفین چلے گئے تھے۔ ان کے ہندوستان سے چلے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدت و ارادت کا ایک ایسا مرکز ٹوٹ گیا جس کے ذریعہ ہندوستان کے مسلمانوں کا تمام ممالک اسلامیت سے قریبی روحانی رشتہ بندھا ہوا تھا۔ اُن کے ہندوستان میں قیام کے زمانہ میں عجم و عرب کے بہت سے لوگ دہلی کی طرف ہی رجوع کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے ۱۲۷۷ھ میں وصال پایا اور حضرت عثمان غنیؓ کے روضہ کے قریب مدفون ہوئے۔ ۱۷

شاہ عبدالغنی | شاہ عبدالغنی صاحب (۱۲۹۶-۱۲۳۴) شام احمد سعید صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور اُن کے بعد سجادہ پر بیٹھے تھے۔ ان کا علمی تجربے مثال تھا۔ انھوں نے حدیث کی کچھ کتابیں اپنے والد ابو سعید صاحب سے پڑھی تھیں اور کچھ شاہ محمد اسحاق صاحب سے۔ شاہ اسحاق صاحب اور شاہ ابو سعید صاحب دونوں محدث زباں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد ہیں۔ اس طرح ہر دو سلسلہ سے آپ کی اسناد حدیث تیسری پشت پر حجتہ اللہ البالغہ سے جا ملی ہے مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ صاحب نے شاہ رفیع الدین صاحب کے صاحبزادے مولانا مخصوص اللہ صاحب کے پڑھ کر سنائی تھی اور بعد ہجرت مدینہ میں بخاری شریف کا کچھ حصہ تبرکاً شیخ محمد عابد الانصاری السندی ثم المدنی کو سنایا تھا۔ مدینہ منورہ ہی میں مقدونیہ کے مشہور عالم شیخ اسمعیل بن ادیس الرومی نے خود اپنی خوشی سے صحاح کی اجازت آپ کو عطا کی۔ ان سب اساتذہ کی اسانید بالتفصیل ایک مستقل کتاب کی صورت میں طبع ہو چکی ہیں جن کا نام ”الیا لئح الکجنی“ ہے۔ ۱۸

غرض شاہ عبدالغنی صاحب حدیث میں یگانہ روزگار تھے۔ اپنے عہد کے پانچ بہترین اساتذہ

۱۷ واقعات دارالحکومت دہلی - ج ۲ ص ۱۵۴

۱۸ تذکرۃ التحلیل - مولانا عاشق الہی مرحوم (مطبوعہ میرٹھ) ص ۱۸-۱۷ نیز واقعات ص ۱۵۴

سند حدیث حاصل کر چکے تھے۔ علمی تبحر سے قطع نظر اُن کا تقدس اور تقویٰ بے مثال تھا۔ سرسید نے اسی وجہ سے ان کو فنافی السنۃ لکھا ہے۔ شریعت کے معاملہ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ صرف اس خیال سے کہ ہندوستان میں جو طریق بیع و شراب بعض بعض فواکہ وغیرہ کا جاری ہے وہ از روئے شرع درست نہیں ان چیزوں کے مزہ سے واقف نہیں^{۱۷} شریعت کے اس احترام کی مثال قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں مل سکتی ہے۔ شاہ صاحبؒ کی اس احتیاط کو دیکھ کر حضرت امام جنیلؒ کا وہ اہتمام یاد آجاتا ہے جو انھوں نے بغداد میں قیام کے زمانہ میں موصل سے آٹا منگانے کے سلسلہ میں کیا تھا۔ بغداد کو حضرت عمرؓ نے نازبوں پر وقت کیا تھا اس لئے امام صاحب وہاں کا آٹا کھانا ناجائز تصور کرتے تھے اور موصل سے آٹا منگاتے تھے۔ ۱۸

حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبدالغنی صاحب شریعت کو مذہبی زندگی کا مرکز تصور کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمان کے لئے سوائے اتباعِ شریعت، دین و دنیا میں کوئی راہِ فلاح و نجات نہیں ملے گی۔ وہ مذہبی معاملات میں نہایت سختی برتتے تھے وہ فرمایا کرتے تھے ”سوائے انحراف از حکمِ شریعت کے سخت سے سخت کوئی مصیبت نہیں“۔ ۱۹

شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے فیض یاب ہونے کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ سے طلباء آتے تھے اُن کی خانقاہ سینکڑوں علماء کا مرکز بن گئی تھی۔ اُن کے فیضِ تعلیم نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے عالم اور بزرگ پیرائے جو فقہ حنفی کے ایک راخِ القدم امام اور مجتہد تھے۔ ۲۰

۱۷ آثار الصنادید۔ ص ۲۷۔ ایضاً۔ ۳۷ اجار العلوم۔ امام الغزالیؒ۔ باب چہارم
۱۸ آثار الصنادید۔ ص ۲۷۔

۱۹ میں نے مولانا رشید احمد کو فقہ حنفی کا ایک راخِ القدم امام اور مجتہد پایا۔ آپ اپنے استاد مولانا عبدالغنی کے طریقہ فکر کے بڑی سختی سے پابند تھے اور اس راہ میں پاڑ کی طرح غیر متزلزل تھے۔

۲۰ مولانا عبید اللہ سندھی (شاہ ولی اللہ دہلوی کی سیاسی تحریک۔ ص ۲۵۸)

غدر کے بعد شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر گئے اور مدینہ منورہ میں قیام فرمایا۔ ۱۲۹۶ھ

میں وصال فرمایا اور وہیں شاہ ابوسعید صاحب کے قریب مدفون ہوئے۔ ۱۳۰۰ھ

شاہ محمد آفاق صاحب | شاہ محمد آفاق صاحب (۱۲۵۱-۱۱۶۰) مجددیہ سلسلہ کے بڑے عظیم المرتبت بزرگ

تھے۔ آپ شاہ ضیاء اللہ صاحب نقشبندی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خواجہ میر درد کی صحبت میں بھی رہے تھے۔ اور ان سے فوائدِ باطنی اخذ کئے تھے۔ آپ کے فیضانِ صحبت سے بہت لوگ مستفید ہوئے۔

ایک چشمہ فیض تھا جو جاری تھا اور جہاں سینکڑوں تشنگانِ معرفت جمع ہوتے تھے۔ دلی میں آپ کا جزار عرب اور احرام تھا شاہ غلام علی صاحب نے کتاب ”سید المرشدین“ کے حاشیہ پر لکھا ہے۔

”حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ضیاء اللہ سے جو حضرت خواجہ محمد زبیر

کے خلفائے ہیں اس خاندان کی نسبت سرگرمی کے ساتھ حاصل کی ہے اور اس وقت

حلقہ اور مراقبہ اور افادہ نسبت میں ممتاز ہیں۔“ ۱۳۰۰ھ

یہ ایک معاصر بزرگ کی رائے ہے اور لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ حقیقتاً آپ کا آستانہ مخزنِ فیض و

برکت بنا ہوا تھا۔ اور دورِ دراز سے لوگ آتے تھے اور فیض پاتے تھے۔ شاہ غلام علی صاحب آپ کے علم و فضل زہد و ورع سے اس قدر متاثر تھے کہ اپنے مریدوں کو بعدِ تعلیم آپ کی خدمت میں تکیل کیلئے بھیجتے تھے شاہ صاحب جب کابل تشریف لے گئے تو زماں شاہ بادشاہ کابل آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوا۔ ۱۳۰۰ھ

۱۳۰۰ھ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۴۔ آثار الصنادید ص ۲۸۔ واقعات ص ۵۰۳-۲۸۔

۱۳۰۱ھ مزارات اولیائے دہلی از محمد عالم شاہ فریدی (مطبوعہ دہلی) ص ۱۴۱۔

۱۳۰۲ھ ”نسبت“ کا لفظ صوفیاء میں ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کی تشریح شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی کی زبانی سنئے۔ صاحبِ نسبت وہ ہے جسے ”جاگتے سوتے کسی حال میں غفلت نہیں ہوتی اور جس کی طرف متوجہ نہ ہوتا ہو اس کی طرف اس کا القا ہو جاتا ہے ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔“ ارشاد رحمانی ”مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ۔

۱۳۰۳ھ بحوالہ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۰۳۔ ۱۳۰۴ھ ایضاً۔ نیز مزارات اولیائے دہلی ص ۱۴۱۔

۱۳۰۵ھ واقعات۔ ج ۲ ص ۵۰۳۔ مزارات ص ۱۴۱۔

عربی ادب میں بہارِ مضافین

(جناب مولوی حافظ سید رشید احمد صاحب ارشد ایم۔ اے)

بہت سے لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ عرب کے صحرائین اور بدو شاعروں کے اشعار میں بھی موسمِ بہار کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عرب کی جغرافیائی حیثیت کی مطابقت میں عرب کی قدیم جاہلیت کی بہاریہ نظمیں ان رنگینوں اور رعنائیوں سے خالی ہیں جو عجمی اور فارسی شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ جس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس زمانہ کے عرب صحرائین اور خانہ بدوش تھے اور شہری زندگی کے تکلفات اور آرائشوں سے آلودہ نہیں ہوئے تھے عرب کے لقمہ و دق بیابانوں اور ریگستانوں کی تند و گرم اور آتشیں بگولوں میں موسمِ بہار کی دھندلی سی جھلک اگر نظر آتی تھی تو وہ ان قدرتی نخلستانوں میں دکھائی دیتی تھی جو قدرتی آب و ہوا کے پرورش پاتے تھے اور جہاں چند دنوں کے لئے ان بادیہ نشینوں کے خیمے گڑ جاتے تھے۔ یہی ان کے خوشگوار دن تھے جسے بہار سمجھ لیجئے اور ان ہی خوشگوار دنوں کی یاد عرب کے ان فطرتی شاعروں کو ہمیشہ تڑپاتی تھی۔ چنانچہ عرب کی حقیقی شاعری کے بانی اور نامراد شاعر امر القیس کی شاعری انہی خوشگوار ایام اور مٹے ہوئے آثار کا مرثیہ ہے۔

جاہلیت کی شاعری | عرب کا شاعر ہمارے ان اردو شاعروں کی طرح نقال نہ تھا جو اپنے ہندوستانی ماحول کو چھوڑ کر ایرانی شاعری کی تقلید میں گل و بلبل کے فسانے سناتے ہیں اور اس طرح ان کی شاعری حقیقت اور ماحول سے کوسوں دور ہو کر ہمارے جذبات اور زندگی کی

ترجمانی نہیں کرتی ہے۔ برخلاف اس کے عہدِ جاہلیت کے انہی شاعروں کے کلام سے ہم ان کی طرزِ معاشرت، جذبات و خیالات و مشاغل، یہاں تک کہ ان کے عارضی پڑاؤ، درختوں، پھولوں، پھولوں، پرندوں اور جانوروں تک کے نام معلوم کر سکتے ہیں۔ ان کا موسم بہار بہت مختصر اور سادہ ہوتا تھا جس کی تفصیلی کیفیات آپ ان کی زبان سے خود سن سکتے ہیں، یہ بہار آفریں ایام ان کے دلوں پر جو نقش چھوڑ گئے ہیں، ان کا کلام ان سے بھر ہوا ہے۔ تپے ہوئے رنگستانوں میں کسی وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انھیں بغداد، بصرہ، شیراز و کشمیر کے چنتانوں سے زیادہ لطف دیتے تھے خاردار جھاڑیاں اور درخت ان کے سبزہ نارتھے، گھوڑے اور اونٹنیاں ان کے رفیق اور محبوب تھے جو اس ”بکر خشک“ میں ان کیلئے سفینہ اور جہاز کا کام دیا کرتے تھے۔ محبوب کے فراق اور گزشتہ ایام وصال کی یاد کے نغمے ان کی موسیقی تھی۔

اسلامی دور | اسلامی دور کے عربی شاعروں کے برخلاف جاہلیت کی شاعری میں موسم بہار کے مخصوص پھل اور پھولوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔ گلاب، یاسمین، گل لالہ، گل لاہور، بنفشہ، گل خیری، اور پھلوں میں سے کسی مشہور پھل کی روئیدگی اور خوبصورتی کی تعریف نہیں کی گئی بلکہ چند ایسے غیر مشہور درختوں، پھل اور پھولوں کا تذکرہ آتا ہے جن میں سے کسی ایک کی بھی شہرت آج کل کے مہذب زمانے میں بعض اوقات مضحکہ خیز معلوم ہو گی لیکن ہم ان کی قوتِ مشاہدہ اور صحیح قوتِ تخیل کی داد دینے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان دعووں کی صداقت کے لئے قدیم شعرا کا نمونہ کلام پیش کریں لیکن چونکہ اس سے ہم اپنے اصلی موضوع سے دور چلے جاتے ہیں اس لئے ہم مختصر اشارات کے ساتھ قدیم اور اسلامی دور کے عربی شعرا کے بہار پر اشارہ کا نمونہ پیش کریں گے جو ہمارے خیال میں اس موضوع پر مٹی کو شش ہے۔

بہارِ نجد | قدیم زمانے میں سرزمینِ نجد عرب کا بہارِ آفریں اور حسن خیز خطہ رہا ہے، یہیں قیس عامری کا وجود بیان کیا جاتا ہے جو معنوں، لیلیٰ کے لقب سے آج تک عربی، فارسی اور اردو کی محبوب ترین شخصیت سمجھا جاتا ہے اور اسی نے ان زبانوں میں نجد کے نام کو روشن کر رکھا ہے۔ اسی سرزمین میں سے ایک دفعہ ایک بادیثین شاعر بہار کے ایام میں اپنے دوستوں کے ساتھ سوار ہو کے گذر رہا تھا کہ اس "جنت ارضی" کی عطر بیز ہواؤں نے اس کو سرمست بنا کر بے اختیار یہ اشعار اس کی زبان سے برآمد کر دیئے

تمتع من شمیم عرارِ نجد فما بعد العیشیت من عرار

الایا حبذا نفحاتِ نجد، دریا روضۃ بعد القطار

یعنی مے دوست تو سرزمینِ نجد کی خوشبودار گھاس "عرار" سے جلد لطف اندوز ہو کیونکہ بعد از

شبِ عرار کی یہ خوشبو نہیں رہیگی (کیونکہ ہم وہاں سے کوچ کر جائیں گے) نجد کی ہوا کے خوشگوار جھونکے

کی یہی نشاط انگیز ہوتے ہیں۔ خصوصاً بارش کے بعد گلشنِ نجد کی عطر بیز ہوا نہایت لطف دیتی ہے۔

آگے چل کر یہی شاعر کہتا ہے کہ جس وقت ہمارا قبیلہ نجد میں فروکش ہوتا ہے تو ہمارے خاندان

کی رہائش اس لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اس وقت یہیں زمانے کی بالکل شکایت نہیں ہوتی عیش و سرور

کی گھڑیاں اس قدر جلد گزر جاتی ہیں کہ ہمیں کسی جینے کے نہ نصف کا پتہ چلتا ہے اور نہ آخری دنوں کا

کیفیت ابرو باران | مشہور شاعر امر القیس اپنے مشہور قصیدہ "معلقہ" کے آخری حصہ میں مناظر

بہار کا نقشہ کھینچتے ہوئے ابرو باران کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے۔

» مے دوست! تم بجلی کو دیکھ رہے ہو۔ اس کی چمک ابرا کو وہ آسمان میں ایسی معلوم ہوتی ہے

کہ جیسے دونوں ہاتھوں کی چمک سے حرکت پیدا ہو رہی ہو اسے بجلی کی چمک کہئے یا یوں سمجھئے

کہ وہ راہب کے چراغ ہیں جنہیں تیل ڈال کر اس نے اور روشن کر دیا ہو۔

اس قسم کی تشبیہ علامہ اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے ایمانِ کامل کے بارے میں استعمال

کی ہے جس سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے وہ فرماتے ہیں۔
گماں آباد ہستی میں یقین مردِ مسلمان کا بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہانی
آگے چل کر امر القیس کہتا ہے:-

• آسمان اور بجلی کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابروئیں سمتِ قطن تک چھایا ہوا ہے اور
بائیں طرف ستار اور ہندیل تک اس کی وسعت ہے۔ اتنے میں یہ ابر موضعِ کتیفہ کے
ارد گرد پانی برسانے لگا۔ بارش کے آغاز میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بزرگ آدمی
دھاری دار کبل پیٹے بیٹھا ہو۔ اس کے بعد صحرائے غبیط میں بارش نے اپنا مال و متاع
پھینک دیا (جس سے پھل پھول نکل آئے) اور رنگا رنگ پھل پھول اور برگ و گیہاں سے یہ
وادی ایسی معلوم ہوتی تھی کہ ایک مینی سوداگر بھاری بھاری گٹھریاں لا کر آیا ہے اور اس
نے نہایت خوبصورت پوشاکیں اس وادی میں پھیلا رکھی ہیں۔ وادی کے مکار پرندے اس
صبح ایسے مست اور نہ خود تھے کہ گویا انھیں تیز شرب پلائی گئی ہے۔“

طرفدار لبید | امر القیس کے بعد طرفہ بن العبد عرب کا جو نامرگ شاعر بھی ”چھائی ہوئی گھٹا“ کا بیحد
دلدادہ تھا۔ اس نے نوجوانوں کی تین مسرت انگیز خضائل میں اس کو بھی شمار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔
ولقصیر یوم الدجن والدجن معجب بھکنۃ تحت الطرف المتحد
• یعنی خوشگوار ابرا لودن کو ایک نازک اندام اور خوش اخلاق پری پیکر کی صحبت میں
ایک وسیع خیمہ کے اندر گزار دیا جائے۔“

• ”سبعہ معلقہ“ کے شاعروں میں سے ”لبید بن ربیعہ العامری“ مشہور شاعر تھے جنہیں مسلمان
ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا وہ بھی ”سبعہ معلقہ“ کی مشہور نظم کے آغاز میں دیارِ محبوب کے آثار
اور نشانات کے محو ہونے پر نوحہ کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

”ان مقامات اور آثارِ شکستہ کو موسمِ بہار کی خوشگوار عمدہ اور ملکی بارش نے سیراب کیا تھا جس میں بجلی کی کڑک کی آمیزش تھی۔ ان مقامات پر صبح و شام اور شب متواتر بارشیں برستی رہی تھیں اور بڑے زور کی گرج بھی تھی۔“

اسلامی دور میں جب عربی شاعری نے ترقی کی تو عربی زبان میں اس وقت کے بلند اور نازک تخیلات سے ایک عجیب قسم کی لطافت، لچک اور سلاست پیدا ہو گئی اور چونکہ عربی زبان کو عراق، ایران، ترکستان، شام اور مصر میں بھی فروغ حاصل ہو گیا تھا اور عربی النسل نوجوان ایسے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے جہاں قدرت کی فیاسنی نے بہشت کا نمونہ پیش کر رکھا تھا اس وجہ سے خلافتِ بنی امیہ اور خلافتِ عباسیہ میں عربی زبان کی بزمِ بہار یہ اور عاشقانہ شاعری کو بہت عروج حاصل ہوا اور اس دور کی شاعری میں ایران کی بہارِ آفریں شاعری کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم آ گئیں۔ لہذا ہم تمام تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے عربی زبان کی ان تین نظموں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو دورِ متوسط میں خاص موسمِ بہار پر لکھی گئی ہیں اور جس میں بہار کی سحر کاریوں کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ قوم کی بدذوقی کی وجہ سے ہم محض ان کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جس کے اہل خوبی کا اندازہ پورے طریقے سے نہیں کیا جاسکتا۔

بریع الزماں ہمدانی | عربی ادب کی مشہور کتاب ”مقاماتِ بدیع“ کے مصنف بدیع الزماں ہمدانی نے جو عربی شرو نظم دونوں میں یہ طوطی رکھتا ہے موسمِ بہار کا نقشہ اپنی نظم میں اسی طرح کھینچا ہے۔

”موسمِ بہار پوری رونق کے ساتھ ہم پر نمودار ہو گیا ہے۔ دیکھو زمین اور آسمان کیسے دلکش دکھائی دیتے ہیں۔ موسمِ بہار کی آب و ہوا اور دلکشی سے خاکِ مشکِ عنبر بن گئی ہے۔ پانی صندل اور کافور کی طرح صاف اور خوشبودار ہے۔ اس موسم میں پرندے مطرب و ملہوازی کی مانند گیت گارہے ہیں۔ موسمِ بہار کے چھینٹے جب گلاب کے پھول پر پڑتے ہیں تو وہ اپنی

خوشبو سے ہمارے دماغ کو معطر کرتا ہے۔ موسم نے کیا ہی اچھا ہمارے لئے سامان

تفریح ہیا کر دیا ہے اور بناظر قدرت کے دلدادگان کے لئے یہ عجیب منظر ہے۔

مقرب الوحش | مشہور شاعر ”مقرب الوحش“ اپنی بہارِ نظم کی ابتدا اس طرح کرتا ہے۔

”آسمان میں ابرگریباں ہے اور وہ قطراتِ شبنم کے آنسو سے کام لے رہا ہے باغوں میں

پھول مسکراتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے فرشِ پرزبرجد چمک رہا ہو یہ خداوندِ تعالیٰ

ہی کے کام ہیں جو اپنی صنعتِ کاری میں لاثانی اور بیکتا ہے۔ باغیچوں میں گل لالہ اور گل آس

اپنی بہار دکھلا رہے ہیں اور پرندے خدا کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں، پانی کبھی اچھل رہا ہے اور

کبھی مسلسل بہتا ہے۔ باد نسیم چل رہی ہے جس کی وجہ سے درخت رقص کر رہے ہیں گلاب

اور یاسمین کے پھول ابھی بندھے تھے کہ یکایک غنچے شگفتہ ہو گئے۔ گل نسیمیں تبسم کناں ہے

اور اس نے چمن کو تازہ خوشبو سے ہمکا دیا ہے۔ گل اقباجان اپنی تلوار اور ڈھال کے ساتھ

شمشیر بے نیام کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ تیشہ لبِ زرگس، ہجران نصیب غمگین

عاشق کے مثل ہے جو گم کردہ راہ ہو۔ یہ چمنستان ایک جامع مسجد کی مانند ہے جس

میں پھولوں کے تختے فرش کا کام دے رہے ہیں۔ اور تنہا کی قندیلیں اس میں آویزاں

ہیں۔ پرندے اس چمن میں شاخوں کے منبروں پر خطبہ پڑھ رہے ہیں (چہاڑا ہے یہ)

اور ہزار حمد و ثنا کے گیت گارہے ہیں۔

ابوالحسن زنباع | فقیہ ابوالحسن زنباع موسمِ بہار کی رنگینیوں کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

”موسمِ بہار نے شگفتگی اور تروتازہ گی کا لباس پہن لیا ہے۔ ویرانی کے بعد اب زمین سرسبز

ہو گئی اور خشک سالی کے بعد یہی سرزمینِ نعمت الہی کا مظہر بن گئی ہے اور ایسا معلوم

ہو رہا ہے کہ یہ زمین ٹھہرا پے کے بعد از سر نو جوان ہو گئی ہے اس کی حالت زار پر

ترس کھا کر یادلوں نے اپنی آنکھوں سے گریہ وزاری شروع کر دی تھی (برسنے لگے تھے) مگر مجھے ان پھولوں پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ گریہ برسے کیسے شگفتہ ہو گئے ہیں اور اس کی ترش روئی (گر جبنے اور کڑکنے کی آواز) سے وہ کیوں خوش ہیں۔ دراصل پھولوں کی شگفتگی اس طرح سے ہوئی کہ بادل ان کی بلند زمینوں پر برسے اور تازہ آفتاب نے انھیں پیدا کیا۔

کیا تم پھولوں کو نہیں دیکھتے ہو کہ ہر ایک پھول (کثرت کی وجہ سے) ایک دوسرے پر سوار ہے تا آنکہ وہ ایک دوسرے کی شاخیں معلوم ہوتی ہیں۔ پھندے ان کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے طرح طرح کے نغمے الاپ رہے ہیں۔ جب وہ چھپاتے ہیں تو شاخیں چھو لگتی ہیں گویا کہ وہ ان نغموں سے مسرور ہو کر رقص کر رہی ہیں۔“

بیان نظموں کا نمونہ ہے جو خاص طور پر موسم بہار پر تحریر کی گئی ہیں ورنہ بہار کا تذکرہ ان کی عشقہ شاعری اور فارسی کے قصائد کی طرح عربی قصائد کی ”تشبیب“ میں بھی پایا جاتا ہے اور اس کا اثر ان کے کلام پر اس قدر ہے کہ بہار کے لوازم پھول اور پھولوں کی تعریف اور ان کے بارے میں نادر اور لطیف تشبیہوں سے نازک خیال شعرائے عرب کا کلام بھرا پڑا ہے اور محبوبہ کے سراپا کی تعریف میں اس قسم کی نادر و پاکیزہ تشبیہیں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں کہ بے اختیار ان کی تحیل آرائی کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس قسم کے اشعار کا نمونہ ہم شمالی افریقہ اور جزیرہ سسلی کے مشہور شاعر اور نقاد ابن رشیق کے کلام سے پیش کریں گے۔

ابن رشیق اور بہار | ابن رشیق نے شعر کی ماہیت اور تنقید شعر پر کتاب العمودہ کے نام سے عربی میں ایک زبردست کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ حقیقت شعر سے متعلق اس کے نتائج افکار کو اہل یورپ نے بھی تسلیم کیا ہے اور اس کے خیالات کی داد دی ہے مگر افسوس ہے کہ جزیرہ صقلیہ کے

اس بے مثل شاعر کا کلام مکمل حالت میں موجود نہیں ہے تاہم جو مختصر مجموعہ اس کا دستیاب ہوتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلغ و بہار پھل اور پھولوں کی توصیف میں ابن رشیق نے اپنی لطیف قوتِ تخیل کی مدد سے نہایت نادر اور عمدہ تشبیہیں سپرد قلم کی ہیں جن کی مثالیں مغربی ادب میں بھی بہت کم ملتی ہیں۔ شاعر موصوف انار کے ایک گنجان باغ کی توصیف میں اس طرح رقمطراز ہے۔

”میں نے باغ میں کیا اچھے مناظر دیکھے (باغوں میں درخت اس قدر تھے) کہ درختوں کی شاخوں نے مشرق کے آفتاب کو چھپا رکھا تھا۔ انار کے پھلوں کے جوڑے ایسے نظر آتے تھے کہ گویا کہ وہ مضبوط طلائی قندیلیں ہیں۔“

ایک خوبصورت لڑکے کے ہاتھ میں سیب دیکھ کر شاعر موصوف یوں تخیل آرا ہے:-

”شامی سیب سرگین چشم والے آہو (لڑکے) کے ہاتھ میں ہے اُس کے سیب کی سرخی شرم آور رخسار کی سرخی سے مشابہ ہے۔“

موسم بہار میں بنفشہ کی روئیدگی کو دیکھ کر شاعر پکارا مٹتا ہے۔

”بنفشہ ایسے وقت میں نمودار ہوا ہے کہ جب نہ موسم گرم ہے اور نہ سردی کی شدت ہے جب ہم اس کے قریب آئے تو وہ لا جوردی لباس پہنے ہوئے تھا۔“

گلِ لالہ کو ابن رشیق کی قوتِ تخیل اس طرح پیش کرتی ہے۔

”میں نے گلِ لالہ کی سرخی کو ملاحظہ کیا جس کے ارد گرد سیاہی کی آمیزش تھی یہ سرخ پھول اس سیاہی کی آمیزش کے ساتھ ایسا نظر آتا ہے جیسے کہ بچے کے ہونٹوں پر روشنائی لگ گئی ہو۔“

ابو کے ہونٹے اور میں بجلی کے چمکنے کی شاعرانہ توجیہ صرف ایک شعر میں اس طرح بیان کی ہے۔

خلیلیّٰ ہلّ للہزن مقلّۃ عاشق ام النار فی احشاء ہارہی لا تدری

یعنی اے میرے دوستو! کیا بادل عاشق کی آنکھ ہے؟ (جو ہر وقت ابر کی طرح آنسو بہاتی ہے اور غم آلود ہے) یا اس کے اندر آگ ہے جس کی اُسے خبر نہیں (مگر وہ بجلی کی شکل میں اس کے اندر موجود ہے)۔

شاعر موصوف تارنگی کے درختوں کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

”تارنگی کے درختوں کا رویان انگیز منظر دیکھ کر ہم مہوت رہ گئے جبکہ ان کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور شاخوں پر تارنگیاں لگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ زبرد کے آسمان پر عقیم کے تارے درخشندہ ہیں۔“

ابن المعتز کا انداز بیان | تارنگیوں کے رنگوں کی تشبیہ و توجیہ کے سلسلے میں مشہور عباسی شہزادہ عبداللہ بن المعتز نے (جس کے شاعرانہ کارناموں کا تذکرہ ہم کسی گذشتہ اشاعت میں کر چکے ہیں) اس سے بہتر تخیل آرائی کی ہے۔ ابن المعتز کہتا ہے۔

کأنما التارنج لمّا بدت صفر تہ فی حمرة کاللمہیب
وَجَنَّةٌ معشوق رای عاشقاً فاصفر ثم احمر خوف الرقیب
یعنی ”تارنگی ایسے موقع پر جبکہ اس کی سرخی میں زردی شعل کی طرح نمودار ہو جاتی ہے اس محبوب کے رخسار کی مانند ہے جو عاشق کو دیکھ کر رقیب کے ڈر سے زرد ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہی رخسار سرخی مائل ہو جاتا ہے۔“

ایک ہی چیز میں زردی اور سرخی کی شاعرانہ توجیہ کو اس نوجوان شاعر نے نہایت بے مثل انداز میں بیان کیا ہے۔ تارنگی کے بارے میں اسی شاعر عباسی کی دوسری نادر تشبیہ ملاحظہ ہو۔

وكانما التارنج فی اعصا نہ من خالص الذهب الذی لم یخلط
کرہٗ رماھا الصوکیان الی الہوا فتعلقت فی جوه لم تسقط

یعنی شاعروں پر نازنگیاں خالص سونے کی گیندیں معلوم ہوتی ہیں جنہیں گیند کے بدلے تلوار
 ہو اس بھینک یا ہو اور وہ ہیں خلا میں ٹلک کر رہ گئی ہوں اور وہاں سے نہیں گرتیں۔“
 کیا مغربی شاعروں کا آرٹ اس سے بہتر تخیل پیش کر سکتا ہے؟
 ابن رشیق کی زبان سے خیام کا فلسفہ مسرت بھی سن لیجئے جو موسم بہار میں ہر نوجوان کے
 دل میں موجزن ہوتا ہے۔

”لے دوست صبح سویرے ہی خوشیوں سے لطف اندوز ہو جاؤ اور مسرت انگیز گھوڑے پر سوار
 ہو کر جلد پہنچو اس سے پیشتر کہ چاشت کا آفتاب صبح برسنے والے بادلوں کو جذب کر لے“
 آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابن رشیق کے رفیق باصفا ابن شرف قیروانی کے دو شعر
 پیش کر دیں جو اس نے ہانسری کی تعریف میں لکھے ہیں۔ ابن شرف کہتا ہے۔
 ”خدا اس زمین کو سیراب کرے جہاں تیرے چوب کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے شاخیں اور
 درخت بھی پاکیزہ ہو گئے ہیں، جب اس ہانسری کی چوب سرسبز تھی تو اس وقت اس پر ٹھیکر
 طیور خوش نوا گیت گاتے تھے مگر جب یہ چوب خشک بن گئی تو اس پر حیوان نازک اندام
 ترنم ریز ہیں۔“

عربی نثر میں بہار یہ مضامین | عربی شعرا اور ادیب مغربی اور فارسی شعرا سے کم مناظر قدرت کے دلدادہ
 نہ تھے وہ موسم بہار میں محو گلگشت چمن رہتے تھے اور کھلی فضا میں ان قدرتی نظاروں سے
 لطف اندوز ہوتا ان کا خاص شیوہ تھا ایسے موقع پر ان کے شاعرانہ تخیل کو جو چیز اپنی طرف مائل
 کر لیتی تھی اس پر بے ساختہ ان کی زبان سے اشعار موزوں ہو جاتے تھے اور مختلف شعرا وادبا موازنہ
 اور محاکمہ کے طور پر ایسے موضوع پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس قسم کا ایک واقعہ شاعر مذکور ابن رشیق
 کے بارے میں کتب ادب میں مذکور ہے کہ شاعر موصوف اپنے ہم عصر شاعروں کے ساتھ شہر سے باہر

کھلی فضا میں محو گلگشت چمن رہا اور ابر آلودوں میں گل لالہ کے بلوغ میں نازک اور لطیف اشعار سے مختلف شعرا طبع آزمائی کرتے رہے۔ ہم اس بزم سخن کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ اور موسم بہار میں شاعروں کی سیر و تفریح کا حال مشہور عربی نثر نگار ابوالقاسم الکھریری نے اپنی مشہور کتاب "مقامات حریری" کے چوبیسویں مقالہ "قطیعیہ" میں نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے صاحب موصوف فرضی راوی حارث بن ہمام کی زبانی رقمطراز ہیں۔

"موسم بہار میں مجھے بغداد کے مشہور و معروف محلہ "قطیعیہ الزبیح" میں چند ایسے نوجوانوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جن کے چہرے موسم بہار سے زیادہ شاداب اور خنداں تھے ان کے اخلاق گلہائے بہار سے زیادہ شگفتہ تھے اور ان کی گفتگو بہار کی نسیم سحری سے زیادہ شیریں تھی چنانچہ میں نے ان کے فیض صحبت سے وہ لطف اٹھایا جس نے رنگین لہو حسن افروز بہار کو بھی مات کر دیا اور چنگ وریاب کے نغموں سے زیادہ ہمیں محفوظ کیا۔ ہم نے بیانِ رفاقت کو اس قدر مستحکم کر رکھا تھا کہ ہر ایک کو اس بات سے منع کر رکھا تھا کہ وہ تنہا کسی چیز سے لطف اندوز ہو خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ ایک دن جبکہ گھٹا چھاری تھی اور دن نہایت ہی خوشگوار تھا (فضا ایسی ہست کر دینے والی تھی) کہ بہار کی گھٹائیں شراب صبحی پی لینے پر مجبور کرتی تھی، ہم نے کسی سبزہ زار کی طرف گلگشت کرنے کا ارادہ کیا تا کہ ہم پُر فضا چمنوں کو "جنت نگاہ" بنائیں اور اپنے دل و دماغ کو ابر و باراں کے نظاروں سے تروتازہ کریں۔ لہذا ہم سب احباب نے جو سال کے بارہ ماہ کی تعداد پر مشتمل تھے اور شاہ حیرہ جلدیہ اٹا برش کے ہمنشینوں کی طرح مودت و اخلاص میں کامل۔۔۔ ایک ایسے چستان کی طرف رخ کیا جو اپنی خوبی میں لاجواب تھا اور گلہائے رنگ رنگ سے مزین تھا (اس سیر میں) شراب و رغوانی

بھی ہمارے ساتھ تھی۔ حسین ساقی اور ایسے مطرب و نواز بھی ہمراہ تھے جن کے نغمے
”فردوسِ گوش“ کا حکم رکھتے تھے۔“

عربی نثر کا یہ نمونہ ”مشتے نمونہ از خوارے“ کے طور پر پیش کیا گیا ہے ورنہ اگر ان بہارِ
مناظروں اور مضامین کا ترجمہ کیا جائے جو عربی ادب کی کتابوں میں موجود ہیں اور جن پر عربی ادیبوں
نے اپنی تمام فصاحت و بلاغت صرف کی ہے تو اس کے لئے یقیناً ایک طویل دفتر درکار ہوگا لہذا
وقت کی کمی اور طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

یہ ملحوظ خاطر ہے کہ ہم نے دیدہ و دانستہ قدیم عربی ادب سے مثالیں پیش کی ہیں کیونکہ
جدید عربی ادب تو مغربی ادب کی پیروی میں ہر قسم کے بہارِ مضامین اور قدرتی مناظر کشی سے
مالا مال ہے صرف قدیم عربی پر ناواقفیت کی بنا پر مغربی اور مشرقی نقادوں کی طرف سے بار بار
یہ اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ وہ بہارِ مضامین اور مناظر قدرت کی صحیح عکاسی سے خالی ہے اس لئے
ہماری یہ ابتدائی کوشش صرف اس لئے ہے کہ ہم ان اعتراضات کو رفع کریں۔ امید ہے کہ ہماری یہ
خاصہ فرسائی دیگر اہل قلم کو اس طرف متوجہ کرے گی کہ وہ زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اس موضوع
پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

غبارِ خاطر

مولانا آزاد کے علمی اور ادبی خطوط کا دلکش اور عزیز مجموعہ۔ یہ خطوط موصوف نے قلعہ احمد نگر کی قید کے
زمانہ میں اپنے علمی محبوب خاص نواب صہبیار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو
رہائی کے بعد مکتوب الیہ کے حوالے کئے گئے اس مجموعے کے متعلق اتنا کہ دنیا کافی ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام صی

مجمع فضل و کمال کی تالیفات میں اپنے رنگ { مکتبہ بریلان دہلی قریول باغ
کی بے مثال تراوشِ قلم ہے قیمت چار روپے }

ایسا

عرضِ شوق

جناب عامر عثمانی

شریر بادِ سحر چمن میں نہ جانے کیا چال چل رہی ہو
یہی خموشی جو آج آغوشِ یاس و حیاں میں پل رہی ہو
غور رکھتا ہے دور رہے، مگر تمنا چل رہی ہے
رہِ محبت میں ہر قدم پر حیات کروٹ بدل رہی ہے
یہی محبت جو نور بن کر دلوں کے سانچے میں ڈھل رہی ہے
کبھی توجہ کبھی تغافل، کبھی تقاضا کبھی تساہل
بلا سے مٹ جائے نوجوانی ہے گرمیِ عشقِ غیر فانی
جنابِ ناہکی سلطنت میں بجا کہ میخانے ٹوٹ جائیں
معاویہ دیکھ بے ارادہ وہ ان کی پہلی نگاہِ سادہ
تمام تر عمرِ نامرادی کٹی ہے ان خود فریبوں میں
شرابِ سادہ کے پینے والو شرابِ کوثر کا فرق سمجھو
ہجومِ اشکِ رواں سے پہلے جو آگِ روشن تھی صرف دل میں

ٹپک پڑے ہیں گلوں کے آنسو کی کلی آنکھ مل رہی ہے
کسی کی جرأت نوازیوں سے کبھی سراپا غزل رہی ہے
نہ صرف میں مضطرب ہوں تنہا ادھر بھی آپس میں چل رہی ہے
بھڑک رہے ہیں جنوں کے شعلے، خرد کی زنجیر گل رہی ہے
ظہورِ بزمِ حیاں سے پہلے شریکِ حسنِ ازل رہی ہے
ہے سب کا درپردہ ایک حال مگر سیاست بدل رہی ہے
اسی قدر بڑھ رہی ہے تابشِ یہ دو پہرِ جتنی ڈھل رہی ہے
مگر اے کیا کرینگے حضرت جو آنکھوں آنکھوں میں چل رہی ہے
وہی تو اربانِ دآرزو کی حیات کا ماحصل رہی ہے
کہ آج ہے درد کی جوشدّت نہ کل رہی نہ کل رہی ہے
یہ جامِ وساغریں ڈھل رہی ہے وہ آنکھوں کے ابل رہی ہے
یادِ اشکوں نے قہر ڈھایا وہ آگ آنکھوں میں چل رہی ہے

ہزار پروانے جان دیدیں ہزار فانوس ٹوٹ جائیں
مگر ہمیں تو یہ غم ہے عامر کہ شمع خود بھی بجھ چل رہی ہے

تصویر

نظام نو | از جناب محمد منظر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے تقطیع خورد ضخامت ۹۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ روپے۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن۔

لائق مصنف کا ایک مقالہ "نیا نظم عالم" کے نام سے رسالہ مجامعہ میں ستمبر میں شائع ہوا تھا اب اسی کو جدید اضافوں اور نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے پہلے مغربی تمدن کا تجزیہ کر کے اس کے عناصر ترکیبی پر ناقدانہ گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اس تمدن کا خمیر ہی ایسے زہریلے اجزاء و عناصر سے تیار ہوا ہے جو کبھی دنیا میں امن و امان اور عافیت و سکون کو قائم نہیں رہنے دے سکتے۔ اس کے بعد عہدِ حاضر کی مختلف تحریکات قومیت، مذہب، انسانیت، اشتراکیت اور بین الاقوامی وفاق پر ناقدانہ نظر ڈال کر ان کی اصل حقیقت کو عیاں کر کے ثابت کیا ہے کہ اگرچہ ان تحریکات کا مقصد مغربی تمدن کی ہلاکت آفرینیوں کا سد باب تھا لیکن یہ بھی اپنے مقصد میں ناکامیاب رہی ہیں اور انسانی زندگی کے کرب و اضطراب کو دور کرنے کی بجائے خود اس میں اضافہ و ترقی کا باعث بنی ہیں۔ اس بحث سے فارغ ہو کر مصنف نے اصل موضوعِ سخن کو چھیڑا ہے اور اس سلسلہ میں یہ بتانے کے بعد کہ ایک عالمگیر نظام نو کی بنیاد کن چیزوں پر قائم ہوئی اور اس کے خصوصیات و امتیازات کیا ہونے چاہئیں۔ مدلل اور موثر پیرایہ بیان میں یہ بتایا ہے کہ دراصل اسلام ہی ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں کی کامیابی و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے پُر زور اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس نظام کو عالم کا ہمہ گیر نظام بنانے کے لئے ان تھک عملی جدوجہد کریں۔ ورنہ ایک نہایت وسیع معنی میں اس کی

تبلیغ کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے اور اس میں گفتگو بھی صرف اصولی حیثیت سے کی گئی ہے تاہم اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں اس کا مطالعہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے فائدہ کا موجب ہوگا۔

مقاصد قرآن | از مولانا سید صبغة اللہ صاحب بختیاری۔ تقطیع خورد ضخامت ۸۶ صفحات قیمت ۱۲ روپے۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن

مصنف نے چند مضامین اسی عنوان سے ماہنامہ ترجمان القرآن میں جبکہ وہ حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ لکھے تھے۔ اب انہیں مضامین کو کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا ہے اس میں لائق مصنف نے قرآن مجید کی دو آیتوں کو بنیاد بنا کر اس پر گفتگو کی ہے کہ قرآن مجید کا اصل مقصد دوسری الہامی کتابوں اور انبیائے کرام کی تعلیمات کی طرح صرف تین چیزیں ہیں۔ ایمان باللہ۔ ایمان بیوم الآخرت۔ اور اعمال صالحہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر مفصل گفتگو کی ہے جس کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ توحید۔ دوسرے مذاہب میں خدا کا تصور، عبادات و معاملات، یوم آخرت پر ایمان کی حقیقت ان تمام مسائل و امور پر کلام ہو گیا ہے۔ مصنف کا انداز بیان اگرچہ اقناعی ہے استدلالی اور منطقی نہیں تاہم عام مسلمانوں کو اس کے مطالعہ سے فائدہ ہوگا۔

سیرۃ المصطفیٰ | از مولانا سیاب اکبر آبادی تقطیع کلاں ضخامت ۷۰ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد للہ ریٹہ بد مکتبہ قصر الادب آگرہ

مولانا سیاب اکبر آبادی ہمارے ملک کے اُن چند اکابر شعروادب میں سے ہیں جو ادبی جدت طرازیوں کے اس دور میں عہدِ قدیم کے اساتذہ فن کی یادگار سمجھے جاتے ہیں۔ موصوف صرف شاعر و ناظم نہیں بلکہ فن شعروادب کے تمام گوشوں پر مبصرانہ نگاہ رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کے ہاں حسنِ تخیل۔ لطیفی فکر، نکتہ بینی، اور حقیقت شناسی کے ساتھ صحت زبان و بیان اور قواعد و ضوابط

فن کی پابندی کا پورا اہتمام پایا جاتا ہے۔ قدرتِ کلام کا یہ عالم ہے کہ شاعری کی ہر صنف پرکیاں قوت و روانی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ موضوعاتِ فکر میں اس درجہ توسیع ہے کہ مضامینِ حسن و عشق سے لیکر قومی و اخلاقی اور سیاسی و معاشی افکار تک سب ہی موضوعِ فکر بن چکے ہیں۔ اس طرح آپ اسلوبِ بیانِ اصولِ شاعری اور طریقِ فکر کے اعتبار سے بالکل طرزِ قدیم کے حامل ہیں۔ لیکن سادہ و جدید رجحانات و افکار کی ترجمانی میں جدید اسکول کے کسی بڑے سے بڑے شاعر سے بھی پیچھے نہیں۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ موصوف کی شاعری کا مقصد وقتی اور شگامی طور پر محض حظِ نفس اور تفریح طبع کا سامان بہم پہنچانا نہیں بلکہ زندگی کی گوناگوں دشواریوں اور الجھنوں کو حل کرنے کے لئے ایک پیغام دینا ہوتا ہے جس کی بنیاد حکمت و اخلاق پر قائم ہوتی ہے۔ اسی بنا پر آپ نے نہ صرف خود اس کا التزام کیا ہے بلکہ اپنے حلقہٴ اثر میں اس کی کافی تبلیغ بھی کی ہے کہ اردو شاعری کا دامنِ رندانہ مضامین سے یکسر پاک و صاف ہو جائے۔ اس میں آپ نے اس درجہ غلو کیا ہے کہ ”ساقی، ساغر و شراب، اور پیانہ و سبو“ ایسے الفاظ کو ہی مملکتِ شاعری سے خارج قرار دیدیا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ہر چند ہو مثاہدہ حق کی گفتگو

نبی نہیں ہے بادۂ وساغر کے بغیر

لیکن مولانا نے ”بادۂ وساغر“ کے بغیر ”مثاہدہ حق“ پر اس سیرِ صلی سے گفتگو کی کہ جو کام

ناخلے سخنِ غالب سے بھی نہ بن پڑا تھا وہ آپ نے کر دکھایا۔ زیرِ تبصرہ کتاب آپ کا دوسرا دیوان ہے

جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک یعنی چھ سال کی غزلوں پر مشتمل ہے اور صاحبِ دیوان کی تمام خصوصیات

شاعری کا بدرجہ اتم حامل ہے۔ امید ہے اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے اور اس کے مطالعہ سے

دل و دماغ کی ضیافت کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

خلافت راشدہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جدید ایڈیشن

قیمت پچیس روپے مضبوط اور عمدہ جلد للہ

سلسلہ مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول

لغت قرآن پر بے مثل کتاب ہے جلد للہ

سرمایہ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا شخص شدہ

ورفتہ ترجمہ، جدید ایڈیشن۔ قیمت پچیس روپے

اسلام کا نظام حکومت، اسلام کے ضابطہ حکومت

کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث ہے جلد للہ

خلافت بنی امیہ، تاریخ ملت کا تیسرا حصہ ہے

جلد ۱۲ مضبوط اور عمدہ جلد للہ

سلسلہ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت

جلد اول، اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب للہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت

جلد ثانی للہ

قصص القرآن حصہ سوم، انبیاء علیہم السلام

کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی۔ للہ

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی ہے جلد للہ

سلسلہ ۶۴، قرآن اور تصوف، حقیقی اسلامی تصوف

پر جدید اور محققانہ کتاب عام مجلد ہے

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا بیان ہے جلد ۸

انقلاب روس۔ ہے

سلسلہ ۶۶، ترجمان السنہ، ارشادات نبوی کا جامع

اور مستند ذخیرہ جلد اول ملے جلد ۱۱

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم

للہ

مسلمانوں کا نظم مملکت للہ

تحفۃ النظر، یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ

قسم اعلیٰ کے رسم دوم دورو پے آٹھ آنے۔

مارشل ٹیوٹ، یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر

نتیجہ خیر اور دلچسپ کتاب۔ دورو پے۔

مفصل فہرست کتب دفتر سے طلب فرمائیے

اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل

بھی معلوم ہوگی۔

نیچر ندوۃ المصنفین دہلی قریول بلغ

مختصر قواعد ندوة المصنفین دہلی

(۱) محسن خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں کو مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ ”برہان“ کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوة المصنفین کے طبقہ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جن کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) اجا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوة المصنفین کے اجا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

- (۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔
- (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ زبان ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔
- (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ پہنچے، وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجا جائے گا اس کے بعد شکایت قابل اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کیلئے ۱۔ کٹاکٹ یا جوابی کارڈ بھیجا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے بششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کو بن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے

مولوی محمد ادریس، سکریٹری پبلشر نے حیدر بقی پریس دہلی میں طبع کر اگر دفتر رسالہ برہان دہلی قرون بارغ سے شائع کیا۔

برہان

شمارہ (۱)

جلد نوزدہم

جولائی ۱۹۲۷ء مطابق شعبان ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

- | | | |
|----|--|--|
| ۲ | سید احمد | ۱۔ نظرات |
| ۵ | پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے | ۲۔ ۱۹۵۷ء سے پہلے کی دلی |
| ۲۷ | جانبے اکثر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ڈی لٹ (پیرس) | ۳۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے لکے ہوئے قرآن کریم |
| ۴۳ | جناب مظفر شاہ خاں صاحب ایم۔ اے | ۴۔ انٹرنیشنل سیاسی کشمکش |
| ۵۵ | محمود حمیدہ سلطان صاحب | ۵۔ اقبال اور فطائیت |
| ۶۳ | ۲۰ ج | ۶۔ تبصرے |

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَظَرَات

آخر وائسرائے کے اعلان مورخہ ۳ جون کے مطابق ہندوستان تقسیم در تقسیم ہو کر دو مختلف مستعمراتی حکومتوں کی شکل میں بٹ گیا۔ یہ ہندوستان کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً برا ہوا یا اچھا اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ البتہ جہاں تک ان اسباب کا تعلق ہے جن کے باعث یہ صورت حال پیش آئی ہے، اُن کے پیش نظر یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر دونوں حکومتوں کو خوشحالی اور امن و عافیت کے ساتھ ترقی کرنا ہے تو انہیں اُن اسباب کا خطر خواہ تدارک کرنا ہو گا اور اس کی کوشش کرنی ہوگی کہ اب دوبارہ ان چیزوں کا اعادہ نہ ہونے پائے جنہوں نے ہمارے ماضی قریب کے زمانہ کو تلخ کامیوں، ناگواریوں اور صبر آزما مصائب و آلام کا افسوسناک مرقع بنا کر رکھ دیا ہے۔

اگر زندگی کی بنیاد فضائل اخلاق، شرافت نفس، باہمی رواداری اور عدل و انصاف پر قائم ہو اور خود غرضی، اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا جذبہ اور ظلم و عدوان سے دامن پاک ہو تو دو شخص مل جل کر رہیں یا الگ الگ، بہر حال کسی صورت میں بھی امن کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ہندو اور مسلمانوں میں چولی دامن کا جو رشتہ قدرتی طور پر صدیوں کی سعی و فوگری کے بعد پیدا ہو چکا ہے وہ ہندوستان میں دو یونین بن جانے کے بعد بھی نہیں مٹا اور نہ مٹ سکتا ہے۔ مختلف صوبوں میں ان دونوں قوموں کی جو پوزیشن پہلے تھی اب بھی ہے۔ ایک یونین میں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں اور دوسری یونین میں مسلمانوں کو غالب اکثریت

حاصل ہے اور ہندو اقلیت میں ہیں۔ جس طرح ایک یونین میں اقلیت اکثریت کے ساتھ شریک حکومت ہوگی دوسری یونین میں بھی یہی ہوگا۔

موجودہ زمانہ میں کسی ایک قوم کے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ کسی اقلیت پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرے اور اس کے جائز شہری حقوق کا کوئی خیال نہ رکھے یہ سب باتیں دورِ جاگیرداری (*Age of feudalism*) کی یادگار ہیں جو فنا ہوتی جا رہی ہے اور دنیا کے نظامِ نو میں اب اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جرمنی، آئی، جاپان اور سب سے آخر میں برطانوی شہنشاہیت۔ ان سب کا عبرت انگیز انجام سب کے سامنے ہے۔ ان سے سبق لینا چاہئے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد تمام معاملات سلجھ جائیں گے اور ملک پر بد قسمتی و تیرہ نصیبی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں وہ چھٹ جائیں گے تو سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اہل یہ ہے کہ جب تک زندگی کے متعلق صحیح نقطہ نظر پایا نہیں ہوتا جس کا دوزلہ جگہ فقدان ہے ہماری مشکلات رفع نہیں ہو سکتیں۔ اس وقت جو کچھ ہوا ہے اسے انقلاب کا صر

ایک رخ سمجھنا چاہئے۔ عوام روز بروز بیدار ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں اپنی مشکلات اور اپنے حقوق کا احساس روز افزوں ترقی پر ہے۔ دوسری جانب اقتدار و اختیار جن ہاتھوں میں آہستہ آہستہ منتقل ہو رہا ہے ان کا حال یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ان کے دل و دماغ کو جکڑ رکھا، اور

قومی عصیت نے ان کو حقائق کی طرف سے اندھا بنا دیا ہے۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ ایک شدید تضاد کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس وقت تک کی کشمکش و نزاع کا سبب مذہب کا

اختلاف اور قومیت کا فرق و امتیاز تھا۔ لیکن موجودہ صورتِ حال کی تہ میں شدید ترین انقلاب کی جو موجیں کروٹیں بدل رہی ہیں وہ اس بات کا کھلا اعلان ہیں کہ ملک میں دو مستعمراتی حکومتوں کے قائم ہونے کے فوراً بعد اقتصادی اور معاشی بنیاد پر نئی نئی پارٹیاں ابھرے گی اور ان کے

اثر و نفوذ کے باعث ہندوستان اور پاکستان ایک شدید ترین طبقاتی جنگ میں مبتلا ہو جائیں گے اس بنا پر شیوہ دانشمندی یہ ہے کہ دونوں حکومتیں مستقبل قریب میں پیش آنے والے واقعات کا ابھی سے جائزہ لیکر ان کی روک تھام کی کوشش کریں اور اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اکثریت اور اقلیت کے تعلقات میں حقیقی طور پر خوشگواہی پیدا کی جائے۔ اور مذہب کے نام پر ہرگز کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس سے اشتعال پیدا ہو اور نوبت خون خرابہ تک نہ پہنچے۔ پھر ملک کو اقتصاداً طور پر خوشحال بنانے کی ہر ممکن سعی کرنی چاہئے اور سیاسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ملک کے سرمایہ کو کسی خاص ایک طبقہ کے اندر محدود کرنے کے بجائے اس کو تمام افراد پر تقسیم کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ پلان کو دونوں پارٹیوں کا قبول کر لینا دونوں کی کھلی شکست اور صرف انگریزی سیاست کی جیت ہے۔ اس واضح اور الم نشرح حقیقت کے باوجود لیگ کا اس پر خوشی کے شادیانے بجانا اور دوسری جانب سردان میل اور نیڈرٹ بنتھ ایسے ذمہ دار ہندوؤں کا اس اسکیم کی مدح میں رطب اللسان ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ارباب سیاست حقائق پذیری سے کتنے دودھیں۔

جہاں جذبہ یہ ہو کہ میں نے کیا پایا اور دوسرے کو کیا ملا۔ اور جہاں آپس کے معاملات کو طے کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کو پہنچ بنا کر اس کے فیصلہ کو بخوشی قبول کر لیا جاتا ہو دونوں کا جانا پچھانا دشمن ہو اور جس کی شاطرانہ چالیں کسی دلیل و گواہ کی محتاج نہ ہوں اور جو ہاتھ پاؤں کٹ جانے کے بعد بھی اپنے سر کو صاف بچا لیجانے کے فن میں طاق ہو وہاں عوام کی فلاح و بہبود کی توقع کیوں کر اور کس حد تک ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب صرف مستقبل دیکھا۔

فانتظر وانی معکم من المنتظرین۔

۱۸۵۶ء سے پہلے کی دہلی علماء و مشائخ کا اجتماع

(۲)

لہجہ بابر فیہر خلیق احمد صاحب نظامی - ایم - اے

میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب | میاں نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب مولانا قطب شاہ
کے بیٹے اور شاہ فخر الدین صاحب کے پوتے تھے۔ دہلی میں عوام و خواص سب اُن کا ادب و
احترام کرتے تھے۔ امیر و غریب سب کو اُن سے عقیدت و ارادت تھی۔ سر سید نے لکھا ہے۔

اس زمانہ میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے۔ حضور والا اور تمام سلاطین و جمیع امار

عظام آپ کے نہایت متقدّم ہیں۔

ان کا اخلاق نہایت اعلیٰ اور وسیع تھا۔ اس لئے وہ بے حد مقبول بھی تھے۔ دہلی کے چھوٹے بڑے
سب اُن سے ملتے تھے اور ان کے خلوص و محبت کے گردیدہ تھے غالب کو ان سے خاص
لگاؤ اور انس تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں۔ بی ماروں کے محلہ میں ایک حویلی
کرایہ کو لیکر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرایہ کے واسطے تھا مگر

لہ شجرۃ الانوار (قلی نسخہ) آخری نسخہ

کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ ۱۷

بہادر شاہ ظفر کو کالے صاحب سے خاص عقیدت تھی۔ اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ شاہ صاحب خود بھی بادشاہ کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔ بیبی کے احسن الاخبار اور دلی کے سراج الاخبار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپس میں کس قدر گہرے تعلقات تھے۔ یکم فروری ۱۸۳۵ء کی خبر ہے۔

۱۷ اہل مدینہ حضرت ہوسے توفیقہ الامین قدوة السالکین حضرت شاہ غلام نصیر الدین، (عرف یاں کالے صاحب) ملاقات کے لئے تشریف لے آئے معرفت و عقاب کے دفتر کھلے۔
حب شاہی خاندان میں کسی کو تعویذ وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو کالے صاحب سے رجوع کیا جاتا۔ ۲۱ جولائی ۱۸۳۶ء کی اطلاع ہے۔

۱۸ "نواب تاج محل بیگم صاحبہ کو آثارِ محل ظاہر ہوئے اس لئے میاں کالے صاحب پر زیادہ حفاظتِ محل کا تعویذ دینے کی غرض سے قلعہ محل میں تشریف لے گئے۔" ۱۹
بہادر شاہ پر کالے صاحب کا اتنا اثر تھا کہ اُن کی سفارش سے جو فقیر بارگاہِ سلطانی میں باریاب ہوتے تھے اُن پر خاص خسر و انہ التفات و اکرام کا اظہار ہوتا تھا، ۲۰ جولائی ۱۸۳۶ء کی خبر منظر ہے۔

۲۱ "جو درویش حضرت میاں کالے صاحب کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہنچا۔۔۔"

۱۷ اردوئے معلیٰ - حصہ دوم ص ۱۷
۱۸ ان دونوں اخبارات کے ترجمے خواجہ حسن نظامی صاحب نے "بہادر شاہ کا روزنامہ" کے عنوان سے شائع کئے ہیں۔ یہ روزنامہ بہت اہم تاریخی معلومات سے بھرا ہوا ہے جس سے اس زمانہ کے سیاسی اور سماجی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

۱۹ "بہادر شاہ کا روزنامہ" - ترجمہ خواجہ حسن نظامی (مطبوعہ دہلی) ص ۵۔ ۲۰ ایضاً ص ۶،

حضرت بادشاہ سلامت نے اُسے دو لٹریاں عنایت کی اور نہایت عزت و احترام

سے رخصت کیا۔ ۱۷

شاہی خاندان کی بیگمات اور دیگر افراد بھی شاہ صاحب کی سفارش کے ذریعہ اپنے وظیفہ میں اضافہ کرواتے تھے۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۴۶ء کی خبر ہے۔

• حضرت شاہ نصیر الدین عرف کالے میاں صاحب کے صحیفہ کے جواب میں

بادشاہ سلامت غلام اللہ ملک نے تحریر فرمایا کہ عدم گنجائش کی وجہ سے نواب مستغنی بیگم

کا کوئی جدید وظیفہ جاری نہ ہو سکا۔ ۱۸

بہادر شاہ کے روزنامہ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کالے صاحب کا بادشاہ کی جانب سے کچھ وظیفہ مقرر تھا۔ یہ چیز خواجگانِ چشت کے ملک کے منافی تھی۔ اس سلسلہ کے بزرگوں نے انتہائی عسرت اور تنگی کے باوجود بھی کسی بادشاہ یا امیر سے کوئی وظیفہ یا جاگیر قبول نہیں فرمائی۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۴۶ء کی خبر ہے۔

• موضع شمع پور باولی کی آمدنی میں سے مبلغ پانچ سو روپیہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین

صاحب عرف کالے صاحب کو مرحمت فرمائے اور ارشاد کیا کہ اس آمدنی میں سے ہمیشہ

پانچ سو روپیہ انشاء اللہ قبل از طلب حاضر خدمت ہو جایا کریں گے۔ عرض کیا گیا کہ

حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ایک ہزار پانچ سو روپیہ من جملہ چار ہزار روپیہ سالانہ

کے بھیجے گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ روپیہ واپس کر کے فرمایا کہ تمام روپیہ

یکشت آنا چاہئے۔ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہ آنا چاہئے۔ ۱۹

پھر ایک دوسری اطلاع ہے۔

۱۷ بہادر شاہ کا روزنامہ۔ ص ۷۹۔ ۱۸ ایضاً ص ۸۶۔ ۱۹ ایضاً ص ۹۲۔

• حکیم احسن خاں بہادر سے ارشاد ہوا کہ سیرزادہ حضرت شاہ غلام نعیم الدین صاحب عرف کالے صاحب کو ذاب زینت محل سلیم صاحب کی معرفت چار ہزار روپیہ بھیج دیا جائے۔ ۱۹۴۷ء
بادشاہ، تقاریب وغیرہ کے موقعوں پر کالے صاحب کو خرچ دیتے تھے۔ ۲۲ اپریل ۱۹۴۷ء
کی اطلاع ہے۔

• کارہیڈازاں خلافت کو حکم دیا گیا کہ حضرت میاں کالے صاحب نمبرہ حضرت مولانا محمد الدین کی صاحبزادی کی شادی ہے۔ دس ہزار روپے ان کے خرچ کے لئے عطا کئے جائیں۔ ۱۹۴۷ء
دو مہینے ابھی نہیں گزرنے پائے کہ پھر ایک شادی میں روپے بھیجے جاتے ہیں۔ ۲۲ جون ۱۹۴۷ء کی اطلاع ہے
"محبوب علی خاں خواجہ سراسے فرمایا کہ میں فی الحال میاں کالے صاحب کے صاحبزادے کی شادی کے لئے چار ہزار روپے کی... ضرورت ہے" ۱۹۴۷ء
حضرت کالے صاحب کا بادشاہ سے یہ میل جول، چشتیہ سلسلہ کی روایات کے بالکل برعکس تھا۔ بزرگانِ چشت نے کبھی اس قسم کے تعلقات اور جاگیر داری کو روا نہیں رکھا۔ ان کا یقین تھا کہ اس طرح سے نہ صرف تعلق اور دربار داری کی عادتیں پرورش پاتی ہیں بلکہ روحانی ترقی میں سخت رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے۔
• در بعض ملفوظات خواجگانِ چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوانِ بلو شاہ
نوشته شد نام او از دیوان حق سبحانہ برمی آرنند" ۱۹۴۷ء

۱۷ روزنامہ ص ۱۰۷ ۱۹۴۷ ایضاً ص ۱۳۲ ۱۹۴۷ ایضاً ص ۱۵۲۔

۱۹۴۷ انفاس العارفین۔ شاہ ولی اللہؒ۔ (مطبوعہ دلی) ص ۶۹۔

خواجہ نصیر | خواجہ نصیر (۱۲۶۱-۱۱۸۹) خواجہ میر درد کے نوٹے تھے۔ خواجہ درد (۱۱۹۰-۱۱۳۱) بڑے زہدست صوفی اور شاعر تھے۔ انھوں نے "اسرار الصلوٰۃ" و "اردات درد" "علم الکتاب" وغیرہ کتابیں لکھی تھیں۔ خواجہ نصیر کے متعلق سرسید نے لکھا ہے کہ بچپن ہی میں خواجہ درد سے بیعت کی تھی۔ اور جب سن دس سال کا ہوا تو خواجہ درد نے وفات پائی۔ سنین کے اعتبار سے یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ خواجہ نصیر کا سن پیدائش ۱۱۸۹ء ہے اور خواجہ درد نے ۹۰۰ھ میں وفات پائی۔

خواجہ نصیر ریاضیات اور موسیقی کے ماہر تھے حساب میں ایک رالہ بھی لکھا تھا۔

خواجہ نصیر نے باطنی کمالات خواجہ درد کے چھوٹے بھائی میر اثر سے حاصل کئے تھے

میر اثر بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ تذکرہ میر حسن میں ان کے متعلق لکھا ہے۔

"درویشے است موقر صاحب سخن است موثر عالم و فاضل مرتبہ قدرش بغایت بلند گو ہر صدرش نہایت ارجمند در خدمت برادر بزرگوار خود گوشہ نشینی اختیار کردہ

و قدم بر جادۂ بزرگان خود نہادہ بسری برد"

ایسے بزرگ کے فیض صحبت سے خواجہ نصیر نے فائدہ اٹھایا تھا، ان کے وصال کے بعد وہ خود ہی ان کے سجادہ پر متمکن ہوئے۔

خواجہ درد کا سلسلہ بالکل نیا تھا، ان کے والد خواجہ میر محمد ناصر عندلیب (المتوفی ۱۲۰۲ء) خواجہ بہار الدین نقشبند کے سلسلہ سے تھے۔ ابتدائی زمانہ میں مغل فوج میں ملازم تھے۔ یکایک انھوں نے فوج کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اور ایک نیا سلسلہ "طریقہ محمدی" جاری کیا تھا۔ اپنے خیالات کی تشریح میں "نالہ عندلیب" کتاب لکھی اور اس

نے "گل رعنا" میں سید عہد الہی صاحب (ص ۲۷۱) لکھتے ہیں اگر ان کے فضل و کمال کا صحیح اندازہ کرنا چاہو تو علم الکتاب کا مطالعہ کرو" ۳۷۱ تا ۳۷۲ ص ۳۷۱ و ۳۷۲

سلسلہ میں سب سے پہلے اپنے بیٹے میر درد کو داخل کیا۔ ۱۷
 خواجہ نصیر نے سجادہ پر بیٹھ کر اس سلسلہ کو بڑی رونق بخشی۔ ان میں انتہائی استغنا
 اور دنیا سے بے تعلقی کا جذبہ تھا۔ قدرت کی طرف سے نہایت صابر و شاکر طبیعت و دلچست
 کی گئی تھی۔ طبیعت میں سوز و گداز بہت تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے رنج تخلص فرماتے تھے
 سرسید نے ان کے چند اشعار منتخب کئے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں

۱۷ خط دیکھ کر ادھر تو میرا دم اولٹ گیا

قاصد اودھر بدیدہ پر خم اولٹ گیا

۱۸ کھڑکی نکال جانب دشمن نہ بام پر

کوٹھے چڑھی جو بات کھلی خاص و عام پر

مولانا یوسف علی صاحب | مولوی یوسف علی صاحب، خواجہ نصیر کے خلیفہ اور سجادہ نشین تھے

ان کا اخلاق نہایت وسیع تھا۔ ان کی صحبت میں ایسی دل کشی تھی کہ سینکڑوں آدمی ان

کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ان کے زمانہ میں خواجہ درد کے سلسلہ کو بہت فروغ ہوا۔

شاہ غیاث الدین صاحب | شاہ غیاث الدین صاحب چشتیہ سلسلہ کے بزرگ تھے اور خواجہ کہاری،

کہہ کر مشہور تھے۔ خواجہ مردود چشتی سے آپ کا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ آپ اخلاق محمدی کا

جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ دن رات عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کے رشد و ہدایت سے

سینکڑوں نے استفادہ کیا۔ سرسید نے لکھا ہے ”مردیان باخلاص کو آپ کی ذات بابرکات

ارشاد راہ ہدایت اور رہبری سبیل سعادت ایسا ہوا کہ کم کسی سے متصور ہے“ ۱۹

۱۷ ”مجدد الف ثانی“ کا نظریہ توحید از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ۳۳-۳۲۔ (انگریزی)

۱۸ آثار الصنادید ص ۳۸-۳۷ ایضاً ص ۳۸۔

سلسلہ میں وصال فرمایا۔ مزار آپ کا ملتان ڈھانڈہ میں ہے جو بستی قدم شریف اور

پہاڑ گنج کے درمیان واقع ہے۔ ۱۷

شاہ صابر بخش صاحب | شاہ صابر بخش صاحب چشتیہ صابریہ سلسلہ کے بڑے برگزیدہ بزرگ تھے

ان کے والد شاہ نصیر الدین صاحب اپنے والد شاہ غلام سادات صاحب چشتی کی حیات میں وصال فرما گئے تھے اس لئے شاہ غلام سادات کے بعد آپ ہی سجادہ نشین ہوئے۔

شاہ سادات صاحب چشتی (المتوفی ۱۲۱۸ھ) بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے۔ وہ

شاہ محمد نصیر کے خلیفہ تھے جنہوں نے شیخ محمد چشتی سے خلافت حاصل کی تھی۔ مؤخر الذکر شیخ

ابراہیم رامپوری کے عزیز مرید اور خلیفہ تھے۔ اس بنا پر شاہ صابر بخش جس سجادہ پر جلوہ افروز ہوئے

وہ نہایت برگزیدہ بزرگوں کی مندر ہاتھا۔

شاہ صابر صاحب عبادت و طاعت میں بے نظیر تھے۔ سخاوت اور غربا پروری کا جذبہ ان

میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مصنف انوار العاشقین نے لکھا ہے۔

”آپ کے زمان فیض نشان میں آپ کی خانقاہ میں بہت درویش اور طالب علم رہتے

تھے۔ صد ہا آدمیوں کو کھانا ملتا تھا اور بہت بزرگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ ۱۸

سلسلہ ۱۲۳۷ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں آپ نے وصال فرمایا۔ اپنی خانقاہ میں جو روشن الدولہ کی

نہری مسجد قاضی واڑہ (فیض بازار) کے مقابل واقع تھی مدفون ہوئے۔ آپ کے مزار پر ایک کتبہ

باجد شاہ ثانی نے نصب کرایا۔ فیض بازار میں آپ کی خانقاہ مشہور ہے اور یہ مقام صابر بخش

۱۷ مزارات اولیائے دہلی۔ ص ۱۱۷

۱۸ آثار العاشقین، از مولانا شتاق احمد صاحب مرحوم انبھوی ص ۹۳ (مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۳۲ھ)

۱۹ آثار الصنادید۔ ص ۴۵۔ سکہ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۳۳۔

کی باغیچی کہلاتا ہے۔ خانقاہ کے پاس ایک مسافر خانہ نواب میر محبوب علی خاں بہادر شاہ دکن کی جانب سے سنہ ۱۳۲۰ء میں بنوایا گیا تھا۔ ۱۷

میر محمدی صاحب | میر محمدی (المتوفی ۱۳۲۲ء) حضرت شاہ فخر الدین صاحب کے عزیز مرید اور خلیفہ تھے۔ مولوی بشیر الدین نے آپ کا اصلی نام مولانا امام الدین بتایا ہے۔ مصنف مزارات اولیاء دہلی نے آپ کا نام عماد الدین لکھا ہے۔ میر محمدی سے شاہی خاندان کے افراد خصوصیت سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور ہر وقت اُن کا جھگٹا اُن کی خانقاہ میں لگا رہتا تھا۔ ... شجرۃ الانوار میں لکھا ہے۔

میر محمدی صاحب کہ یکے از خلفائے حضرت مولانا اندر در ایشاد و رہنمائی عباد دریں شہر بخوبیہا مصروف اند و باوصاف غنائد موصوف بسیار ازاہل شہر و شہزادہا مرید میر صاحب اند کشف و کرامات آل سید پاک در میان مریدان ایشان ہویدا است۔
بہادر شاہ کے روزنامچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور نہایت دھوم دھام سے بادشاہ کی سواری ان کی خانقاہ میں پہنچتی تھی۔ لکھا ہے۔
”حضور بادشاہ ایک دن میر محمدی صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ توپ خانہ انگریزی و بادشاہی سے حسب معمول سلامی کی توپیں جھوڑی گئیں۔“
بہادر شاہ کی میر صاحب سے یہ عقیدت وصال کے بعد جاری رہی۔ وہ برابر اُن کے عرس میں شرکت کرتا تھا۔ روزنامچہ میں لکھا ہے۔

۱۷ مزارات اولیائے دہلی ص ۱۳۱۔ ۱۸ واقعات دارالحکومت ج ۲ ص ۱۳۳۔

۱۹ واقعات ص ۱۵۲۔ ۲۰ مزارات ص ۱۳۸۔

۲۱ بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۲۰۔

بزرگوار کے دن حضرت میر محمدی صاحب مرحوم کا عرس منعقد ہوتا ہے بادشاہ سلا
عرس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے ختم میں شریک ہوئے اور تبرکات
واپس آئے۔ ۱۵

شہزادے خاص طور سے آپ کے عقیدت مند تھے۔ اکثر آپ کے مرید تھے۔ مرزا سلیم
خلف اکبر شاہ ثانی آپ کا مرید اور معتقد تھا۔ مرزا نجمتہ بخت نے وصال کے بعد میر صاحب کا
جانشین ہونے کا دعویٰ کیا۔ آپ نے ۱۲۲۲ھ کو وصال فرمایا۔ مرزا سلیم شاہزادے نے فرط عقیدت
سے آپ کو اپنے مکان کے صحن میں ہی دفن کیا جو اب میر محمدی کی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔
اور چٹلی قبر کے متصل واقع ہے۔

مولانا محمد حیات [مولانا محمد حیات] پنجاب کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے دہلی چلے آئے تھے اور
شاہ صابر بخش کی خانقاہ میں معقول و منقول کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے علمی تبحر اور زہد و تقویٰ
کا بہت شہرہ تھا۔ دور دور سے طلباء تحصیل علم کے لئے ان کے مدرسہ میں آتے تھے۔ آپ کے طلباء
اکثر نہایت اعلیٰ پائے کے عالم اور بلند مرتبہ فاضل ہوتے تھے۔ بعض تو ان میں چنانہ عصر شمار
ہوئے۔ خصوصاً حافظ عبد الرحمن گونا بیا تھے لیکن بقول سر سیدؒ کوئی علم عقلمیہ اور نقلیہ ایسا
نہیں کہ اس کو محققانہ نہ جانتے ہوں۔ ۱۶ ہیئت اور علم ہند سبے تکلف پڑھاتے تھے۔ جب
مولانا حیات نے ایسے باکمال شاگرد پیدا کر دیے تو خود اصلاح باطن اور ذکر و اشغال کی طرف
متوجہ ہوئے۔ پاک چین میں شاہ محمد سلیمان صاحب کے پاس گئے۔ ان سے بہت سے کمالات باطنی
کا کتاب کیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ جہاں آباد واپس آ گئے۔ اس دوران میں شاہ صابر بخش صاحب

۱۵ روزنامہ مجھ میں ۱۳
۱۶ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۲۔ ۱۷ آثار الصنادید ص ۴۰

۱۸ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۲۔ ۱۹ آثار الصنادید ص ۴۰

وصال فرمائے۔ چنانچہ اب اُن کی خانقاہ میں مقیم ہونے کے بجائے قلعہ کے قریب ایک مسجد میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کی وہاں موجودگی سے مسجد بے حد آباد اور بارونق ہو گئی۔ سرسید نے لکھا ہے ”ایسی آباد ہو گئی کہ اب اس کو باعتبار کثرت عبادات اور وفور طاعات خیر المساجد اور افضل المعابد کہنا چاہئے“۔ ۱۷

حضرت شاہ سید احمد شہید | حضرت شاہ سید احمد صاحب اس زمانہ کے نہایت مشہور اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ اُن کے فیضانِ صحبت اور ارشاد و ہدایت سے ہزاروں نے استفادہ کیا۔ مولوی محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ”شاہ عبدالعزیز صاحب کی توجہ کی تاثیر مثل ہلکے سے سینہ کے ہوتی ہے جس کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ہوتی ہیں اور سید صاحب کی تاثیر مثل لوہاروں کی پھکنی کے اثر کرتی ہے جو فوارہ کی طرح قلب پر پڑتی ہے۔“ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تلقین و ارشاد نے مجاہدوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کے دل اجیار ملت کے لئے بے چین اور بے قرار رہتے تھے۔ سید صاحب کے متعلق اس زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس لئے ان کے متعلق خود کچھ لکھنے کی بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک معاصر کی رائے نقل کر دی جائے۔۔۔

سرسید احمد خاں جنہوں نے سید صاحب کو خود دیکھا تھا، اور جنہوں نے اپنی کتاب آثار الصنادید اُن کی شہادت کے ۱۵ سال بعد لکھی تھی۔ آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔

”جناب ہدایت انتاب زیدہ واصلان درگاہ سید احمد صاحب طاب ثراہ و جعل البختہ مثلاً ساداتِ عظام اور مشائخِ کرام سے تھے۔ وطن آپ کا اہلی بریلی اوایل حال میں شوق طالب علمی میں وطن سے وارد شاہ جہاں آباد ہو کر حضرت بابرکت مولانا عبد القادر علیہ الرحمہ کی خدمت سرا سرافادت میں حاضر ہو کر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے اور صرف دہچو

میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ از بسکہ خدقِ درویشی اور مسکینی طینت میں پڑی ہوئی تھی۔ اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے واردوں خصوصاً درویشانِ پاک طینت کی جو دور دراز سے تحصیلِ علمِ باطنی کے شوق میں جناب مولانا عبدالقادر صاحب مغفور موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے خاطر داری اور سرانجامِ بہام میں ایسے بدل سرگرم ہوتے گویا اس امر کو اہم بہام سمجھتے ہوئے تھے اور اس زمانہ میں بھی اپنے اوقات کو طاعات و عبادات میں ایسا مصروف کیا تھا کہ جو لوگ صرف اسی امر کے واسطے کنج نشین اور گوشہ گزیں تھے اُن سے بھی اس طرح خاطر مجموع اور حضورِ قلب سے ظہور میں نہ آتے تھے اکثر مولانا نے مغفور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یادہ اش ساداتِ منش کا ترقی مدارجِ علیا کا قابلِ نظر آتا ہے۔ اُسی اثنا میں سرگروہ علمائے انام بلغائے عظام جامع کمالاتِ صوری و معنوی خادمِ حدیث شریف نبوی مولانا و بالفضل اولانا مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی علیہ الرحمۃ بیعت کا ارادہ کیا۔ جب ان کی خدمت میں گئے مولانا نے ممدوح نے جوان کے حالات سے واقف تھے فرمایا کہ اگرچہ حق جل و علی نے اس صاف باطن کو اختیار طریقیہ رشد و ہدایت کے باب میں واسطے کا محتاج نہیں رکھا اور سبلہ کا نیاز مند نہیں کیا لیکن اہل ظاہر کے نزدیک ہر چیز کے لئے ایک سببِ ضروری ہے۔ رفعِ حجت عوام کے واسطے کچھ مضائقہ نہیں۔ پھر آپ نے مولانا نے موصوف سے بیعت کی۔ بعد چند مدت کے سفر اختیار کیا۔ اور اطراف و جوانب میں خدا شناساں پاک باطن سے فیض حاصل کرنے میں سرگرم رہے از بس کہ مقاماتِ عالی و ذریعہ روز کھلتے جاتے تھے اور مراتبِ علیا آنا فانا ترقی میں تھے۔ اس دولتِ بے زوال سے اہل ظاہر کو آگاہی ہو چلی اور

ہر طرف سے لوگوں نے ہجوم کیا اور کسی نے بیعت اور کسی نے روئے حاجت سے سوال کرنا شروع کیا۔ چونکہ اخفائے حال اور ستر احوال منظور تھا خیال میں یہ آیا کہ اگر اہل دنیا کے لباس سے بلبس ہو کر علم باطنی کی تحصیل کی جاوے تو یہ ہجوم عوام کا جمعیت اوقات میں غل انداز نہ ہوگا۔ اس خیال سے ٹونک کی طرف تشریف لے گئے۔ اور نواب امیر خاں کی رفاقت میں بسر کی اور ارازم کہ شجاعت اور جوانمردی سادات صحیح النسب کا جوہر ہے اُس اشار میں ترددات عظیمہ آپ سے ظہور میں آئے اور با این ہمہ تلاش اہل باطن تھی۔ اور اکثروں کی ہدایت کی راہ بھی آپ سے حاصل ہوئی جب اس عرصہ میں جمع مراتب کی تکمیل ہو گئی آپ ترک دنیا کر کے پھر شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے اور مسجد اکبر آبادی میں وارد ہوئے۔ اس اثنا میں مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور مولوی محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ مقام علوم رسمی کے درس و تدریس میں مصروف تھے اور اہل باطن کی طرف چنداں ملتفت نہ ہوتے تھے جب اس دفعہ آپ کے تشریف لانے سے مردم شہر میں ایک غلغلہ پڑ گیا تھا اور طالب فیض باطن کے کثرت سے ہجوم کرنے لگے۔ ایک بار مولوی صاحب نے باتفاق مولوی عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے آپ کی خدمت میں جا کر عرض کیا کہ ہم کو نماز حضور قلب سے کبھی میسر نہ ہوئی۔ اگر آپ کی ہدایت سے یہ امر حاصل ہو جائے تو عین مدعا ہے۔ حضرت نے کشف باطن سے معلوم کیا کہ یہ بطریق امتحان اس طرح سے کہتے ہیں۔ تبسم کیا اور فرمایا کہ مولانا آج شب کو اس حجرہ میں تشریف لاؤ، شاید یہ بات ظہور میں آجائے۔ ان کو زیادہ استعجاب ہوا اور شب کو دونوں صاحب تشریف لے گئے۔ اور آپ نے اپنے ساتھ ان کو نماز میں کھڑا کیا۔ اور جب نماز پڑھوا چکے فرمایا کہ اب جدا جدا نیت باندھ کر دو دو رکعت علیحدہ پڑھو۔ یہ جب

کھڑے ہوئے تو اس طرح کلاستغراق ہوا کہ ان دنوں صاحبوں کی انہیں دور کھت میں
شب بسر ہو گئی۔ جب یہ فیض باطن شاہدہ کیا صبح کو دنوں صاحبوں نے بیعت کی۔ اور
یہاں تک آپ کی کفش برداری میں حاضر رہے کہ آپ کی کفش برداری کو فخر سمجھتے تھے۔
چند روز کے بعد آپ نے فرمایا کہ مولانا مشیت الہی میں یہ ہے کہ تم کو تکمیل اس علم کی
اور تقسیم ان مراتب کی سفر میں حاصل ہو۔ ان کو ہمراہ لیکر مکہ معظمہ کا سفر کیا اور راہ میں
قریب ایک ہزار آدمی کے اپنے ہمراہ لے کر حج ادا کیا اور وہاں سے پھر ہندوستان کی طرف
تشریف لائے اور آپ جو ترویج رسوم شرعیہ اور امر بالمعروف بہت کرتے منہیات کا
رواج اُن کی برکت سے اکثر اطراف سے اٹھ گیا۔ طرفہ یہ ہے کہ شہر کلکتہ میں جب
تک آپ نے تشریف رکھی شراب مطلق نہ بکنے پائی۔ اور کھال خانہ بند رہا۔ اور اس نواح
میں آپ کے مریدوں کی کثرت لکھوک سے گزر گئی۔ اور آپ کے اکثر خلفا کو قطب اور
اوتاد کا مرتبہ حاصل ہوا اور جو کائنات کے کشف باطن کے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کو موعہ اکثر
مومنین پاک اعتقاد کے سعادت شہادت حاصل ہونے والی ہے۔ مولانا اسماعیلؒ اور
مولانا عبدالحی کو اجازت ہوئی کہ اطراف ہندوستان میں وعظ کہو اور پیشتر جہاد اور فضیلت
شہادت بیان کرو ہر چند یہ اس کا منشا نہ جانتے تھے لیکن مرید باخلاص تھے اور فرمان
بجالائے۔ ان کے وعظ سے لکھوک مردم شاہراہ ہدایت پر آئے اور شوق ماہو الحق دل
میں جم گیا۔ اور جہاد کی افضلیت ذہنوں میں بیٹھ گئی اور خود بخود چاہنے لگے کہ اگر
جان و مال راوا الہی میں صرف ہو تو عین سعادت ہے۔ بعد مدت کے ان بزرگوں کو
حضرت نے لکھا کہ اب ہمارے پاس چلے آؤ، یہ تو جان نثار تھے۔ یہ مجرد حکم کے مشتاقین
وعظ کو نیم جان چھوڑ کر خدمت بابرکت میں راہی ہوئے اور حضرت ان کو ہمراہ لے کر

کو ہستان کو چلے گئے اور یہ ہندو اس کے مثل سے واقف نہیں۔
 قوم افغان . . . حضرت کے ایسے متقدّم ہوئے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت امامت کی اور
 عہد کیا کہ اگر حضرت جہاد کریں تو ہم سرفروشی کو حاضر ہیں۔ آپ نے سکھوں کی قوم پر جہاد
 قائم کیا۔ مردم ہندوستان اس خبر کے سننے سے اطراف و جوارب سے راہی ہوئے اور
 اور سوائے قوم افغانہ کے مردم ہندوستانی لاکھ آدمی کے قریب جمع ہوئے اور خطبہ آپ کے
 نام کا پڑھا گیا۔ دور دورا مام ہو گیا۔ چند منزل عشر جو طریقہ اسلام میں ایک نوع خراج
 کی ہے آپ کے پاس آنے لگا۔ ہٹا در اور بعض ہیکان سکھ کی عمل داری سے نکل کر غازیان
 اسلام کے تصرف میں آگئے سکھوں کے باوجود اس شان و شوکت ظاہری کے آپ کا ایسا
 رعب دل میں بیٹھ گیا کہ کچھ ملک دینے پر راضی ہوئے۔ سچ ہے ع

بیعت حق است این از خلق نیست

لیکن حضرت کو جو کہ ترویج اسلام منظور تھی قبول نہ کیا۔ کئی سال تک یہی سلسلہ یوں ہی چلا
 گیا اور مولوی مولانا عبدالحی علیہ الرحمہ نے بیماری بدنی سے سفر آخرت اختیار کیا۔ بعد اس
 کے جو کہ قوم افغانہ بندہ زرا اور نہایت طامع ہیں سکھوں کے اغوا سے آپ سے منحرف
 ہو گئے۔ اور عین معرکہ جنگ میں آپ سے دغا کی۔ از بس کہ مشیت الہی میں دولت
 شہادت آپ کے نصیب میں تھی قریب بالاکوٹ کے حضرت نے مولوی محمد اسماعیل
 اور اکثر مومنین صاف اعتقاد کے شہادت پائی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت
 کی شہادت کو چودہ ہندو برس کا عرصہ گزرتا ہے۔ ۱۷

شاہ فدا حسین صاحب | شاہ فدا حسین صاحب کا اصلی نام خواجہ نجیب الدین تھا وہ رسول شاہی سلسلہ کے بڑے برگزیدہ بزرگ تھے۔ رسول شاہی سلسلہ، رسول شاہ سے شروع ہوتا ہے، وہ خاندان بہروردیہ سے متعلق تھے۔

شاہ فدا حسین صاحب نے باقی سلسلہ رسول شاہی کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ شاہ محمد ضیف سے بیعت کی تھی۔ اُن ہی سے تمام درسی کتابیں پڑھیں۔ جب تحصیل پوری ہو گئی تو مرشد کے حکم سے کل کتابیں کنوئیں میں ڈال دیں وہ خاص کر حقائق و معارف میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ فصوص الحکم، فتوحات مکیہ اور شیخ اکبر کی دیگر تصانیف بہت خوبی سے پڑھتے تھے۔ مگر وضع یہ تھی کہ چار ماہ کا صفا یا کئے، ایک غرق باندھے اور سارے بدن پر بھوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ جب حجرہ سے باہر نکلنے تو ہمد گھٹنوں تک لپیٹ لیتے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے۔ ایک بار اکبر شاہ نے اُن کے پاس آنا چاہا مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ ۱۷

سرسید کہتے تھے کہ وہ نہایت خوش بیان اور خوش تقریر تھے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو جو اُن کی بھتیجی تھیں اُنہیں اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اس کا اثر میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلی میں اُن کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الوری چلے گئے اور ۱۲۵۹ھ میں وہاں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے نکیہ میں جو چھلی باغ کہلاتا ہے اُن کا ڈھیر ہے۔ ۱۸

شاہ صاحب نہایت توکل اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ زمین پر سوتے اور اینٹ

۱۷ حیات جاوید ج ۱ ص ۲۰۔ ۱۸ شاہ فدا حسین سرسید کے نانا ڈیر اللہ خواجہ فرید الدین کے حقیقی بھائی

تھے۔ (حیات جاوید ج ۱ ص ۲۰)۔ ۱۹ حیات جاوید ج ۱ ص ۲۱۔

سرہانے رکھتے تھے۔ اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ خاکساری طبیعت میں بہت تھی، ان کی ذات سے رسول شاہی سلسلہ کو بہت ترقی ہوئی۔ ہزاروں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ان کے خلفاء تبت، سراندیب، مشہد وغیرہ میں موجود تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے شاہ صاحب کے مذہبی خیالات پر اعتراض کئے ہیں اور لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان سے اس سلسلہ میں مناظرہ کیا تھا۔ حاجی امداد اللہ صاحب نے ان سب باتوں کی تردید کی ہے اور شاہ صاحب کو صاحب باطن بتایا ہے ۱۷

شاہ فلاحین کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ شتویٰ بن دسران کی طبع زاد ہے جو آپ کے معتقدین نے جمع کی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مراجز دیدن دیدار وجہ اللہ کارے نیست در دنیا

شفاعت را بجز ذات رسول اللہ یارے نیست در عقبی

خویشتن را خود عیاں فرمودہ	صورتے از جسم و جاں بنمودہ
کل نفس واحد فرمودہ	واحد فی کل نفس بودہ
اگر بخلوت دل یک زمانہ نشینی	درون کعبہ دل صورت خدا بینی
نسبت طاعت بخود عصیاں بود	نسبت عصیاں بخود عرفاں بود
عین ذات تو بود وحدت وجود	ایں صفات تو بود وحدت شہود
غیر وحدت نیست کثرت را وجود	غیر کثرت نیست وحدت را شہود ۱۸

۱۷ آثار الصادقہ ص ۵۱ - ۱۸ ایضاً ص ۵۱-۵۲ - ۱۹ شام امدادیہ ص ۱۲۰

۲۰ آثار الصادقہ ص ۵۲ - نیز واقعات دار الحکومت دہلی -

۸۵۷ء سے قبل کی علمی دنیا کا ذکر کرنا شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کا ذکر کرنا ہے۔ اس خاندان نے علومِ دینی کی وہ عظیم الشان خدمت کی ہے جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ مولانا تذیر احمد دہلویؒ نے اپنے ترجمہ القرآن کے شروع میں نہایت صحیح لکھا ہے: ”انہوں (شاہ ولی اللہؒ) نے اور ان کے خاندان نے ہند میں اسلام کی قریب قریب ویسی ہی خدمتیں کیں جیسی عرب میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے یعنی اصحاب نے، تابعین نے اور تبع تابعین نے اور ائمہ مجتہدین نے کی تھیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام جتنا کچھ بھی ہے اور جیسا کچھ بھی ہے اسی خاندانِ عالی شان کا طفیل ہے ان بزرگوں نے اسلام کی اشاعت میں وہ کیا جو دینِ حق کا دلدادہ، قوم کا مصلح، ہمدرد و خیر خواہ کر سکتا ہے۔ دین کی کتابوں کے درس دیئے ترجمہ کئے۔ وعظائے تصنیفیں کیں“۔

اس خاندان نے مذہب کا عظمت و وقار قائم کیا۔ عوام میں صحیح مذہبی جذبات پیدا کئے اور ان کو کتاب و حدیث سے روشناس کرایا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ ان کے بیٹے شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن کریم کے اردو میں ترجمہ کئے۔ شاہ عبدالحیؒ (شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے داماد) نے لغات القرآن لکھی، مولانا محمد اسحاقؒ (شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسہ) نے مشکوٰۃ کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ غرض اس طرح سب علومِ دینی کو پھیلایا گیا۔ اور عوام میں کتاب و حدیث سے استفادہ حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ شاہ عبدالعزیزؒ صاحبؒ نقلی علوم کے ماہر تھے۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ عقلی مسائل کی تحقیق میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، کشفی معاملات میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ ممتاز تھے۔ ان میںوں صلاحیتوں نے مل کر ایک طوفانی دور میں سرمایہٴ ملت کی نگہبانی کی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب | حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزند شاہ عبدالعزیز صاحب (۱۲۴۹-۱۱۵۹) اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ تبحر عالم تھے علم و فضل میں وہ وحید عصر اور نیکائے زمانہ تھے۔ "فقرودین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل" سب خوبیاں ان کی ذات میں جمع تھیں۔ وہ علمی دنیا کے آفتاب تھے جس سگریزہ پر شعاعیں پڑ جاتیں وہ لعل ناب بن کر مکتا۔ حدیث و قرآن کا جو چرچا ان کے زمانہ میں ہوا اس کی مثال اسلامی ہند کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے خرمین کمال کے ہزاروں خوشہ چیں تھے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے تھے۔ ایک عالم نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی اور اسے علم حدیث کا کوئی بھی ایسا استاد نہ ملا جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا شاگرد نہ ہوئے۔^۱

شاہ ولی اللہ صاحب نے جس وقت وصال فرمایا تھا اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عمر ۷۱ سال کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے مکمل ۶۰ سال تک دلی میں علوم دینیہ کی ترویج و تبلیغ میں صرف کئے۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے بھی مذہبی مدارس ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر شاہ صاحب ہی کی کوشش کے مریون منت ہیں اور ان ہی کی روشن کی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور علم کا ایک معیار قائم کیا کہ ہر کس و ناکس علوم دینی میں بے جا دخل دینے کی (جیسا کہ انحطاط کے زمانہ میں اکثر ہوتا ہے) جرات نہ کر سکتا تھا۔ مرید لکھتے ہیں۔

"یہ آفت جو اس جزو زمان میں تمام دیار ہندوستان خصوصاً شاہ جہاں آباد حر بہا اللہ

۱۔ مومن نے شاہ صاحب کے وصال پر ایک مرقیہ لکھا تھا اس کا شعر ہے

دست بے داد اجل سے بے سرو پا ہو گئے

فقرودین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

۲۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک مولانا سدی "ص ۸۳

عن الشر والفساد میں مثل ہوائے وبائی کے عام ہو گئی ہے کہ ہر عامی اپنے تئیں عالم اور ہر جاہل آپ کو فاضل سمجھتا ہے اور فقط اسی پر کہ چند رسالہ مسائل دینی اور ترجمہ قرآن مجید کو اور وہ بھی زبان اردو میں کسی نے استاد سے اور کسی نے اپنی زورِ طبیعت سے بڑھ لیا ہے اپنے تئیں فقیہ و مفسر سمجھ کر مسائل و وعظ گوئی میں جرأت کر بیٹھا ہے آپ کے ایام حیات تک اس کا اثر نہ تھا بلکہ علما متبحر... جب تک اپنا سمجھا ہوا حضرت کی خدمت میں عرض نہ کر لیتے تھے اس کے اظہار میں لب کو دانہ کرتے تھے :۔

اس طرح علوم دینیہ کی ایک خاص عزت اور وقار قائم ہو گیا۔ جو لوگ دلچسپی رکھتے تھے وہ باقاعدہ تحصیلِ علوم کرتے تھے۔ ہر جاہل کو بے سرو پا اور گمراہ کن باتیں پھیلانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے علمی فیوض سے سارا ہندوستان مستفیض ہوا۔ مولانا عبید اللہ ندوی مرحوم کا خیال تھا کہ ”شاہ ولی اللہؒ کے خواص سے اگر دس آدمیوں نے استفادہ کیا تو شاہ عبدالعزیزؒ کے خواص سے دس ہزار مستفید ہوئے“ شاہ صاحب ہفتہ میں دو بار مجلس وعظ کیا کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں خواص و عوام مور و ملح سے زیادہ جمع ہوتے تھے۔ شاہ صاحب کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ شدید علالت کے زمانہ میں بھی پابندی سے وعظ فرماتے تھے۔ ان کا طرز بیان بڑا دلکش تھا۔ بات مختصر لیکن دل میں اتروانے والی کہتے تھے۔ ان کے ملفوظات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کے دل میں مذہب سے متعلق بہت سے شبہات پیدا ہو رہے تھے اور شاہ صاحب ہی کا تبحر اور قابلیت تھی کہ ان کو مطمئن کر دیتے تھے۔ ایک

انخطاط پذیر سوسائٹی میں عوام کے "نذہبی ذہن و شعور" کو انتشار سے بچالینا شاہ صاحب کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے وہ عوام کی نفسیات سے واقف تھے۔ مذہب کی روح سے واقف تھے مرض کی تشخیص کر چکے تھے، اس لئے علاج ہمیشہ کارگر ہوتا تھا۔ سائل ہمیشہ مطمئن ہو جاتا تھا اور اس کے شبہات دور ہو جاتے تھے۔ ایک شخص نے سوال کیا "شریعت محمدی چرا اکل شرائع باشد" جواب میں ارشاد ہوتا ہے۔

"و جہش آن است کہ در دیگر شرائع لحاظ خصوصیات استعداد امت خاص و زمان و مصلحت آن وقت بود کہ اگر خلاف آن کنند نقصان شود پس کامل بود و درین شریعت لحاظ مصلحت نوع انسانست پس تخصیص اوقات و استعداد امت خاص نہ باشد بلکہ برائے ہر امت از فرض و لواقل و سنت بہ تشدد و سہولت موجود است گویا معتدل ترین شرائع شد" لہ

جواب مختصر تھا مگر اس قدر جامع کہ اس سے بہتر جواب ناممکن تھا۔ روح، معراج اور دیگر مسائل کے متعلق ان سے سوال کئے جاتے تھے اور نہایت تشفی بخش جواب ملتا تھا۔ شاہ صاحب نے جو خدایات اسلام کی انجام دی ہیں ان پر سیر حاصل بحث کرنے کے لئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ یہاں اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ شاہ صاحب کی سامعی کے چار پہلو تھے۔

- (۱) علوم دینی، حدیث و قرآن کا چرچا کرنا اور ان کا صحیح معیار قائم کرنا۔
- (۲) اس زمانہ کے مختلف غلط مذہبی نظریات کی تصحیح اور شبہات کا رفع کرنا اور مسلمانوں میں مذہبی حیثیت سے "دینی انتشار" پیدا نہ ہونے دینا۔

(۳) ہندوستان کے عرب سے زیادہ قریبی تعلقات پیدا کرنا۔

(۴) ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر جہاد کی روح بھونکنا اور مجاہدین کی ایک سرفروش جماعت کا پیدا کرنا۔

شاہ رفیع الدین صاحب | شاہ رفیع الدین صاحب ابن شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اپنے زمانہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب چونکہ کبرنی، ضعف مزاج اور کثرت امراض کے باعث آخر عمر میں درس و تدریس کا کام انجام نہیں دے سکتے تھے اس لئے شاہ رفیع الدین صاحب سے خدمت پر مامور تھے۔ دودھ و دے علماء آپ سے استفادہ حاصل کرنے کی غرض سے دلی آتے تھے۔ وہ ہر فن اور مضمون میں کامل مہارت رکھتے تھے جس فن کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، ایسا معلوم ہوتا کہ یہ ہی پکا خاص مضمون ہے۔ ریاضیات میں بہت ماہر تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرمایا کرتے تھے

”مولوی رفیع الدین در ریاضیات چنواں ترقی کردہ اندک شاید موجد آں محمد علی ہم

بودہ باشد باز“

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

در فن ریاضی مثل مولوی رفیع الدین در ہند و ولایت نخواستہ بود۔

آپ کی تصانیف میں مقدمۃ العلم، رسالہ عروض، کتاب التکیل، رسالہ دفع الباطل، سار المجہد بہت مشہور ہیں۔ آپ نے اردو میں قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کو آپ سے بہت محبت تھی، جامع ملفوظات نے مولانا رفیع الدین صاحب

لہ نقلی عزیز یہ ۱۵ (مجلع بختائی ص ۱۷۱، ۱۸۵) نیز ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۵۸۔

لہ ملفوظات ص ۳۰۔ لہ ایضاً ص ۶۳

کے جنازے کی پوری کیفیت اور شاہ عبدالعزیز صاحب کا باوجود نابینا ہونے کے چارپائی اٹھانے کی کوشش کرنا نہایت ہڈناک پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ۱۷
شاہ عبدالقادر صاحب | شاہ عبدالقادر صاحب (۱۲۳۰-۱۱۶۷) اپنے خاندان کی علمی خصوصیات کے حامل تھے۔ خزینۃ الاصفیاء میں لکھا ہے۔

۱۸ "عالم، عامل، وفقیہ کامل بود، علم حدیث و تفسیر شانے عظیم داشت" ۱۹
انتہائی پرہیزگار اور متقی تھے۔ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ توکل اور قناعت حد سے زیادہ تھی۔ امیر الروایات میں لکھا ہے: شاہ عبدالقادر کا کھانا اکبری مسجد میں روزانہ شاہ عبدالعزیز ہی کے گھر سے جاتا تھا وہی اپنے متوکل بھائی کے کپڑے بنا دیتے تھے۔ ۲۰
شاہ عبدالقادر صاحب نے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ۱۲۰۵ھ میں صرف قرآن پاک کا اردو میں با محاورہ ترجمہ موضع القرآن کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ بقول مولوی نذیر احمد دہلوی اردو کا بہتر سے بہتر ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔ ۲۱

۲۲ شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی فرمایا کرتے تھے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے اور بیٹے تو عالم اور صلوات تھے لیکن شاہ عبدالقادر صاحب نسبت تھے اور صاحب نسبت بہت کم ہوتے ہیں۔ ۲۳
آپ کا اخلاق نہایت عمدہ اور اعلیٰ تھا۔ کسی سے کچھ نہ فرماتے تھے لیکن رعب کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے رؤسا آپ کے سامنے لب کثانی کرتے ہوئے ڈرتے تھے ۲۴

۱۷ لفظوں میں ۸۳-۸۲۔ ۱۸ خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۸۹۔ ۱۹ امیر الروایات میر شاہ خاں۔ ص ۱۰۵۔
۲۰ مقدمہ ترجمہ القرآن ص ۴۴۔ نیز مولانا سندی مرحوم کا خیال ہے کہ "موضع القرآن" میں "آپ کے" تشریحی ارشادات آج تک علمائے محققین کے لئے بصیرت افروز ہیں "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۸۳۔
۲۱ ارشادات رحمانی و فضل یزدانی۔ مولوی عبدالاحد رحمتی پریس دہلی ۱۳۵۵ھ ص ۳۰۔
۲۲ واقعات وادارہ حکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۹۔

مولوی رشید الدین خاں | مولوی رشید الدین خاں، شاہ رفیع الدین صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ معقول و منقول، فروع و حدیثوں میں بگائے عصر تھے۔ شاہ صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت بیٹے کی طرح کی تھی۔ ہر وقت ان کی اصلاح اور ترقی کی فکر اور کوشش رہتی تھی۔ شاہ رفیع الدین صاحب کے بعد، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان کی اصلاح اور تعلیمی ترقی کی طرف توجہ کی۔

مولوی رشید الدین صاحب گوہر خن میں دستگاہ رکھتے تھے لیکن علم ہیئت اور ہندسہ میں ان کو خاص مہارت تھی اور اس زمانہ میں مشکل سے کوئی شخص ان فنون میں ان کا مقابلہ کرنے کی جرات کر سکتا تھا۔ مناظرہ اور مباحثہ میں جوید بطولی ان کو حاصل تھا وہ مشکل سے کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ علماء و فضلا آپ کے پتھر کا کلمہ مانتے تھے۔ فرقہ امامیہ سے ان کے مباحث ان کے علمی بلندی کا ثبوت ہیں۔

علم و فضل کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب کا زہد و تقویٰ بھی مسلم تھا۔ قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عہدہ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مدرسہ شاہ جہاں آباد میں مدرسہ کرتے رہے۔ شورویہ یا ہوار ملتے تھے۔ یہی گزراوقات کا ذریعہ تھا۔ جو ضرورتیں پہنچ جاتا تھا اس کی حتی المقدور مدد کرتے تھے۔ ۱۲۴۹ھ میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں وصال فرمایا۔

مولانا مخصوص اللہ صاحب | مولانا مخصوص اللہ صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ علم و فضل میں اپنے گھرانے کی روایات کے حامل تھے ۲۵ سال تک وہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں رہے تھے۔ ان کی مجالس و عظیم پابندی سے شرکت کی تھی اور اس طرح سے حدیث و تفسیر کا بے نظیر سرمایہ سینے میں رکھتے تھے۔ مدت تک انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ رکھا۔ آخر میں گوشہ نشین ہو گئے اور عبادت گزاری میں وقت صرف کرنے لگے۔

مولانا عبدالحی | مولانا عبدالحی صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد اور داماد تھے۔ زہد و تقویٰ، علم و فضل سب ہی کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں عنایت کیا تھا۔ ہر فن کے ساتھ خداداد نسبت رکھتے تھے۔ ایک مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ پھر سید احمد شہید کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ اور پھر ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے۔ اُن ہی کے ساتھ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے واپسی پر پیر و مرشد کے ارشاد کے مطابق وعظ گوئی میں مصروف ہو گئے۔ مولوی محمد اسماعیل کے ساتھ ترغیب جہاد میں سرگرم رہے۔ پھر سید صاحب کے ساتھ سرحدی علاقوں میں تلقین و ترغیب جہاد شروع کی۔ مسئلہ کو مولانا عبدالحی صاحب نے وصال فرمایا جب اُن کا آخری وقت ہوا تو سید صاحب نے اُن سے فرمایا کہ مولانا اگر آپ کی کوئی خواہش ہو تو میں اس کو پورا کر دوں۔ آپ نے کہا آپ اپنا قدم بڑھا کر میرے سینے پر رکھیں۔ یہ ہی ایک خواہش باقی ہے۔ سید صاحب نے تعمیل کر دی۔ ۱۷

شاہ محمد اسماعیل شہید | شاہ ولی اللہ صاحب نے تہذیبِ الہیہ میں ایک جگہ اشارہ کیا تھا کہ "اگر موقع و محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا تھا" زمانہ کا یہ تقاضا نہ تھا اس لئے وہ خاموش ہو رہے کچھ عرصہ کے بعد حالات نے ایک مجاہد کو پکارا تو شاہ صاحب کی یہ صلاحیت "شاہ محمد اسماعیل" کی صورت میں نمودار ہوئی شاہ محمد اسماعیل، شاہ صاحب کے پوتے تھے اور حضراتِ ثلاثہ کی صحبت اور تربیت سے انہوں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیم کا پھول اور خلاصہ تھا۔

۱۷ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں ۱۰۰۔ ۱۷۰ تہذیبِ الہیہ جلد اول ص ۱۰۱۔
۱۸ آثار الصنادید (ص ۹۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ شاہ عبدالعزیز صاحب۔ شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

شاہ محمد اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے انھیں اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ بقول سرسیدؒ: ”جو ہر قابل محتاج تربیت اور نیاز مند تعلیم نہیں ہوتا، آپ نے بہت جلد تمام علوم حاصل کر لئے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں تحصیل معقول و منقول و فراغت حاصل ہو گئی۔ اوائل حال ہی میں شاہ سید احمدؒ کے معتمد ہو گئے۔ پیرو مرشد کے ہمراہ حج کو چلے گئے۔ جب واپس آئے تو رشد و ہدایت کا دروازہ کھول دیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنی توجہ تین چیزوں کی طرف مبذول کی کہ ان کی نظر میں اسلام کی بقا کا راز صرف ان ہی میں تھا۔

(۱) امانتِ بدعت۔

(۲) احیاءِ سنت۔

(۳) تلقینِ جہاد۔

جامع مسجد دہلی میں انھوں نے ہزاروں کے اجتماع میں وعظا کہے۔ سینکڑوں کو عیت سے نکالا۔ سنت پر جمایا اور جہاد کے لئے تیار کیا۔ ان کی اس مسلسل کوشش نے عروقِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جب دلی میں کام ختم کر چکے تو پیرو مرشد نے بالاکوٹ بلا لیا جہاں مرشد و مرید دونوں نے ناموسِ اسلام کی خاطر اپنے خون کے آخری قطرات بہا دیئے۔

شاہ اسماعیل صاحبؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کے لئے اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ انھوں نے احیاءِ ملت کے لئے وہ خدمات انجام دیں جو اسلامی ہند کی تاریخ میں سونے کے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں میں جو روح پھونک دی تھی اس کے مظاہرے ان کی شہادت کے بعد تک ہوتے رہے۔ سرسید کا بیان ہے۔

”اس واقعہ کو (یعنی شہادت کو) چودہ ہندو برس گزرتے ہیں اور چونکہ یہ طریقہ آخر الزما میں بنیاد ڈالا ہوا ان حضرات کا ہے اب تک اس سنت کی پیروی عباد اللہ نے ہاتھ سے نہیں دی۔ اور ہر سال مجاہدین اوفانِ مختلفہ سے بہ نیت جہاد اسی نواح کی طرف راہی ہوا کرتے ہیں۔ اور اس امریک کا ثواب آپ کی روحِ مطہر کو پہنچتا رہتا ہے“ لے

مولانا محمد اسحق صاحب | مولانا محمد اسحقؒ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے تھے اور ان ہی کی خدمت میں علمِ حدیث حاصل کیا تھا۔ بیس سال تک حدیث کا درس شاہ صاحبؒ کے سامنے بیٹھ کر نئے طلباء کو دیا۔ اتباعِ سنت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم و عمل دونوں عنایت فرمائے تھے۔ ۱۲۳۹ھ میں جب شاہ عبدالعزیزؒ نے وصال فرمایا تو اپنا مدرسہ مولانا اسحق صاحبؒ ہی کے سپرد کیا۔ اور وہی خلیفہ مقرر ہوئے۔ دہلی میں ان کی بڑی عزت اور احترام تھا۔ بادشاہ تک اُن کا احترام کرتا تھا۔ حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے روایت ہے کہ مولانا عشرہ محرم کے دن بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے۔ بادشاہ سونے کے کڑے پہنے ہوئے تھا، آستین سے بند کر لئے اور جب تک مولانا بیٹھے رہے مودب بیٹھا رہا۔ لے

کچھ عرصہ بعد چند قبیلوں کے ساتھ حج کو چلے گئے اور پھر تشریف لا کر اپنے مواعظ و نصائح سے خلقِ خدا کو راہِ ہدایت دکھانے لگے۔ دوسری بار پھر مہ قبائل حج کے لئے روانہ ہوئے اور مکہ معظمہ میں ہی وطن اختیار کر لیا۔ ہندوستان سے جو لوگ حج کے لئے جاتے تھے وہ ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے اور وہ ان کی بڑی خاطر مدارات کرتے تھے۔ دلی سے جدا ہو کر ۶ سال تک مکہ معظمہ رہے ۱۲۶۲ھ میں وصال فرمایا۔

مولانا محمد یعقوبؒ | مولانا محمد اسحاقؒ کے چھوٹے بھائی تھے، علم و فضل، قناعت و استغنا میں بے نظیر تھے۔ کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہ کرتے تھے۔ شاہ اسحق صاحبؒ کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کی اور مکہ معظمہ میں وطن اختیار کیا۔

نواب قطب الدین خاں | نواب قطب الدین خاں صاحب اپنے زمانہ کے بھر عالم تھے فقہ و حدیث کی تعلیم حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے حاصل کی تھی۔ اتباع شریعت کا بے حد خیال رہتا تھا۔ وضع و لباس میں بالکل اپنے استاد کے مشابہ تھے۔ علم و فضل، زہر و دہش سب کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو عنایت کیا تھا۔ ان کے بزرگ دربار شاہی میں تقرب رکھتے تھے۔ خود ان کو بارگاہ سلطانی میں بڑا مرتبہ اور عزت حاصل تھی۔ ۶ نومبر ۱۸۴۲ء کی خبر ہے۔

”نواب غلام محی الدین خاں بہادر کی تقریب ماتم میں ان کے صاحبزادے منظر الاسلام نواب محمد قطب الدین خاں بہادر کو خلعت شش پارچہ اور ان کے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت کی طرف سے عطا کیا گیا“ ۱۷

نواب صاحب جو تھے دن اپنے استاد کی پیروی میں مجلس و عظم منعقد کرتے تھے، آپ نے بہت سے رسائل اردو میں لکھے ہیں۔ ان میں بعض نہایت اہم مسائل کو سمجھایا ہے۔ سرسید نے لکھا ہے ”ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا“ انھوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ ”مظاہر الحق“ کے نام سے اردو میں کیا۔ اس ترجمہ کی زبان بہت سلیس اور شستہ ہے۔ وہ ہمیشہ رواج دین اور تقویت شرع کے لئے سعی رہتے تھے۔

مولانا مملوک علی صاحب | مولانا مملوک علی صاحب دلی کے مشاہیر علماء میں سے تھے۔ معقول و منقول

۱۷ آثار الضادید ص ۱۷۱۔ ۱۸ بہادر شاہ کار و زنا مجلہ ص ۱۰۳۔ ۱۹ آثار الضادید ص ۱۰۷

میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ فقہ پر خاص طور سے عبور تھا۔ وہ مولانا رشید الدین صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مولانا مرحوم کے بعد وہی مدرسہ شاہ جہاں آباد کی مدرسہ پر مامور ہوئے آپ کے فیوض سے تمام ہندوستان نے استفادہ کیا۔ آپ کے شاگرد بڑے مرتبہ کے عالم ہوئے مولانا عاشق الہی صاحب مرحوم نے خوب لکھا ہے۔

”مولانا مملوک علی صاحب جنھوں نے درسیات کا اکثر حصہ ماہتاب ہند حضرت شاہ

عبدالعزیز صاحب قدس سرہ کے ارشد تلامذہ حضرت مولانا رشید الدین خاں صاحب

سے پڑھا تھا، فلک علم کے نیری امام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی وقاسم

انجیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا محمد مظہر صاحب صدر المدین

مظاہر العلوم حبیبی مقدس و مشہور ہستیوں کے استاد تھے کہ ان سب حضرات نے

علوم دینیہ و فنون ادبیہ کی پیاس اسی بحر ذخار کے آب و دہن سے بجھائی اور ہر

چار جانب سے پریشان ہو کر اسی آستانہ پر شفا و تسکین پائی تھی۔“ ۱۷

مولانا کو درسیات وغیرہ کی کتابوں پر اس قدر عبور تھا کہ اکثر زبانیں یاد تھیں۔ حافظہ کا

یہ عالم تھا کہ سرسید لکھتے ہیں۔

”اگر فرض کرو کہ ان تمام کتابوں سے گنجینہ عالم خالی ہو جائے تو ان کی لوح حافظہ

سے پھر نقل ان کی ممکن ہے۔“ ۱۸

مولانا کا اخلاق نہایت وسیع تھا۔ سرسید لکھتے ہیں: ”ان سب کمال و فضیلت پر خلق و

علم احاطہ تقریر سے افزوں ہے۔“ ۱۹ مولانا نے ۱۳۶۷ھ کو وصال فرمایا۔ آپ کا مزار مقبرہ شاہ ولی اللہ

میں ہے۔ آپ کے صاحبزادے مولوی محمد یعقوب صاحب (المتوفی ۱۳۸۷ھ) نے مدرسۃ العلوم

۱۷ تذکرۃ الخلیل (مطبوعہ میرٹھ) ص ۱۔ ۱۸ رسالہ آثار الصنادید ص ۱۲۷ ۱۲۸ ۱۲۹ واقعات۔ ۲۵ ص ۵۸۴۔

دیوبند کے ابتدائی دور میں صدر مدرس کی خدمات انجام دیں۔ آپ کی صاحبزادی بی مبارک النساء مولانا فلیل احمد صاحبؒ کی والدہ تھیں۔

میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی | سید نذیر حسین صاحبؒ، حدیث کے مشہور عالم تھے (۱۳۲۰-۱۴۲۰ھ) انھوں نے مولوی عبدالخالق، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے استفادہ کیا تھا۔ حدیث و تفسیر شاہ محمد اسحاقؒ سے پڑھی تھی۔ تیرہ برس تک اُن کی خدمت میں رہ کر فیوض و برکات حاصل کئے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں "مولوی صاحب بہت صاحب استعداد ہیں۔ خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر و اقراں سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن نقص سے اُن کی دلچسپی زیادہ عرصہ تک نہ رہی۔ سلسلہ کے بعد آپ نے قرآن و حدیث کے درس کے علاوہ کسی طرف رُخ نہ کیا۔ انھوں نے فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے قرآن و حدیث سے براہِ راست استفادہ کرنے پر زور دیا۔ اور اس طرح سے ایک نیا سلسلہ اہل حدیث کا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں توحید خالص اور بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہِ راست کتب حدیث سے بقدرِ فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ پیدا ہوا۔"۔

مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ کے ذریعہ سے اہل حدیث کے سلسلہ کو بڑی ترقی ہوئی۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولوی بشیر الدین صاحبؒ نے لکھا ہے "سارے ہندوستان اور نیز ہندوستان کے باہر بھی یمن، نجد، سنوس، اندلس، افغانستان، کشمیر، خراساں، کاشغر، ہرم، جاوہر تک آپ کے ہزار ہا شاگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں تو ان کے شاگردوں نے گوشہ گوشہ میں پھیل کر اپنے طریقہ کی اشاعت کی۔"

۱۔ تذکرۃ الخلیفین ص ۱۱۰-۱۱۹۔ ۲۔ آثار العناوید ص ۱۱۰۔ ۳۔ حیاتِ شبلی ص ۲۶-۲۵۔ ۴۔ واقعات ص ۲۸-۲۵۹۔ ۵۔ اُن کے بعض مشہور تلامذہ کیلئے دیکھئے حیاتِ شبلی ص ۲۶-۲۷۔

مولانا کا یہ معمول تھا کہ روزانہ نماز فجر کے بعد مولانا عبدالقادر صاحب کے ترجمہ قرآن کے دو تین رکوع سب کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد حدیث شریف کا درس شروع ہوتا تھا۔
 مولانا نے چند رسالہ اپنی تصانیف میں چھوڑے ہیں۔ معیار الحق۔ واقعۃ الفتویٰ، واقعۃ^۳ البلوی، ثبوت الحق، فلاح الولیٰ بالتبع العقبیٰ، البطلان عمل المولد، وغیرہ۔
 مولانا کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ سارے شہر میں اُن کی عزت تھی، لوگ میاں صاحب کہتے تھے اور اُن سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ۱۳۲۸ھ میں آپ نے وصال فرمایا اور شیدی پورہ کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ ان کی سوانح ”الحیاء بعد المماتہ“ اور ”حسرت العالم بوفاتہ محدث العالم“ ہیں۔

مولوی محبوب علی صاحب | مولوی محبوب علی صاحب علم حدیث و فقہ کے بڑے جید عالم تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے تحصیل علم کیا تھا۔ اور اُن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مسائل جزویہ پر ہمارت تھی۔ ۱۳۲۸ھ میں وصال فرمایا اور چونٹھ کھمبہ بیرون ترکمان دروازہ سپرد خاک کئے گئے۔
 مولوی نصیر الدین صاحب | مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد تھے علوم دینی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ مرجع عوام و خواص تھے۔ بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ لیکن اعلائے کلمہ الحق میں نہایت بے باک تھے۔ جب بالاکوٹ کے تاریخی مقام پر سید صاحب شہید ہوئے تو اُن کی جماعت کے باقی ماندہ لوگوں نے آپ ہی سے بیعت کی تھی۔ لہ

مولوی نصیر الدین صاحب میں اگر ایک مجاہدانہ اور سرفروشانہ جذبہ کار فرما تھا تو دوسری طرف عبادت کا یہ عالم تھا کہ چہرہ مبارک پر کثرتِ گریہ سے سیاہ نشان پڑ گئے تھے۔ ان کا اخلاق نہایت وسیع تھا۔ مریدوں اور شاگردوں تک سے انتہائی اخلاق سے پیش آتے

۱۔ مزارات اولیاء دہلی ص ۵۸ لکھنؤ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۵۸۔ ۲۔ شائم امداد یہ ص ۲

لیک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب کے والد ماجد علیہ السلام ہوئے اور حاجی صاحب کو
 تیمارداری کیلئے وطن طلب کیا گیا۔ حاجی صاحب مولانا سے اجازت لینے کے لئے گئے۔ جب
 حاجی صاحب چلنے لگے تو مولانا مدرسہ شاہ محمد اسحق سے ان کے مکان تک جو کافی دور تھا رخصت
 کرنے کے لئے آئے۔ حاجی صاحب نے ہر چند روکا لیکن قبول نہیں کیا۔ جب واپس جانے لگے
 تو حاجی صاحب پیاس ادب پہنچانے کے لئے مدرسہ تک آئے۔ حاجی صاحب جب واپس ہونے
 لگے تو مولانا پھر ان کو رخصت کرنے کے لئے مکان تک آئے۔ تین مرتبہ اسی طرح ہوا تو حاجی صاحب
 اس محبت اخلاق کے قدموں پر گر پڑے ۱۵

مولانا آخون شیر محمد | مولانا آخون شیر محمد، افغانستان کے رہنے والے تھے۔ تحصیل علم کے لئے دہلی
 آئے۔ تھے۔ شاہ عبدالقادر صاحب کے تلمیذ رشید اور شاہ محمد اسماعیل صاحب کے ہم سبق تھے۔ توکل و
 قناعت کا یہ عالم تھا کہ ایک نیمہ میں گذراوقات کرتے تھے۔ حکیم غلام حسن خاں کے مکان
 پر قیام رہتا تھا۔ اور وہیں شب و روز درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ فیض باطن شاہ
 غلام علی سے حاصل کیا تھا۔ آخر عمر میں درس و تدریس کا سلسلہ بند کر دیا تھا اور صرف قرآن پاک
 کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ آپ اپنے شاگردوں کو تقویٰ کی خاص ہدایت فرمایا کرتے تھے
 جو کوئی آپ کی مجلس میں غیبت کرتا اس پر جرم نامہ کیا جاتا تھا ۱۶

آخر عمر میں ہندوستان کو دارالحرب خیال کر کے یہاں کی سکونت کو مکروہ تصور کرنے
 لگے تھے۔ اور حرمین الشریفین کی طرف چل دیئے تھے۔ لیکن ابھی ملتان تک ہی پہنچے تھے
 کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ کے صدہا خلفائے ۳۵ میر طالب علی، المستہربہ مولوی عبدالغفار، سید عبداللہ مغربی،

۱۵ مزارات اولیاء دہلی ص ۱۵۔ ۱۶ مشائخ نقشبندیہ مجددیہ ص ۳۵۸۔

ملا پیر محمد، ملا گل محمد، مولوی محمد جان، محمد عظیم، شیخ خلیل الرحمن وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان علماء کے علاوہ اس زمانہ میں دلی میں اور بہت سے بزرگ تھے جن کے علمی تبحر اور اور تقدس نے دلی کو رشک بغداد و مصر بنادیا تھا۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے شیع علم کے پروانے دلی میں جمع ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنت کی تجہیز و تکفین کے آخری منازل طے ہو رہے تھے۔ علمی دنیا میں رونق آرہی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب کے علم و فضل، تقویٰ دیانت کا تمام ملک میں شہرہ تھا۔ مولانا کریم صاحب، مولانا فضل امام صاحب، مولانا فضل حق صاحب، مولانا نور الحسن صاحب، مولوی کرامت علی صاحب، مفتی رحمت علی خاں عرف میر لال، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، حاجی محمد، ملا سرفراز اپنے اپنے فن میں یگانہ تھے۔ ان کی موجودگی نے دلی کو زوال کے زمانہ میں وہ عظمت و شوکت بخشی تھی کہ ہندوستان کی عزت و شہرت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ سارے ملک کا ادبی مرکز دلی تھی یہاں علم و عرفان کی پیاس بجھانے والے یہ جید علماء اپنے اپنے فن میں وحید عصر اور یگانہ روزگار تھے۔

مذہبی ابدن و حافی دنیا سے قطع نظر سینکڑوں شعرا، حفاظ، اطباء، دہلی میں موجود تھے۔ مومن و غالب کی دلی، غدر سے پہلے ہی کی دلی تھی۔ قاری قادر بخش، حافظ احمد، قاری محمد بیگ کی دلکش قرارت، غدر سے پہلے ہی، دلی کے منبر و محراب نے سنی تھیں۔ اب تو

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت لے سیلج

دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

(حالی)

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے لکھے ہوئے قرآن کریم

از جناب ڈاکٹر محمد عبدالغنی چغتائی ڈی. لٹ (پیرس)

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی (۱۵-۱۸ نومبر ۱۹۶۷ء) کی نمائش میں راقم کو بھی حصہ لینے کا اتفاق ہوا۔ اس اہم نمائش کی خوبیاں ماہرین تعلیم یا معلم ابتدائی و ثانوی تعلیم اور ان کے علاوہ ماہرین فنون لطیفہ اسلام کے لئے بیشمار ہیں جن پر الگ مضمون درکار ہے مگر فی الحال مجھے یہاں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے کیونکہ اس غلط فہمی کی بنا پر نادائق حضرات ہی نہیں بلکہ بعض پڑھے لکھے لوگوں سے بھی اکثر سننے میں آتا ہے کہ انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر کا لکھا ہوا قرآن کریم دیکھا ہے یا ان کے کتب خانہ میں ہے جو بالکل بے بنیاد دعوے ہیں۔

اس نمائش میں ہمارے ایک بزرگ خان بہادر نے قرآن کریم کے دو قلمی نسخے پیش کئے ایک کے ساتھ قرآن کریم قلمی یا قوت مستحسی "نور دوسرے کے ساتھ قرآن کریم شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر" عبارتیں لکھ کر آئینہ دار الماری میں رکھا ہوا تھا۔ اول الذکر پر تو پھر کبھی عرض کرونگا مگر فی الحال مؤخر الذکر پر عوام کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کچھ عرض کرتا ہوں۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک پڑھا لکھا آدمی جو تاریخ دانی کے لئے بھی مشہور ہے اس طرح کے ادعا کی کیسے جرأت کر سکتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اورنگ زیب عالمگیر کی ذاتی تاریخ عہد کی روشنی میں اس ضمن میں چند الفاظ لکھے جائیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نسخہ قرآن کریم کے آخر میں کچھ عبارت عربی میں اورنگ زیب کی اپنی لکھی ہوئی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے

اور وہ صرف ونحو کے اعتبار سے غلط ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے اس نے غلط عبارت تحریر کی ہو اور یہ قرآن ضرور اسی کا ہے، یہ امر بے حد تعجب و حیرت کا باعث ہے۔
اورنگ زیب عالمگیرؒ کے متعلق یہ امر بغیر کسی تاریخی ثبوت بہم پہنچانے کے مسلم ہے کہ وہ سب سلاطین مغلیہ میں زیادہ عالم فاضل تھا تاہم اس کے عہد کی تاریخ عالمگیر نامہ یا مآثر عالمگیری کی طرف رجوع کرنا چاہئے چنانچہ محمد کاظم مولف عالمگیر نامہ رقمطراز ہے:-

”از کمالات کسبہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات قدسیہ و مہیبہ گشتہ تتبع علوم دینیہ از حدیث و تفسیر عربیہ و فقہ شریف حنفیہ است۔ و بیاری از کتب طریقت و سلوک و اخلاق چوں احیاء العلوم و کیمیائے سعادت و دیگر تصانیف عرفا و اکابر و رسائل و ملفوظات علماء باطن و ظاہر بمطالعہ ہمایوں رسید، حل معضلات و کشف اسرار آں فرمودہ اند۔ و بالفعل نیز بعد فراغ از نظم ہمام سلطنت و سروری و تمہید مراسم دین پروردی و عدالت گستری بایں شرائف اشغال پیوستگی دارند“

اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کے ذاتی کسی کمالات میں علوم دین از حدیث و تفسیر عربیہ و فقہ شریف حنفیہ تھے اور بہت سی کتب اخلاق پر مثلاً احیاء العلوم و کیمیائے سعادت وغیرہ کا مطالعہ امور سلطنت سے فارغ ہو کر کرتے تھے ان میں دیگر تصانیف اکابر علماء باطن و ظاہر از قسم رسائل ملفوظات بھی شامل تھے۔

اسی طرح آگے چل کر یہی محمد کاظم حفظ قرآن کریم کے ضمن میں رقمطراز ہے:-
”توفیق حفظ تمام کلام مجید ربانیست۔۔۔۔۔ و ہم اسرار و نکات آں بر لوحہ حافظہ اخترف کہ لوح محفوظ اسرار غیبی است مرقم گشت چنانچہ تاریخ شروع آں حفظ شریف را

حروفِ کریمہ "سنقرنگ فلاتنسی" بحبابِ حمل پردہ از رخ می کشاید و تاریخِ اتماش

از اعداد "لوح محفوظ" جلوہ ظہور می نماید۔

یعنی بقول مورخ آپ کو امورِ سلطنت سے اول اول وقت کم ملاحس کی وجہ سے کلامِ پاک کو سلطنت سنبھالنے سے پیشتر حفظ نہیں کر سکے چنانچہ بعد جلوسِ بڑارنگ سلطنت حفظِ قرآن کریم کی طرف توجہ کر کے تھوڑے سے عرصہ میں حفظ کیا اور قرآن کریم کے الفاظ "سنقرنگ فلاتنسی" سے شروع کرنے کی تاریخ نکلتی ہے جو قریب ۱۸۷۵ء کے مطابق ہیں اور اسی طرح تاریخِ اختتامِ بحبابِ حملِ قرآن کے الفاظ "لوح محفوظ" سے نکلتی ہے جو ۱۸۷۵ء کے مطابق ہے۔ اس سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب کو کس قدر علومِ دین اور قرآن کریم سے شغف تھا اس سے اس کی عربی دانی کا بھی تصور ہو جاتا ہے جو نہایت اعلیٰ معیار پر تھی پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ غلط عربی عبارت تحریر کرے جو بالکل بے بنیاد بہتان ہے۔

اس کے بعد ہم جب اورنگ زیب عالمگیر کے حسنِ تحریرِ خط کی طرف توجہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ استادانِ اقلیمِ سبع اس تک رسائی نہیں کر سکتے تھے آپ کا خط نسخ یا قوت (مستعصمی) اور (عبد اللہ) صیرفی کے خط نسخ کا مقابلہ کرتا تھا وہ پختگی، خوبصورتی اور ثنات و کمال کے اعتبار سے اپنا ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ مشہور ہے کہ قرآن مجید کی کتابت اورنگ زیب عالمگیر کا ایک نہایت محبوب مشغلہ تھا۔ اور اس کی یہ عادت اس قدر مشہور ہوئی کہ عام طور پر بیان کئے جانے لگا کہ اورنگ زیب قرآن لکھ کر روزی کھاتا تھا اور مکہ مکرمہ ارسال کرتا تھا جس سے اس کے صاحبِ ریاضت ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس ضمن میں مورخین کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:-

”در ایامِ میمنت انجام بادشاہزادگی معصی مجید بخط مبارک صورتِ اتمامِ وادہ آں را

بادگیر شرافت تحف درغائب و مبلغی خطیر بہم نمد و آئین نیاز بکہ معظمہ و کعبہ مشرفہ

زاد اللہ قدر او جلالتہ فرستادند

بعد جلوس بر سر ریسلطنت تھوڑے عرصہ میں اور قرآن کریم تحریر کئے۔

”وہ اندک وقتے بدستیاری تا یہود و دگاری بخت سعید جلدے دیگر از مصحف مجید

باتمام رسانیدہ

”قرآن مجید بخط اقدسی کہ مبلغ ہفت ہزار روپیہ و جدول و جلد آں صرف شدہ

بمدنہ منورہ سرسل شدہ“

یعنی عالمگیر نے قبل سلطنت قرآن مجید کا ایک نسخہ لکھ کر مکہ معظمہ ارسال کیا اور تخت نشینی کے بعد قرآن لکھے، ان کو مدنیہ منورہ ارسال کیا۔ مبلغ سات ہزار روپیہ ان کی جلد بندی اور جدول کی زیب زینت میں صرف فرما کر مدنیہ منورہ حرم نبوی صلعم کے اندر بطور نذر رکھا دیئے۔ ان معاصر مورخین کی تحریروں سے اور نگ زیب عالمگیر کے حسن مذاق خطاطی اور پھر اس پر زور کثیر خرچ کر کے اس کو مزین کرنا اس بات کی بھی تردید کرتا ہے جیسا کہ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ وہ فنون لطیفہ کے صحیح مذاق و عاری تھا بلکہ اس کی عام دلغری کا اس کو پورا احساس تھا۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیوں پڑے لکھے لوگ اور نگ زیب عالمگیر کے لکھے ہوئے قرآن کریم کہہ کر دوسروں کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں جبکہ اس کے لکھے ہوئے قرآن کریم کے نسخے مکہ مکرمہ اور مدنیہ منورہ کے لوگوں کے ملاوت کے لئے وہاں پہنچ چکے ہیں اور وہاں بھیجے ہوئے مطلقاً و مذہب نسخوں کے کبھی پھر ہندوستان واپس آنے کی شہادت تک بھی نہیں ملتی۔

اب یہ قرآن کریم کے وہ نسخے جو آج مختلف لوگوں کے پاس یا بعض کتب خانوں میں موجود ہیں اور نگ زیب عالمگیر کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں تو متذکرہ بالا بیان کی روشنی میں تاریخی حقیقت

وہ صحیح ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے ہاں یہ ممکن ہو کہ ان دو تین قرآن کریم کے نسخوں کے علاوہ جو مکہ و مدینہ ارسال کئے گئے تھے عالمگیرؒ نے کچھ اور قرآن بھی لکھے ہوں اور وہ لوگوں کے پاس ہوں اور ان پر آج دستخط وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ اس دعوے کی تردید میں ہم اورنگ زیب عالمگیرؒ کا اپنا ایک رقعہ پیش کرتے ہیں جو نام شہزادہ ہے اور آخر ایام کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے بالوضاحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیرؒ نے ایک دو قرآن کریم صرف رضائے الہی حاصل کرنے کیلئے لکھے تھے اور اسی وجہ سے اس نے ان پر تاریخ کتابت اور اپنا نام تک نہیں لکھا تھا رقعہ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

”..... چہ بنو سیم وجہ بگوئم خجالت و انفعال این نام بہد نامے گفتہ تا نوشتن

اسم برسم آں برسم اولی و انسب۔ من یک دو مصحف کہ نوشتہ ام نام نوشتہ ام

تاریخ ہم نوشتن در کار نیست۔ اگر برائے اوسمانہ نوشتہ اند علم اوحسی و کفی۔۔۔“

اورنگ زیب عالمگیرؒ کا یہ رقعہ رقیات عالمگیری کے اس نسخہ میں درج ہے جو میری ملکیت

میں ہے اور جس پر ”کلمات طیبات“ لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کی تقطیع چھوٹی ہے اور اس رقعہ کا نمبر

۱۲۳ سرخ سیاہی سے لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ رقعہ رقیات عالمگیری کے دوسرے مجموعوں میں بھی مل جائے

اب اس متذکرہ بالا بیان کے بعد جس کو معاصر مورخین کی تحریروں کے علاوہ اورنگ زیب

عالمگیرؒ کی اپنی ذاتی تحریر سے واضح کر دیا گیا ہے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عالمگیرؒ نے قرآن کریم ضرور

لکھے لیکن ان کو مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ ارسال کر دیا گیا اور ان پر نام و تاریخ نہیں لکھے گئے۔ امید ہے

اب لوگ اس کی طرف کسی قرآن کے نسخہ کو منسوب کرنے سے اعراض کریں گے۔

یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اورنگ زیبؒ کی علمی فضیلت اور عربی و فارسی میں اس کی

بہارت کا اعتراف ہندو مورخین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ عہد عالمگیری کے نامور مورخ سر جادوناث

سرکار لکھتے ہیں۔

• اورنگ زیب عربی اور فارسی ایک فاضل و محقق کی طرح ہونا اور لکھنا تھا۔

(History of Aurangzeb Based on Original Sources. R4)

پس ارباب نظر خود انصاف کریں کہ قرآن مجید کے کسی نسخہ کو عالمگیری کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرار دینا۔ حالانکہ ختم قرآن پر جو عربی عبارت عالمگیری کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور جس کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ خود بادشاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ عربی نحو و صرف کے قواعد کی رو سے غلط ہے۔ کیونکہ قرین انصاف اور لائق قبول ہو سکتا ہے۔

فیض الباری

(مطبوعہ مصر)

فیض الباری نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کی مشہور ترین اور مائتہ ناز کتاب ہے، شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ جو اس صدی کے سب سے بڑے محدث سمجھے گئے ہیں فیض الباری آپ کی سب سے زیادہ مستند عظیم الشان علمی یادگار ہے۔ جسے چار ضخیم جلدوں میں دل آویزی و دل کشی کی تمام خصوصیتوں کے ساتھ مصر میں بڑے اہتمام سے طبع کرایا گیا ہے فیض الباری کی حیثیت :- امام مرحوم کے درس بخاری شریف کے امانے کی ہو جس کو آپ کے تلمیذ خاص مولانا محمد بدیع عالم صاحب رفیق ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑی قابلیت و بیہ ریزی اور جانکاہی سے مرتب فرمایا ہے حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کے علاوہ فاضل مولف نے جگہ جگہ تشریحی نوٹوں کا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب کی افادہ حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ مکمل چار جلدوں کی قیمت سولہ روپے

مکتبہ برہان دہلی قریل باغ

انڈونیشیا میں سیاسی کشمکش

جناب مظفر شاہ خاں صاحب ایم۔ اے

ایشیا اپنی گہری نیند سے جاگ چکا ہے اور اس میں نئی زندگی کی لہر دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔ ایشیا کی سب چھوٹی بڑی قومیں اپنے آزاد مستقبل کے لئے بے چین ہو رہی ہیں۔ اور ان کے دلوں میں آگے بڑھنے اور دنیا کی عام ترقی میں برابر کا حصہ لینے کی آرزوئیں تڑپ رہی ہیں اور وہ مغربی اثر و اقتدار کا جوا اتار کر اپنی آزادی اور خود مختاری کے جائز حق کو حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ مشرق بعید سے لے کر مشرق وسطیٰ تک ہر جگہ ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ حالات کا رخ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے، مغربی شہنشاہیت کے بادل چھٹتے جاتے ہیں اور آزادی کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مشرق کے افق پر نکلتا آ رہا ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا میں جن ملکوں نے بیرونی اقتدار کے خلاف جدوجہد شروع کی، ان میں انڈونیشیا پیش پیش ہے، انڈونیشیا میں بڑی تیزی سے قومی تحریک نے زور پکڑا اور اپنی آزاد اور خود مختار جمہوریت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

انڈونیشیا میں کوئی تین ہزار سے زیادہ جزیرے شامل ہیں۔ جن میں جاوا اور سمارا دو خاص جزیرے ہیں، جغرافیائی اعتبار سے یہ جزیرے دنیا میں سب سے خوبصورت اور مالدار جزیرے گنے جاتے ہیں، کیونکہ یہ قدرتی خزانوں سے مالا مال ہیں۔ ساری دنیا کی مختلف پیداواریں انڈونیشیا کا جو حصہ

ان کا فیصدی حساب یہ ہے، کوئین ۹۱ فیصدی، ربر ۴۴ فیصدی۔ تانبہ اکیس فیصدی۔ چائے انیس فی صدی، کوکوائٹیس فی صدی۔ تین بیس فیصدی۔ سیاہ مرچ بانوے فیصدی۔ تبا کو پچاس فیصدی، شکر پچیس فی صدی اور کپاس اکہتر فیصدی۔ لیکن قدرت کے ان بیش بہا خزانوں میں انڈونیشیا والوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اب تک ان کا یہی کام رہا کہ اپنے ملک کی دولت سے دنیا کو فائدہ پہنچائیں اور خود مصیبت کی زندگی گزاریں، خود بھوکے ننگے رہ کر اپنے آقاؤں کی سرمایہ داری کو فروغ دیں۔ انڈونیشیا کی عام زبوں حالی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہاں کی تقریباً شتر فیصدی آبادی کا گزارہ چاول کی معمولی کاشت پر ہے۔ ان میں بہت سے لوگ صرف مچھلیاں پکڑ کر یا جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں، پیالہ بھر چاول اور مچھلی کا شوربہ ان کی عام غذا ہے۔ ان لوگوں کی سالانہ آمدنی کا اوسط کوئی تین پونڈ یا چالیس روپے ہے، تیس فیصدی باشندے لڑائی سے پہلے تیل کے کنوؤں، بڑے بڑے باغیچوں اور کانوں میں معمولی مزدوروں کی طرح کام کیا کرتے تھے ان لوگوں کی آمدنی کا اندازہ کوئی ۱۳ پونڈ یا ۱۷۵ روپے سالانہ ہے۔ غرض دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ قدرتی دولت انڈونیشیا والوں کے لئے مصیبت کا سامان بن گئی۔ سرمایہ دار قوموں نے ان سرمایہ دارانہ غرضوں کے لئے انڈونیشیا میں قدم جمائے اور رفتہ رفتہ سیاہ و سفید کی مالک بن بیٹھیں۔

سب سے پہلے سو اہویں صدی کے شروع میں پرتگالیوں نے انڈونیشیا کی سرزمین پر قدم رکھے، اس کے بعد دوسری یورپی قوموں کی آمد کا تانتا بندھ گیا اور یکے بعد دیگرے، اسپینی، فرانسیسی، ڈچ اور انگریز پہنچے رہے۔ پہلے پہل تو انڈونیشیوں نے ان لوگوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا کیونکہ ان کے ذریعہ انڈونیشیا کی تجارت اور کچے مال کی کھپت کے راستے کھل گئے۔ لیکن ان قوموں نے پہنچے جا کر ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے تو انڈونیشیوں کی آنکھیں کھلیں اور ان میں قومیت کا جذبہ بیدار ہوا۔

اور وہ بیرونی طاقتوں کے خلاف متحد ہونے لگے۔ اس بیداری نے آئندہ سیاسی تحریک کے لئے راستہ ضرور تیار کیا۔ لیکن انڈونیشیا کی باقاعدہ قومی تحریک تئیں دور کی پیداوار ہے اس سے پہلے وہاں کسی باقاعدہ سیاسی تحریک کا وجود نہ تھا۔ قومی امنگیں بیدار ضرور ہو چکی تھیں مگر انھوں نے کوئی واضح صورت اختیار نہیں کی تھی۔

انڈونیشیا کی پہلی عظیم تحریک کی ابتدا بیسویں صدی کے شروع میں ہوئی، ۱۹۰۵ء میں روس کے خلاف جاپان کی فتح اور جاپان کی نئی زندگی، ۱۹۱۲ء میں چینی جمہوریت کا قیام، ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب اور فلپائن اور ہندوستان کے دوسرے واقعات، پھر خود انڈونیشیا کی اندرونی بیداری، ان سب چیزوں نے مل جل کر انڈونیشیا کی قومی تحریک پر اچھا اثر ڈالا اور وہ روز بروز زور پکڑتی چلی گئی۔ اس طرح انڈونیشیا والوں کی ہمت بندھی اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی۔ غیر ملکیوں کے ہاتھوں انڈونیشیوں کو جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا اس سے بھی ان میں سیاسی شعور پیدا ہوا، غرض اندرونی اور بیرونی حالات کچھ اس طرح بدل چکے تھے کہ ان کا نتیجہ قومی بیداری کی صورت میں ظاہر ہونا لازمی تھا۔

سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں ”شرکت ڈانگک اسلام“ کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم ہوا اور اس کے بعد اسی قسم کی اور بہت سی جماعتیں فلاح دہبودی کے لئے قائم ہوتی رہیں اس وقت تک ان جماعتوں کا براہ راست سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کا پہلا مقصد یہ ہی تھا کہ انڈونیشیا کی قومی تجارت کو بڑھایا جائے اور عام لوگوں کی اقتصادی حالت سدھاری جائے لیکن جوں جوں سیاسی بیداری پھیلتی گئی، ان جماعتوں کا رخ بھی بدلتا گیا، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں ”شرکت ڈانگک اسلام“ کا نام بدل کر ”شرکت اسلام“ رکھا گیا اور پھر اس میں دوسری اسلامی جماعتیں بھی شامل ہو گئیں،

شرکت اسلام کے ماتحت پہلی قومی کانگریس جولائی ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ اس کانگریس میں شرکت اسلام کو ایک مستقل سیاسی جماعت کی حیثیت دیدی گئی اور انڈونیشیا میں خود مختار حکومت اور آزادی کا قیام اس کا مقصد قرار پایا، سال بھر بعد یعنی ۱۹۴۷ء میں مکمل آزادی، اس کا نصب العین بن گیا اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سیاسی جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس وقت انقلاب کی بجائے تدریجی اصلاح کا راستہ مناسب سمجھا گیا۔ چنانچہ شرکت اسلام اور دوسری پارٹیوں کی طرف سے حکومت کے کام میں زیادہ سے زیادہ اختیار دینے کا مطالبہ کیا جانے لگا اور سب جماعتیں پارلیمانی طریقوں کو اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھنے لگیں۔

بالآخر مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۸ مئی ۱۹۴۸ء کو حکومت کی طرف سے Volksraad کے نام سے ایک مجلس تنظیم قائم کی گئی، اور اس میں مختلف پارٹیوں کے نمائندے شامل کئے گئے، لیکن آگے چل کر انڈونیشیوں کو پتہ چلا کہ آئینی طریقوں سے وہ کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکے اب انھوں نے Volksraad سے باہر آ کر براہ راست تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح انڈونیشیا کی جنگ آزادی کا انقلابی دور شروع ہوا۔

انڈونیشیا میں ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی حصہ میں کیونسٹ اثرات کو کافی فروغ، غریب اور امیر کی کشمکش کی ابتدا تو پہلے ہی ہو چکی تھی، سب سے پہلا اسٹرائک ۱۹۴۲ء میں Soerakarta میں ہوا۔ پھر ۱۹۴۷ء کے بعد سے انڈونیشیا کے سارے بڑے شہروں پر اسٹرائک ہونے لگے اور مزدوروں کی تحریک شروع ہو گئی، جگہ جگہ مزدوروں کی جماعتیں بننے لگیں اور انھوں نے اپنے مطالبات کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کر دی۔ اب تو سارے انڈونیشیا اسٹرائک کی ہوا پھیل گئی اور حکومت کی طرف سے سخت قسم کی جوابی کارروائی ہونے لگی۔

انڈونیشیا کے جوانوں پر تعلیم پارہے تھے، انہوں نے بھی آزادی کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی، ان لوگوں نے وطن واپس آکر انڈونیشیا کی سب سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی، پھر انہوں نے اپنی ایک قومی جماعت بھی بنائی، جس کا نصب العین انڈونیشیا کی "مکمل آزادی" رکھا گیا، اس پارٹی کے قیام کے بعد سے انڈونیشیا کی قومی تحریک میں اور جان آگئی، دوسری طرف ڈاکٹر سوکارنو اپنی متواتر کوششوں کے بعد انڈونیشیا کی تمام جماعتوں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے اور سب جماعتوں کا ایک وفاق (فیڈریشن) قائم ہو گیا۔ اب یہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ جب تک عوام کی طرف سے پرزور متفقہ آواز نہیں اٹھائی جائے گی۔ اس وقت تک کسی قسم کی آئینی تبدیلی ممکن نہیں، چنانچہ اب انڈونیشیا کی سیاسی تحریک کا ایک نیا دور شروع ہوا اور عدم تعاون کی بجائے تعاون کے ساتھ قومی امنگوں کو پورا کرنے کی کوشش ہونے لگی۔

۱۹۳۹ء میں جب دنیا نے ایک نئی کروٹ بدلی اور چاروں طرف جنگ کے خوفناک بادل منڈلانے لگے۔ تو انڈونیشیا میں بھی عام بے چینی پیدا ہوئی، ۲۱ مئی ۱۹۳۹ء کو تمام سیاسی پارٹیوں کی کانفرنس بلائی گئی تاکہ ایک مشترک قومی محاذ قائم کیا جائے۔ اس کانفرنس نے ایک ایسی پارلیمنٹ کے قیام کا بھی مطالبہ پیش کیا۔ جس کے سارے ممبر عوام کے چنے ہوئے ہوں ساتھ ہی ایک قومی حکومت بھی بنائی جائے جو اس پارلیمنٹ کو جوابدہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح انڈونیشیا والوں میں قومی شعور بڑھ جائے گا اور وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ انڈونیشیا کے دفاع کی کوشش کریں گے، جس سے ملک کی دفاعی حیثیت بہت مضبوط ہو جائے گی کیونکہ جب کسی قوم میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں دبا سکتی۔ انڈونیشیا میں جگہ جگہ اس جائز مطالبہ کی تائید و حمایت کی گئی۔ خاص کر جوانوں نے بڑے پُر جوش طریقہ پر

اس کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ اس وقت انڈونیشیا کا نوجوان طبقہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور قومی ترقی کے لئے متحد ہو کر کام کر رہا تھا۔ ڈچ حکومت نے نازک حالات کو سوچے بوجھ کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور انڈونیشیا کے اس متفقہ مطالبہ کو نامنظور کر دیا۔

۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کو جرمن فوج نے ڈچ نازیوں کی مدد سے ہالینڈ پر حملہ کیا اور ڈچ حکومت اس حملہ کی تاب نہ لا سکی اور اس نے بھاگ کر انگلستان میں پناہ لی۔ ہالینڈ کی اس شکست کے بعد خود بخود انڈونیشیا سے اس کا تعلق ختم ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ قاعدہ کے مطابق اب انڈونیشیا ایک آزاد ملک تھا، کیونکہ ہالینڈ کی بادشاہت ختم ہو چکی تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ حکومت کے سارے اختیارات گورنر جنرل کے ہاتھ میں آ گئے اور اب وہ ملکہ ہالینڈ کی طرف سے انڈونیشیا کا واحد مختار تھا۔

اس بحرانی دور میں بھی انڈونیشیا کی اندرونی حکومت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی صرف ڈچ حکومت کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ جب ہالینڈ آزاد ہو جائے گا تو انڈونیشیا کی آئینی تبدیلی کے مسئلہ پر غور کیا جائے گا، اس مضحکہ خیز وعدے کا انڈونیشیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور ان کا ”خود مختار حکومت“ کا مطالبہ روز بروز زور پکڑتا گیا۔

پرل ہاربر کے حملہ کے بعد لندن میں ملکہ ہالینڈ نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اسی دن انڈونیشیا کے گورنر جنرل نے بھی اسی قسم کا اعلان کیا۔ گویا اب انڈونیشیا کو بھی اس کے باشندوں کی مرضی معلوم کئے بغیر لڑائی میں دھکسل دیا گیا۔ انڈونیشیا والے پہلے ہی سے نازیت اور فسطائیت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو خطرے کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اب جو بحر الکاہل میں جمہوریت کے خلاف بھرپور لڑائی چھڑی تو ان کے خطرات اور بڑھے کیونکہ اس وقت لڑائی ان کے سر پر آ گئی تھی۔ جب جاپانی فوجیں انڈونیشیا پر بڑھیں اس وقت

انڈونیشیا کے بے تاج بادشاہ ڈاکٹر سوکارنو، سماترا میں قید تھے، ڈچوں سے کہا گیا کہ ایسے موقع پہ ڈاکٹر سوکارنو کو فوراً چھوڑ دیا جائے، تاکہ وہ پوری قوم کو جاپانیوں کے خلاف تیار کر سکیں، اور جاپانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جاسکے، لیکن ڈچوں کے کان پر جوں نہیں رہی۔ اور ڈاکٹر سوکارنو جاپانیوں کی آئندہ قید میں پڑے رہے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۴۲ء کو جاپانیوں نے بورنیو کے علاقے ہرمباری کی۔ اس کے بعد کئی جگہ خوفناک جنگ ہوئی، انڈونیشیوں نے بڑی بہادری کے ساتھ جاپانیوں کا مقابلہ کیا اور زبردست خونریزی ہوئی لیکن جاپانی اپنی فوجی اکثریت اور بڑی طاقت کی وجہ سے غالب آئے اور پھر انڈونیشیا پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس پر بھی انڈونیشیوں نے ہمت نہیں ہاری، بلکہ ان کے دلوں میں آزادی کا جذبہ اور بھڑک اٹھا، وہ اب بھی جاپانی شہنشاہیت کے خلاف لڑنے کو تیار تھے۔

جاپانیوں کو انڈونیشیا کی قومی تحریک کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا، اسی لئے وہ انڈونیشیا کا اندرونی انتظام انڈونیشیوں کو سپرد کرنے پر تیار ہو گئے۔ اور ایک عارضی حکومت بنادی گئی۔ دراصل اس وقت جاپانی یہ چاہتے تھے کہ اپنی جنگی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے انڈونیشیا کے قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھائیں۔ اور یہاں کے لوگوں سے اپنا کام لیں۔ اسی لئے انھوں نے انڈونیشیوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ انڈونیشیا کے دفاع کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں لیکن انڈونیشی جاپانیوں کے اس فریب میں آنے والے نہ تھے، وہ ڈچوں کی طرح جاپانہوں کو بھی اپنی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے، چنانچہ اب انھوں نے جاپانیوں کے چنگل سے آزاد ہونے کے لئے خفیہ تحریک شروع کر دی۔

۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر سوکارنو نے گودیل فوج تیار کرنے کا کام شروع کیا اور جاپانیوں

کو بتایا کہ ہم اتحادی حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ انتظام کر رہے ہیں اس طرح ڈاکٹر سوکار نے درپردہ جاپانیوں کے خلاف ایک زبردست انقلاب برپا کرنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ یوں ظاہرہ طور پر ڈاکٹر سوکار نے جاپانیوں سے صرف اس لئے تعاون کر رکھا تھا کہ وہ آسانی سے ان کے خلاف تیاری کر لیں ورنہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جاپانیوں اور ڈچوں میں کوئی فرق نہیں۔

۱۹۴۵ء کے شروع میں جاپانیوں کا زوال شروع ہوا اور وہ ہر جگہ اتحادیوں کے مقابلے میں پسپا ہونے لگے، جب انڈونیشیوں کو معلوم ہو گیا کہ جاپانی لڑائی ہارتے جارہے ہیں تو انھوں نے کھلم کھلا جاپانیوں کو اپنے ملک سے نکلنے کی تحریک شروع کر دی، اور سینکڑوں نوجوان اپنے وطن کی آزادی کے لئے میدان میں آ گئے۔

آخر توقع سے پہلے ہی جاپانیوں کے خاتمہ کا دن آپہنچا۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۵ء کو ہیردو شتر پر پہلا ایٹم بم پڑا، اور وہ بالکل بھسم ہو کر رہ گیا۔ دو دن بعد ناگاساکی بھی ایٹم بم کا شکار ہوا، اور اس کے بعد فوراً ہی روس نے بھی جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، جاپان ان ناگہانی آفتوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس نے مجبور ہو کر ۵ اگست ۱۹۴۵ء کو اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور ہار مان لی۔ انڈونیشیوں نے وقت سے پورا فائدہ اٹھایا، ان کے لیڈروں نے قومی فوج کی مدد سے جگہ جگہ اپنا قبضہ جانے کی کوشش شروع کر دی، ان لوگوں نے بہت سے ہتھیار اور گولہ بارود بھی چھین کر اپنے قبضہ میں کر لیا۔ دوسری طرف جاپانی افسروں کی انتہائی سختی اور کھلی مخالفت کے باوجود انڈونیشیوں نے ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو انڈونیشیا کی آزاد جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ ڈاکٹر سوکار نے جمہوریت کے پہلے صدر مقرر ہوئے، ساتھ ہی جمہوری اصولوں کے مطابق انڈونیشیا کے آئین کا ایک مسودہ بھی تیار کیا گیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ انڈونیشیا میں جمہوریت کا تصور کوئی نیا نہ تھا۔ انڈونیشیا میں صدیوں پہلے سے دیہات میں پنچایتی نظام چلا آ رہا تھا اور ہر علاقے کو کچھ نہ کچھ خود مختاری حاصل تھی، ان کی اقتصادی زندگی امداد یاہمی کے اصول پر مبنی تھی۔

جمہوریت کے اعلان کے فوراً ہی بعد ایک کانفرنس بلائی گئی، جس میں انڈونیشیا کی سب پارٹیوں کے لیڈر شریک ہوئے۔ اور ہر علاقے کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ اس کانفرنس کا جلسہ دو دن تک ہوتا رہا۔ کانفرنس میں یہ طے پایا کہ ایک قومی کمیٹی بنائی جائے جو انڈونیشیا کے سارے انتظام کی ذمہ دار ہو۔ گویا یہ ایک ایسی مجلس انتظامیہ بنی جسے ملک کا سارا کاروبار سونپ دیا گیا۔ قومی کمیٹی نے سب سے پہلے انڈونیشیوں کو ہدایت دی کہ وہ اتحادی فوجوں کو ان کا کام نٹانے میں مدد دیں، کیونکہ اسے امید تھی کہ جتنی جلدی جاپانیوں کو ہٹا کرنے اور اتحادی قیدیوں کو چھڑانے کا کام پورا ہو جائے گا۔ اتحادی فوجیں انڈونیشیا سے چلی جائیں گی۔

۱۹ اگست ۱۹۴۵ء کو قومی کمیٹی کی طرف سے ڈاکٹر سلطان شہریار کو وزارت بنانے کا کام سپرد ہوا، اور انھوں نے ایک باقاعدہ متوازی حکومت قائم کر لی، یہی حکومت صحیح معنوں میں انڈونیشیا کی آزاد اور خود مختار حکومت تھی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ جب مارچ ۱۹۴۲ء میں ڈچ انڈونیشیا جاپانیوں کو کلیتہاً سونپ کر الگ ہو گئے تو پھر انڈونیشیا پر ان کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ اب ہم نے جاپانیوں سے حکومت چھینی ہے اس لئے ہم خود اپنی قسمت کے مالک ہیں۔

لیکن ڈچ اب بھی انڈونیشیا پر اپنا حق سمجھ رہے تھے، اور دوبارہ اپنی حکومت قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ ساری دنیا میں ان کی اس حرکت کو بری نظروں سے دیکھا گیا، لیکن وہ اپنے سامراجی طریقوں سے باز نہیں آئے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند کئے ہوئے تھے کہ اب ساری دنیا کا رنگ بدل چکا ہے۔ دنیا کی ساری دبی ہوئی قومیں ابھر چکی ہیں اور اب انھیں ڈنڈے

کے زور سے غلام نہیں بنایا جاسکتا۔

انڈونیشیوں کو پہچاننے کے لئے ڈچ حکومت نے ۶ دسمبر ۱۹۴۵ء کو ایک نئی اسکیم پیش کی، جس میں مرکزی حکومت کو جمہوری اصولوں پر ترتیب دینے، نسلی فرق ختم کرنے اور انڈونیشیا کو ڈچ سلطنت میں برابر کا درجہ دینے کی تجویزیں رکھی گئی تھیں۔ لیکن ڈاکٹر سوکارنو نے ان تجویزوں کو یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ ان میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس کے بعد ڈچوں نے اپنے سامراج کے دوبارہ قیام کے لئے پوری طاقت سے کام لینا شروع کر دیا ان کی جگہ جگہ قوم پرستوں سے مکر ہوئی اور انڈونیشیا میں پھر ستھیا رہند لڑائی ہونے لگی۔

اتحادی فوجیں بھی اپنی غیر جانبداری کو نہ نبھاسکیں اور وہ بھی امن انتظام کے نام پر انڈونیشیوں کے خلاف کارروائی کرنے سے نہیں چوکیں، حالانکہ اتحادی فوجوں کے افسر اعلیٰ نے برطانوی فوجوں کے انڈونیشیا میں اترتے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ ہم نہایت ایمان داری سے اپنا کام پورا کریں گے اور اندرونی معاملات میں کوئی دخل نہ دیں گے لیکن فوراً اس اعلان میں کچھ اور لفظ بھی شامل کر لئے گئے جن کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تک امن وامان کی ذمہ داری اُن پر ہے جب تک ڈچوں کی حکومت پوری طرح انڈونیشیا پر دوبارہ تسلط نہ چالے۔

اسی کشمکش کے زمانے میں انڈونیشی جمہوریت کے نائب صدر ڈاکٹر عطا محمد نے ڈچوں کو نہایت مناسب مشورہ دیا کہ ان تمام جھگڑوں سے بچنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ڈچ انڈونیشیا کی قوم کی آزاد حیثیت تسلیم کر لیں، اس کے بعد دونوں ملکوں میں تجارتی، اقتصادی اور دوسرے بڑے قسم کے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ انھیں ڈچوں سے کوئی ذاتی مخالفہ نہیں، وہ تو صرف اپنی آزادی چاہتے ہیں، ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے انھیں

ڈچوں سے ہر قسم کے تعلقات قائم رکھنے میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن دوبارہ غلامی کے پھندے میں پھنسنے کو کسی طرح تیار نہیں، ان کا نعرہ ہے۔

”دوبارہ غلام بننے سے برباد ہو جانا بہتر ہے“

انڈونیشی جمہوریت کے صدر ڈاکٹر سوکارنو نے اتحادی قوموں سے بھی اپیل کی کہ وہ انڈونیشیا کے معاملہ میں دخل دیں اور دونوں ملکوں میں سمجھوتہ کرادیں، ان کا خیال تھا کہ اگر امریکہ، روس اور چین دلچسپی لیں اور بیچ میں پڑ کر جھگڑا اٹھانے کی کوشش کریں تو آسانی سے سارے معاملات صاف ہو سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ تک تو ڈچ اپنی ہٹ دہری پر ڈٹے رہے اور انڈونیشیا میں میدان کا رزار گرم رہا۔ انڈونیشی تو عزم کر رہی چکے تھے کہ کسی صورت میں بھی دوبارہ ڈچ راج قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اسی لئے وہ ہر جگہ جان توڑ کر ڈچوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ اپنے پیدائشی حق کے لئے لڑ رہے تھے، ان کا مطالبہ جائز تھا، ان کی آواز جگہ جگہ پہنچی، ساری دنیا اور خاص کر ایشیا میں ان کے مقاصد سے گہری ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور ڈچوں کی جارحانہ کارروائیوں کی سخت مخالفت ہونے لگی۔

بالآخر ڈچوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اب پرانا دور ختم ہو چکا ہے، اور زمانہ کی ہوا بدل گئی ہے، اب قوت کے زور پر کسی چھوٹی سے چھوٹی قوم کو بھی غلام نہیں رکھا جاسکتا، اس لئے انھوں نے انڈونیشی جمہوریت کو تسلیم کر لیا اور سمجھوتہ کی گفتگو شروع کر دی، پہلے تو انڈونیشیا کے لفٹیننٹ گورنر جنرل ڈاکٹر فان موک کے ذریعہ سمجھوتے کی بات چیت ہوتی رہی، لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، اس کے بعد ہالینڈ سے ایک کمیشن جنرل آیا اور انڈونیشی جمہوریت کے نمائندوں اور کمیشن کے ممبروں نے باقاعدہ گفت و شنید کے بعد

سمجھوتہ کا مسودہ تیار کر لیا۔ اسی سمجھوتہ کے مطابق ڈچ حکومت نے انڈونیشی جمہوریت کو باقاعدہ تسلیم کر لیا اور طے پایا کہ ڈچ ایسٹ انڈیز کے سب علاقوں کو ایک فیڈریشن کی صورت میں مجتمع کر دیا جائے اور اس فیڈریشن کا نام ہو "ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا" اس کے بعد ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا اور ہالینڈ کی سلطنت کو ملا کر ایک یونین بنائی جائے۔ یہ یونین ۱۹۴۹ء تک قائم ہو جانی چاہئے۔ "ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا" کا مشترک آئین بنانے کے لئے ایک نمائندہ اسمبلی کی تجویز بھی رکھی گئی، جس میں فیڈریشن کی سب ریاستوں کے منتخب کردہ نمائندے شامل ہوں۔ دفاع اور اہم بیرونی معاملات دونوں ملکوں کی مشترکہ ذمہ داری میں دیکھئے گئے۔

مولانا آزاد کی تازہ ترین علمی اور ادبی تصنیف

غبارِ خاطر

مولانا کے علمی اور ادبی خطوط کا دلکش اور عنبرینر مجموعہ، یہ خطوط موصوف نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانہ میں اپنے علمی محبوب خاص نواب صدیق خان جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو رہائی کے بعد مکتوب الیہ کے حوالے کئے گئے۔ اس مجموعے کے متعاقب اتنا کہ دنیا کافی ہو کہ یہ مولانا ابوالکلام جیسے مجمع فضل و کمال کی تالیف میں اپنے رنگ کی بے مثال تراش قلم ہے ان خطوط کے مطالعہ کے بعد مصنف کے دماغی پس منظر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے سطر سطریوں سے ٹکی ہوئی ہے۔ قیمت مچلے خوبصورت گروپوش جدید ایڈیشن۔ چھ روپے۔

مکتبہ برہان دہلی قزول باغ

اقبال و فسطائیت

از محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ

ڈاکٹر اقبال فلسفی اور شاعر ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ وہ شاعر فلسفی ہیں یا فلسفی شاعر۔ اقبال کے وجود میں قدرت نے اس انداز سے فلسفہ و شاعری کو سمو دیا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ناممکن ہے۔ اقبال کی شاعری اور فلسفہ دونوں بلند ہیں۔ شاعری فلسفہ کی بدولت اور فلسفہ شاعری کی بنا پر۔

غالب اقبال | غالب کے بعد ہندوستان میں اقبال ہی ایسا شاعر ہوا جس کی حکیمانہ بصیرت نے ذرہ سے لیکر آفتاب تک کی ہر چھٹی اور کھلی حقیقت کا جائزہ لیا اس نے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے گوشے گوشے کو ٹٹولا۔ اس کا طائر فکر زمین سے اڑا اور بیک پرواز آسمانوں کی اس نورانی خلوت گاہ تک جا پہنچا جس کے قریب فرشتوں کو بھی پر مارنے کی مجال نہیں۔ یعنی جہاں باطن ظاہر ہے ان بلندوں پر پہنچ کر اقبال نے کہا ہے

ستاروں سے آگے جاں اور بھی ہیں

غالب کی طرح اپنے وسیع خیالات کو عقلی جامہ پہنانے کے لئے اقبال کو بھی اردو کا

دامن تنگ نظر آیا۔

اقبال کی شاعری کے تین دور | ڈاکٹر اقبال کا کلام تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں سے پہلا وہ ہے جس میں انھوں نے پرانے مذاق کی تقلید کے ساتھ ایک نئی وضع بھی قائم رکھی۔ دوسرے

حصے میں اس کی اصل طبیعت اور مذاق کی کرنیں بھڑکتی نظر آتی ہیں اور تیسرے دور میں اقبال کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے ان تینوں حصوں کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔

شروع کے کلام میں بعض رجحانات ایسے بھی ہیں جو آخر تک اقبال کے کلام کی خصوصیت رہے اور آخری دور میں بعض جگہ ایسا انداز بھی اس مفکر شاعر نے اختیار کیا جس کا قیاس بھی اس کی اوائل عمری کا کلام پڑھ کر نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ پہلا دور تجرباتی تھا جب شاعر کا طائر فکر پر تول رہا تھا اور مختلف میدانوں میں اس کا دواہانہ تخیل گامزن تھا۔ یہی زمانہ ہے جب ہندوستان کی پست حالت دیکھ کر اقبال کے دل میں درد اٹھا اس درد کی پہلی کسک سے ”ترانہ ہندی“ ”تصویر درد“ ”نیا سوال“ جیسی دلکش نظمیں شاعر نے لکھیں اور یہ دلی تڑپ بعد میں ”شکوہ“ میں پورے شباب پر نظر آئی۔ لیکن ادبی نقطہ نگاہ سے اس دور کی بہترین نظمیں ”حقیقت حسن“ اور ”آخر صبح“ ہیں نظم کا یہ دلربا طرزِ تخیل کی یہ نازک گلکاریاں غالب کے بعد اقبال کو قدرت نے پوری فیاضی سے عطا کی تھیں اور اس وقت بھی جب اس کا دماغ مذہب و فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا اس کا شاعرانہ دل، دلاویز اچھوتے تخیل کے نت نئے کرشمے دکھا رہا تھا۔

اقبال کے کلام کا دوسرا دور جذبہٴ دینی کی بیداری سے شروع ہوتا ہے یہ وہ زمانہ تھا، جب شاعر تعلیم کے سلسلے میں یورپ گیا تاریخ و فلسفہ کے مطالعہ اور دنیا کے مشاہدے نے اقبال کو شخصی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کے وہ طریقے بتائے جنہیں معلوم کرنے کی اس کو پہلے آرزو تھی مغربی ممالک کی سیاحت اور وہاں کے مفکرین مدبرین سے تبادلہٴ خیالات کرنے کے بعد اسلامی دنیا کی ہستی اور بچاؤ کی دیکھ کر اقبال کے حساس دل پر ایسی کاری ضرب لگی کہ اس چوٹ کے اثر سے وہ تھلا گیا اس نے بیقرار ہو کر بارگاہِ الہی میں شکوہ کیا ”شمع اور شاعر“ ”خضر راہ“ ”طلوع اسلام“

اقبال کی اس جہل کی چوٹ کی آہیں ہیں۔

جیسے جیسے شاعر کا ذہن خودی اور بے خودی کے فلسفے میں ڈوبتا گیا وہ ایک نئی زبان کی ضرورت محسوس کرتا گیا آخر کار فارسی میں اس نے لکھنا شروع کیا۔ مثنوی اسرار اور موز۔
پیام مشرق۔ پس جب باید کرداے اقوام شرق میں اقبال نے شخصیت کی تعمیر کے تمام گر بتائے ہیں لیکن فارسی ہو یا اردو اپنے تمام کلام میں سیاسی اور معاشرتی مسائل پر اس نے زیادہ توجہ دی۔ اقبال نے ان مسائل کا جو حل بتایا ہے اس کے پیش نظر اقبال کو فسطائی شاعر کہنا اس پر پرے درجہ کا ظلم ہے۔ اس کی کئی نظموں میں سواہداری اور ملکیت مٹانے کی خواہش اور کسان و مزدور کو ظلم سے بچانے کی تہا ہے لیکن اس کی انقلاب پسندی کسی سر پھرے ٹولٹ کی بکو اس نہیں ہے نہ اقبال کا پاکیزہ دل روس کی سوشلزم سے متاثر تھا وہ تو اس مساوات اور اخوت کا حامی تھا جس کی تعلیم اب سے تیرہ سو سال قبل ہادی برحق حضرت محمد مصلم نے دی تھی۔ جس کی نظیر اس متمدن زمانے میں شرق سے تا غرب نہیں مل سکتی۔

اقبال نے جس خیال کو لیکر شعر کا جامہ پہنایا وہ قرآن پاک تعلیم تھی اشتراکی تصورات نہ تھے۔ اقبال اپنی انقلابی اسپرٹ کے لحاظ سے ایک حد کے اندر رہتا ہے یہ دھوکا چاند مسلمان نقادوں کو اس لئے ہوا کہ ان سب نے نہ تو اصل اسلام کو سمجھا ہے اور نہ اقبال کی اصل شاعرانہ عظمت کا ہی جائزہ لیا ہے حالانکہ وہ انسان کی انفرادیت اور خود مختاری کا سب سے بڑا علمبردار ہے کہتا ہے۔

فطرت کو خود کے روپر و کر	تسخیر مقام رنگ و بو کر
تاروں کی فضا ہے بیکراہ	تو بھی یہ مقام آرزو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت	جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

اقبال کا یہ شعر اس کی اہل دینی سہمٹ کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر

یہ نواں گونگے سجدے میں جب وقت قیام آیا

اس شعر میں جو روح عمل ہے جو پیغام ہے جو خشکی ہے کیا یہ وہ نہیں ہے؟ کہ اقبال
مسلمانوں کو محض نمازوں تک محدود رکھنا نہیں چاہتا بلکہ وہ اسی استقامت اسی روح جہاد
کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اسلام کی اہل روح ہے، اس کی انقلابی روح کا ہی اعجاز ہے
جو وہ بے ساختہ کہتا ہے۔

تھا رنی گو کلیم میں رنی گو نہیں اس کو تقاضہ روا مجھ پہ تقاضہ حرام

انسان کو اپنی عظمت اپنی بلندی کا اندازہ اس بلند فکر شاعر کے کلام میں ملتا ہے۔

عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں فلاک

قدم قدم پر اقبال انسان کو ہر دام سے آزادی دلانے کی کوشش کرتا ہے۔

پیری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں کچھ کام نہیں بنتا بے جرات رندانہ

مکمل خود مختاری براہ راست عمل کامل انسانی شرف و مجد اور بجلی کی طرح چمکتی ہوئی

حد و جہد ہی تعلیم اقبال کی شاعری کا وہ مخصوص فرض منصبی ہے جو کسی دوسرے شاعر کے کلام
میں ابھی تک نہیں ملتی۔

وہی جہاں ہر تراجس کو تو کرے پیدا یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

اقبال کو ہندوستان کی آزادی اور آبرو کا اتنا ہی خیال تھا جتنا کہ اتحاد کے بڑے سے بڑے

علمبرداروں کو مسلمانوں کو غیرت دلانے بیدار کرنے اور خودی کا جام پلانے سے اس کا اہل مقصد

یہ تھا کہ وہ اپنی اور اپنے دلی والوں کی فکر میں ہندوستان کو آزاد کریں اور اسکو افلاس و نکبت

نجات دلائیں۔ اقبال نے اپنے مذہب اور اپنی ملت کی خاطر قومیت کی مخالفت کی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ قومیت کا تصور کچھ ایسی فضا بنا دیتا ہے جس میں شاعری تو کیسا انسانیت بھی نہیں پنپ سکتی تو میں جنتی ہیں ایثار و خدمت صداقت کے بھرپور جذبوں سے عدل و انصاف و رواداری اور انسانیت کی قدر پہچاننے سے اس کے لئے دلوی کی ضرورت ہے نہ نعروں کی ہم میں کام کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو ظاہری ڈھونگ بیکار رہے۔ دنیا میں اقبال نے اپنے کلام کی بدولت شہرت پائی لیکن اس کی با عظمت شخصیت کا بھروسہ صرف ایک شعر کہنے کی صلاحیت پر نہ تھا وہ اتنا بڑا مفکر اتنا فلسفی اور ایسا تبحر عالم تھا کہ مشرق و مغرب میں شاید ہی کوئی اس جیسا جامع صفات انسان اب پیدا ہو سکے، اقبال کا مطالعہ اتنا وسیع اور متاثرہ ایسا عمیق تھا کہ شاعری اور فلسفہ دونوں مل کر بھی اس کا حوصلہ پورا نہ کر سکے وہ بذات خود ایک پورے ادارے کی حیثیت رکھتا تھا ایک جانب اس کا دماغ مشہور جرمن مفکر ٹیٹس سمیت متاثر تھا تو دوسری جانب مولانا روم کے فلسفہ کا والہانہ رنگ اقبال کو اپنے میں جذب کر چکا تھا اس لئے وہ جو کچھ بھی کہتا تھا اس میں حکمت و فلسفہ شعر و ادب کا بہترین امتزاج ہوتا تھا اور اس کی بتائی ہوئی راہ صراطِ مستقیم کی حیثیت رکھتی تھی۔ اقبال کی تصانیف میں شاہین کا فقرو درویش ہونا، زردشت کے وعظ سے بہت قریب ہے جس میں وہ اپنے کو ہستانی نشیمن کو اس لئے پسند کرتا ہے کہ وہاں سے عقاب اور ستاروں کی ہمہ آئگی نصیب ہے۔

سیاسی افکار اور نصب العین کا جہاں تک تعلق ہے اقبال کی سیاست کے کئی پہلو تھے ایک طرف تو وہ اور بلند پایہ مفکرین و مصلحین کی طرح تمام نوع انسان کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا محض مخصوص گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاست دانوں کا کام ہے اعلیٰ درجے کا شاعر یا مفکر مخصوص گروہوں پر ہی اپنی توجہ نہیں دیتا اقبال کی طرح جرمنی کا سب سے بڑا شاعر گوٹے ہے

جس کا زمانہ چوٹی کا نہایت پُر آشوب زمانہ تھا جبکہ نپولین نہ صرف جرمنی کو بلکہ تمام یورپ کو تباہ و برباد کر رہا تھا گوئیے اس تمام ہنگامہ سے کچھ ایسا بے تعلق رہا کہ بعض نقادوں نے کہا کہ اس میں جذبہ حب الوطنی بالکل نہ تھا اقبال کے متعلق بھی صورتِ حال اسی قسم کی ہے۔ اس درد مند دل رکھنے والے شاعر نے شروع میں حب وطنی کے عام جذبات کے ماتحت ایسی پُر جوش نظمیں لکھیں جن سے بہتر آج تک کوئی شاعر نہیں لکھ سکا لیکن اس دور کے بعد اقبال کی دور میں نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہاں بلند ہو گئی اور وہ قرآن حکیم کے اس نقطے پر آ کر ٹھہر گئی کہ کسی قوم میں حقیقی طور پر تخریب ہی ہو سکتا ہے جب اس قوم کے لوگوں میں تغیر پیدا ہو جائے۔ سیاست داں کی نظر صرف ظاہر پر پڑتی ہے اور وہ صرف ظاہری اصلاح کر سکتا ہے لیکن ایک مصلح کی نظر اس سیاست پر پڑتی ہے اور سیاست داں کے مقابلے میں بہت گہری اور دور رس ہوتی ہے۔ سیاست داں محض ابن الوقت ہوتا ہے اور معاملات کی گتھیاں جیسے جیسے پیدا ہوتی ہیں ان کو سلجھانے کے لئے قاعدے قانون بناتا رہتا ہے جن کی تہ میں کوئی پائیدار حقیقت نہیں ہوتی اس لئے ہمارا مفکر شاعر اپنے اہل وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا جس میں محض یورپ کی قوم پرستی کی بجائے تقلید نہ ہو بلکہ عدل و انصاف کا راستہ صالحانہ جدوجہد سے سب کے لئے کھل جائے۔ وطن کی صحیح محبت اقبال کے دل میں آخر دم تک موجود رہی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا۔ اپنی آخر عمر کی فاری نظموں میں جہاں کہیں وہ ہندوستان کا ذکر کرتا ہے اس کے بیان میں بڑا درد سوز و گداز ہوتا ہے وہ ہر قسم کی غلامی سے بیزار تھا اور اپنے وطن کو نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، عقلی، مذہبی اور اخلاقی غلامی سے بھی آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اقبال کی پوری شاعری اسی تخیل کی آئینہ دار ہے۔ اس شاعر نے اسلام کا وہی اصلی خاکہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے جو رنگ و نسل اور خون کے امتیاز کی وجہ سے کسی

قوم یا شخص کو بڑا یا چھوٹا نہیں سمجھتا اقبال اس بیسویں صدی کے مسلمان میں بھی بلالؓ کی روح علیؓ کی شجاعت، عثمانؓ کی حیا، عمرؓ کا تدبیر اور ابو بکرؓ کی صداقت دیکھنی چاہتا تھا۔ یہ چاہنا کیا بُرا چاہنا تھا؟ اس کے نزدیک انسان میں قوتِ مشاہدہ کا ہونا ضروری ہے اس کے بغیر اس کی انسانیت مکمل نہیں ہو سکتی اس نے اپنے کلام میں جا بجا اس صفت کے حصول پر زور دیا ہے۔ پیامِ مشرق میں جہاں آدم کی پیدائش کا ذکر ہے وہاں پہلے شعر کا یہ مصرعہ اقبال کے خیال کو پورے طور پر واضح کرتا ہے۔

حسن لرزید کہ صاحب نظر ہے پیداشد

اس میں یہ اشارہ ہے کہ خود نگر ہونا ہر انسان کے لئے لازمی ہے۔ اقبال صرف ہندوستانی ہی نہیں مسلمان بھی تھا۔ اسی نقطہ نظر سے وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ بھی تھا جہاں تک سیاست کا تعلق گروہوں کی اصلاح و ارتقاء سے ہے وہ جس طرح ہندوستان کی آزادی اور اس کے لئے اعلیٰ درجے کے اقتدار کا آرزو مند تھا اسی طرح وہ تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا متمنی تھا۔ ہندوستان کے بعض غیر مسلم حضرات مسلمان کی اس فطرت سے آشنا نہیں ہیں چنانچہ جب کوئی مسلمان ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کے متعلق دلچسپی یا جوش اور جذبے کا اظہار کرتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے اور وطن پرست یا قوم پرست بھی نہیں ہیں ہر صحیح الفطرت مسلمان ہندوستان کی ہستی، جہالت، غلامی سے اتنا ہی دلگیر ہے جتنا کہ اور کوئی غیر مسلم ہندوستان کی عزت کے لئے، ہر ہندوستانی کے لئے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ہندوستان کی عزت اس کی اپنی عزت ہے، ہندوستانی مسلمان کا وجود مادرِ ہندوستان کی خاک سے اُبھر رہا ہے اور اس میں وہ پیوند ہو جائے گا لیکن اسلام نے ایک مسلمان کو ایک ایسی برادری کا بھی رکن بنادیا ہے جو جغرافیائی حدود سے ماورزی ہے مراکش اور چین کے مسلمان کی سیاسی اور تمدنی کش مکش کے ساتھ بھی اس کے دل کو وہی رابطہ ہے جو خود اپنے وطن کی جدوجہد سے ہے۔ مسلمان کی وسعتِ قلب

میں وطن کے لئے ایک نہایت عزیز مقام موجود ہے لیکن وطن سے علاوہ عالمگیر اسلامی برادری کو بھی وہ اپنے دل سے الگ نہیں کر سکتا۔

اقبال نے شہنشاہیت، سرمایہ داری اور جاگیر داری کو اسلام کی تعلیم کے بالکل خلاف قرار دیا ہے غلامی و محکومی کو انسان کے لئے ہلک بتایا، جمہوریت اخوت، مساوات اور آزادی کی بنیاد پر انسانی سماج کی تعمیر کا مشورہ دیا اس وجہ سے اقبال کا کلام حیات و عمل کا ایک زندہ جاوید پیام بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سماج جو اقبال کا نصب العین تھا اشتراکی نصب العین سے ملتا جلتا ہے لیکن درحقیقت وہ اشتراکیت سے بہت بلند اور اسلامی تصورات کا صحیح عکس ہے جہاں اس مفکر شاعر نے ہندوستان کے مسئلہ آزادی کا حل ۱۹۳۷ء میں یہ بتایا کہ مسلمانوں کو ان مخصوص علاقوں میں اپنی آزاد حکومت قائم کرنے کا حق ملے وہاں خدا کی جانب سے فرشتوں کو یہ انقلابی پیغام بھی دیا۔

انصوری دنیا کے غریبوں کو جگادو کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو
آج ہم اقبال کے مبارک خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جبر و ظلم
شہنشاہیت استبداد کی طاقتیں ہر ملک میں زوال پذیر ہیں ہر جگہ عوام منظم و متحد ہو کر اپنے حقوق
حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جمہوریت کا پرچم ہر ملک میں بلند ہو رہا ہے اور وہ دن اب
دور نہیں جس کی پیشین گوئی ڈاکٹر اقبال نے اپنے ان اشعار میں کی ہے۔

فروغِ خاکیاں از نوریل افروز شود روزے

زیں از کوکبِ تقدیر باگردوں شود روزے

جہازِ ما کہ اورا پر درش کردند طوفا نہا

ز گردابِ سپہر نیلگوں بیرون شود روزے

تصبر

سفرنامہ اندرام مخلص | از جناب ڈاکٹر سید اطہر علی صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ، ڈی (کینٹب) صدر شعبہ عربی فارسی و اردو دہلی یونیورسٹی تقطیع کلاں ضخامت ۲۷۰ صفحات ٹائپ باریک مگر روشن قیمت جلد چھ روپے۔

محمد شاہ کا زمانہ سلطنت کے انتہائی زوال کا زمانہ ہے لیکن اس دور میں بھی کچھ ایسے ارباب علم و ادب تھے جن کے دم سے گزشتہ زمانہ کی کلچرل روایات قائم تھیں۔ انھیں لوگوں میں سے ایک اندرام مخلص بھی تھا۔ یہ قوم کا کھتری اور اصل باشندہ سیالکوٹ کے ایک مقام سودہرہ کا تھا۔ علم و فضل کے لحاظ سے اسے اپنے معاصرین میں ایک مرتبہ خاص حاصل ہے۔ دو دوسرے کاروں کا دلیل ہونے کے باوجود تصنیف و تالیف اور شعر گوئی کا مشغلہ بھی جاری رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دیوان کے علاوہ نثر میں بھی چند مفید اور دلچسپ تاریخی اور ادبی تصنیفات بہ طور یادگار چھوڑی۔ انھیں تصنیفات میں سے اس کا ایک سفرنامہ ہے جس میں اس نے روزنامہ کی شکل میں اپنے اُس سفر کا حال بڑے دلچسپ پیرایہ میں لکھا ہے جو اس نے نواب سید علی محمد خان بہادر کی معیت میں دہلی کا کیا تھا۔ یہ سفرنامہ محض روئداد سفر نہیں بلکہ اُس میں اُس عہد کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات کے متعلق ایسی قابل قدر معلومات ملتی ہیں جو تاریخ کی کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتی۔ خوش قسمتی سے اس سفرنامہ کا ایک نسخہ خود مخلص کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانہ عالیہ رامپور میں محفوظ تھا۔ زیر تبصرہ کتاب یہ وہی نسخہ ہے جس کو جناب ڈاکٹر سید اطہر علی صاحب نے بڑی قابلیت و لیاقت اور عمدگی و خوش اسلوبی کے ساتھ مرتب و مہذب کیا اور سرکار عالیہ رامپور کی طرف سے شائع کیا گیا۔ علاوہ اصل سفرنامہ کے جس کو آج کل کے جدید مغربی طریقہ کے مطابق اڈٹ کیا گیا ہے۔ شروع میں ایک سو چالیس صفحات کا ایک طویل

اور نہایت فاضلانہ و محققانہ مقدمے جس میں ڈاکٹر صاحب نے مخلص کے خاندانی حالات، ذاتی صفات و کمالات اور ادبی و شعری امتیازات و تصنیفات پر ناقدانہ گفتگو کرنے کے بعد سفرنامہ کا وسعت نظر اور دقت نگاہ سے جائزہ لیا ہے اور اس سلسلہ میں سفرنامہ میں جو مخصوص اصطلاحات آئی ہیں ان پر بڑے مفید اور معلومات افزا نوٹ لکھے ہیں اور ساتھ ہی سفرنامہ کی زبان اور اس کے بعض مندرجات پر کلام کیا ہے۔

اصل سفرنامہ کے علاوہ کتاب کا مقدمہ اور سفرنامہ کے حواشی عام اربابِ ذوق کے لئے عموماً اور تاریخ کے طلباء کے لئے خصوصاً نہایت مفید اور بہت قابل قدر ہیں۔ پھر مقدمہ کی زبان بھی ایسی شیریں اور رسیلی ہے کہ پڑھ کر آزاد کے طرز نگارش کا لطف آنے لگتا ہے۔

اس موقع پر غالباً یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بعض فارسی تاریخوں میں "الیہ" حال کے معنی میں عام طور پر استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صفحہ ۱۹ پر اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس لفظ کی اصل کیا ہے؟ اس کی نسبت میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں ہماری رائے یہ ہے کہ دراصل الیہ حالیہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جیسے فارسی میں طلباء جو ہر اصل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے درحقیقت عربی لفظ طلیعہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ حالیہ سے آلیہ بنا اور پھر لوگوں نے اس کو چار محروم سمجھ کر الیہ پڑھا شروع کر دیا اور وہ ہی چل پڑا یہ صرف ہمارا قیاس ہے۔ واللہ اعلم بحقیقت الحال۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے سفرنامہ کی مشہور شخصیت نواب سید علی محمد خاں بہادر کے حالات و سوانح بڑی تفصیل سے لکھے ہیں لیکن اگر اس کی بھی تحقیق ہو جاتی تو بہتر ہوتا کہ نواب مرحوم کو اور ان کی اولاد کو سید کہنے کی وجہ کیا ہے داؤد خاں نے اس بچہ کو جس جگہ سوا اور جس حالت میں اٹھایا اس کے پیش نظر اس امر کی تحقیق اور بھی ضروری ہو جاتی ہے بہر حال ہم ڈاکٹر صاحب کو ان کے اس فاضلانہ علمی کا نامہ پراور سرکار عالیہ رامپور کو اس معارف پروری و علم نوازی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ کتاب خانہ عالیہ رامپور کے اربابِ دانش و علم خطوطات بھی اسی طرح غائب

آست

مُصَنِّفِینِ دینی کا علمی و دینی کام ہوتا
ندوة اہلین دینی کا علمی و دینی کام ہوتا

برکات

مرتب
سعید احمد بک آبادی

مطبوعات ندوۃ الدین لمصنفین دہلی

۳۹۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے کئے گئے ہیں۔ ستر مجلد للعر	محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں حک و فک کے بعد ضروری اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین بنایا گیا ہے۔ قیمت چھ مجلد سے
روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت چھ مجلد سے	۴۰۔ قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن حضرت آ
سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پوری	سے حضرت موشی و ہارون کے حالات تک چھ مجلد سے
کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ۔ ستر مجلد للعر	وحی الہی۔ مسدوحی پر پہلی محققانہ کتاب۔ چار مجلد سے
ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ	بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے
۴۱۔ نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس	کے لائق ہے جدید ایڈیشن جس میں نہایت اہم تازہ ترین اہ
میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک	کئے گئے ہیں حجم پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے اور ۴۲ تک
خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے جدید ایڈیشن جس میں	تمام بین الاقوامی معلومات آگئی ہیں۔ پانچ روپے۔
اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ پھر	تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور
فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے	مکمل خلاصہ جدید ایڈیشن دو روپے
کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کا زمرہ مرتب کیا گیا ہر اس	۴۲۔ قصص القرآن حصہ دوم: حضرت یوشع سے حضرت
موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب۔ چار مجلد سے	یہودی کے حالات تک۔ ستر مجلد للعر
غلامان اسلام۔ آٹھ سے زیادہ غلامان اسلام کے	اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب
کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی	جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش
بیان جدید ایڈیشن۔ قیمت چھ مجلد سے	کیا گیا ہے۔ تیسرا ایڈیشن للعر چھ مجلد سے
اخلاق اور فلسفہ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط	مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید ایڈیشن للعر چھ مجلد سے

برہان

شمارہ (۲)

جلد نوزدہم

اگست ۱۹۴۷ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

۶۶	سعید احمد	۱۔ نظرات
۶۹	جناب میرولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایسٹ آباد	۲۔ اربب پیشادری
۹۳	جناب ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی	۳۔ سندباد
۹۹	جناب مولوی ابو صالح صاحب اعظمی	۴۔ دنیا کے تین جاہلی تمدن
۱۱۵	جناب خواجہ محمد علی صاحب رحمانی	۵۔ عوالم غمساور مرآت بدو جود
۱۲۳	م۔ ح	۶۔ تبصرے

نظرات

جس تاریخ کو برہان کا یہ پرچہ اپنی مقررہ تاریخ اشاعت کے مطابق شائع ہونا چاہئے۔ وہ ہی تاریخ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ہے۔ یہی وہ تاریخ ہوگی جبکہ ہندوستان انڈیا اور پاکستان کے دو علاقوں میں بٹ کر ڈھائی سو سال کے بعد اپنے معاملات میں خواہ وہ اندرونی ہوں یا خارجی مختار مطلق ہوگا۔ اس خوشی میں ہونوں جگہوں پر قومی جھنڈا لہرایا جائے گا۔ اور مختلف طریقوں سے اظہارِ مسرت کے جشنِ آزادی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ یہ سب کچھ ہوگا اور ہو رہا ہوگا۔ لیکن ایک حقیقت ہندوستان کو بھر پور سوال کرنے کا حق ہے کہ کیا یہی وہ آزادی ہے جو ہم لوگوں کو محبوب و مطلوب تھی، کیا یہی وہ حریت و استقلال کی ناظرہ خوش جمال ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کی رگ و پے میں اضطراب و بے چینی کی بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ پھر کیا یہی وہ ہماری متاعِ گم گشتہ ہے جس کو واپس لینے کی حسرت و آرزو میں ایک طرف سراج الدولہ اور شیونے جامِ شہادت نوش کیا اور دوسری جانب حضرت سید احمد صاحب شہید اور ان کے رفقاء کرام کی جماعتِ حقہ نے قرعہ پوشی کے ساتھ شمشیر زنی کا ایسا کمال دکھایا کہ سرزمینِ بالاکوٹ کا ذرہ ذرہ آج بھی زبانِ حال سے اس کی گواہی دے رہا ہے۔ اگر دراصل یہ وہی آزادی ہے جس کا خواب حضرت شیخ الہند، انصاری، اجل خاں، محمد علی، موتی لال نہرو اور سی آر دت وغیرہم نے دیکھا تھا تو پھر یہ کیا ہے کہ ملک اس آزادی کا استقبال فوجوں کے پہروں۔ سپاہیوں کی سنگینوں اور فوجی قوانین کی ہلاکت انگیزیوں کے ساتھ کر رہا ہے۔ عالم میں غلغلہ مچا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر سے اپنا قبضہ اٹھالیا۔ لیکن خود ہمارا حال یہ ہے کہ نہ زندگی مامون ہے، نہ مال اور آبرو محفوظ ہے۔ کہیں ہندو مسلمان سے ہما اور ڈرا ہوا ہے اور کسی جگہ مسلمان ہندوؤں کے ڈر سے

لڑہ براند ام ہیں۔ پھر ہندو ہندو میں بھوٹ ہے۔ ہاں سبھا کا نگر میں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ مسلمان مسلمان سے نبو آزا ہے، پنجابی ہندی سے اور ہندی پنجابی سے اور سرحد کا پٹھان ان دونوں سے کھٹکا ہوا ہے اور سیاست کے میدان میں آگے چل کر ایک دوسرے سے داؤ پیچ کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ان اخلاقات اور تعصبات کے علاوہ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ عوام روز بروز تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ارباب سیاست کو بڑے اور اونچے درجہ کے معاملات نٹانے سے ہی فرصت نہیں کہ وہ عوام کی پریشانی اور مصیبت کا جائزہ لے سکیں۔ ملک میں اناج کا کال ہے۔ ہر چیز گراں سے گراں تر ہوتی جا رہی ہے۔ چور بازار علی الاعلان اور کھلم کھلا چل رہا ہے۔ ہر محکمہ میں رشوت ستانی کا بازار گرم ہے۔ اخلاق اس درجہ گر گئے ہیں کہ انسان انسان نہیں رہا۔ بھڑیا اور خونخوار درندہ بن گیا ہے۔ خدا پرستی کا صرف نام ہی نام ہے۔ امانت اور دیانت صرف کاغذوں میں نظر آسکتے ہیں۔ عمل میں ان کا کہیں وجود نہیں۔

پھر اس وقت جبکہ حش آزادی کے شادیاں بچ رہے ہیں۔ ہمیں بے ساختہ بنگال و بہار سرحد و پنجاب، احمد آباد و بمبئی اور دوسرے مقامات کے ان لاکھوں انسانوں کی بھی یاد آ رہی ہے جو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو کر مر گئے اور یا گھر سے بے گھر ہو کر آج بھی خانہ بربادی و بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں!

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ اب قید و بند کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں اور آزادی کا دور کھل رہا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آزادی فی نفسہ کوئی قابل قدر چیز نہیں ہے۔ اگر اس کو صحیح اور درست طریقہ پر استعمال نہ کیا جاسکے۔ تاریخ میں کیسے کیسے بہادر اور نبو آزا بادشاہ گذرے ہیں جنہوں نے ملک کے ملک فتح کئے لیکن ان پر حکومت نہ کر سکے۔ ملک فتح کرنے کے لئے بہادری، مردانگی اور عزم و ارادہ کی مضبوطی ہی درکار ہیں۔ لیکن حکومت چلانے کے لئے کمال

عقل و غیر زانگی، دیر اندیشی مصلحت شناسی، اور عوام و خواص کے جذبات کا ادراک و شعور، فکر و عمل کا توازن۔ پھر ان سب سے اہم اور مقدم یہ کہ ظاہر و باطن کی پاکیزگی اور صفائی، عدل و انصاف اور دیانت و راست بازی یہ سب اوصاف ضروری ہیں۔ پس آج جشن آزادی منانے ہوئے انڈیا اور پاکستان دونوں حکومتوں کے اربابِ حل و عقد کو بارگاہِ خداوندی میں عہد و پیمان کرنا چاہئے کہ اب وہ کسی طرح ماضی کے دلخراش واقعات کا اعادہ نہ ہونے دیں گے۔ دونوں حکومتوں کا مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہے اس لئے دونوں ایک دوسرے کی حلیف اور مددگار بن کر رہیں گی۔ کیونکہ اساساً اسی پر دونوں کی خوشحالی اور حقیقی امن و عافیت کا دارومدار ہے۔ اب تک ہم نے حقائقِ بنی سے کہیں زیادہ جذبات پرستی سے کام لیا ہے اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج آزادی بھیانک اور ڈراؤنی شکل میں نظر آ رہی ہے لیکن اب ہم کو لامحالہ حق شناسی سے کام لینا ہوگا۔ ورنہ اگر اب بھی ہم اس سے محروم رہے تو انجامِ شدید ترین تباہی و بربادی اور کامل ہلاکت و رسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ نظر تیرا جاج ہو نہ سکیگا حریفِ ننگ
خونِ دل و جگر سے ہر سرمایہٴ حیات فطرت ہو ترنگ ہر غافل نہ جلتِ ننگ

بہر حال ہماری دعا ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں آزادی سے بجا اور صحیح طور پر فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ ترقی کریں اور نہ صرف ایشیا کے لئے، بلکہ تہذیب و تمدن، نظامِ معیشت و معاشرت، فضائلِ اخلاق، امن و خوشحالی اور علمی و ثقافتی عروج و ترقی کے اعتبار سے تمام دنیا کے لئے شمعِ راہ کا کام دیں۔

ادیب پشاور

سوانح حیات اور کلام

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈووکیٹ ایٹ آباد

اے بسامعنی کہ از نامحرمی ہائے زباں باہمہ شوخی مقیم نغمہ ہائے راز ماند
وسے با بالِ ہری کز تنگی دام و قفس ساخت با آسودگی چند آنکہ از پرواز ماند
بسکہ فطرت با مگر و نارسانی خاک شد یک چہاں انجام - جملہ پرور آغاز ماند
نغمہ با بسیار بود اما ز جہل مستمع ہر قد بے پردہ شد پردہ ہائے ساز ماند

حسن در اظہار شوخی رنگِ تقصیرے نہ داشت

چشم با غفلت نگہ شد - جلوہ محو ناز ماند (بیدل)

مسلمانان ہند کی فارسی سے بے اعتنائی قابلِ صد ہزار افسوس ہے کیونکہ اسلامی مذہبیات اور ادبیات کا جتنا خزانہ اس زبان میں ہے شاید ہی اود کسی زبان میں ہو۔

ہندوستان میں غالباً صرف ایک پشاور ہی ایسا شہر ہے جہاں بعض کشمیری، ایرانی اور کابلی خاندانوں کی وجہ سے اب بھی اکثر گھروں میں فارسی بولی جاتی ہے لیکن یہاں بھی علوم فارسی سے بے توجہی اتنی ہی موجود ہے جتنی باقی ہندوستان میں۔

اس صحبت میں آپ کو پشاور کے ایک ایسے فاضل اور شاعر سے روشناس کرانا مطلوب ہے

جس کی ایران کے اہل زبان نے کماحقہ قدر شناسی کی لیکن جسے ہندوستان کے اہل وطن ایسا بھوسے کہ گویا وہ کبھی ان میں کا تھا ہی نہیں۔

چند روز ہوئے میرے دوست مرزا عبداللطیف خاں سشن جج نے جنہیں اس گئے گئے زمانے میں بھی فاریات سے گہرا تعلق خاطر ہے۔ ادیب پشاور کی کا ایک مطبوعہ دیوان مجھے دکھایا یہ کتاب مطبوعہ مجلس طہران میں مجمع و تحفہ و تعلیقات علی عبد الرسولی۔ بحروف ثانیہ طبع ہوئی ہے۔ سنہ طباعت ۱۳۱۲ (ہجری شمسی) (۱۳۵۲ء ہجری قمری ۱۹۳۴ء) ہے۔ یہ دیوان ادیب کے فارسی اور عربی قصائد و غزلیات پر مشتمل ہے۔ بڑی تقطیع کے ۲۹۵ + ۱۷ صفحات ہیں۔ غلط نامہ علاوہ ہے۔ ادیب کے دو فوٹو بھی ہیں ایک جوانی کا اور ایک بڑھاپے کا۔

جامع دیوان (علی بن عبد الرسولی) نے مقدمہ کتاب میں شاعر کے مختصر مگر مستند حالات بھی لکھے ہیں۔ عبد الرسولی، ادیب کا شاگرد اور معتقد تھا۔ اور مدتوں اُن کے ساتھ رہا۔ مندرجہ ذیل بیانات اسی مقدمہ پر مبنی ہیں۔

نام و نسب | ادیب کا نام سید احمد تھا۔ سید شہاب الدین معروف بہ سید شاہ بابا کے بیٹے اور سید عبدالرزاق رضوی کے پوتے تھے وہ سادلت اجاق سے تھے۔

ان کا خاندان صاحب زہد و تقویٰ اور اہل ذکر و دعا تھا۔ ان کا سلسلہ جلالت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمت اللہ علیہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

وطن | ادیب کا خاندان پشاور اور افغانستان کے درمیانی علاقے میں۔ جسے اب علاقہ غیر یا قبائلی علاقہ کہا جاتا ہے، رہتا تھا۔ ادیب کا فوٹو خود ایک بین دلیل اس امر کی ہے کہ وہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ پشاور شہر میں بھی ان کا رہنے کا مکان تھا۔ اس نواح کے لوگ اس خاندان کے بڑے معتقد تھے۔ اور ان کے باطن سے طلب ہمت اور کسب فیض کرتے تھے۔

ولادت | سید ادیب ^{۱۸۲۶ھ} (قمری) ۱۸۲۶ء کے قریب پشاور شہر میں پیدا ہوئے۔ مدرسے جانے کی عمر ہوئی تو والد نے انھیں مکتب میں بھیج دیا۔ تاکہ پڑھنا لکھنا سیکھیں۔ تعلیم کے ابتدائی مراحل آپنے اسی دبستان میں طے کئے۔ اس کے بعد آپ ادبیات و علوم کی تحصیل میں مشغول ہوئے۔

ثنوی مولاناؒ روم کی طرف | وہ زندگی کے اسی مرحلے میں تھے کہ ایک روز وہ پشاور کے بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک دعوتِ نہایت خوش الحانی کے ساتھ ثنوی مولاناؒ روم توجہ کا عجیب واقعہ

سے صلحِ حدیبیہ کا قصہ پڑھ رہا تھا جب وہ اس بیت پر پہنچا ہے

ناگہاں در حقِ آں شمعِ رسل دولتِ آتا فتحنا زد دہل
جب ادیب نے یہ شعر سنا تو بخود ہو گئے۔ حالتِ دگرگوں ہو گئی اور اسی جذب کی حالت میں سر کو دیوار پر مارا۔ سر زخمی ہو گیا اور خون بہ نکلا۔ بقولِ سعدی

نہ بینی کہ آنا نکہ صاحبِ دلند بہ آوازِ دولا بستی کنند

اس کے بعد وہ ثنوی میں ایسے مشغول ہوئے کہ ہر وقت اسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔

انگریزوں سے لڑ کر افرادِ خاندان | یہ وہ زمانہ تھا جب اضلاعِ سرحد میں چینی ہوئی آزادی کو واپس لینے کا شہید ہونا کے لئے لڑائیاں جاری تھیں۔ ایسے موقع پر ایسے خاندان کا اس

قومی جہاد سے برکنار ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وہ میدان میں آگئے۔ عمالِ انگلشیہ سے لڑتے ہوئے نہ صرف ادیب کے والد شہید ہوئے بلکہ خاندان کے افراد کی اکثریت بچپوں کے لڑکے۔ اکثر اعزاء و اقارب اور ذوالارحام جامِ شہادت کا آبِ حیات پی کر زندہ جاوید ہو گئے۔ ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احياء عند ربهم یرزقون (۳-۱۶۹)

کشتگانِ خیر تسلیم را ہر زماں از عشقِ جان دیگر است

وطن سے ہجرت | ان حالات میں ادیب کا اپنے وطن میں اقامت پذیر ہونا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ وہ اپنی مظلوم بڑھی ماں بہر علیا کو جو سادات حسینی سے تھیں اور جن کا سلسلہ نسب حضرت سجاد سے ملتا ہے۔ وطن میں چھوڑ کر درو و سوز کے کارواں درکارواں دل میں لئے کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔

سفر اور تعلیم | دو سال کابل میں رہے اور آقا خوند ملا محمد معروف بہ آل ناصر سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہاں سے غزنی چلے گئے۔ اور حکیم سنائی کی تربت اور سلطان محمود غزنوی کے مقبرہ باغ فیروزہ پر مقیم ہو گئے۔ اڑھائی سال سے کچھ زیادہ وہاں بقامت کی اور ملا سعد الدین سے جن کا شجرہ نسب خلیفہ اولؑ سے ملتا ہے اور جو حکمت اور فنونِ ادب کے مشہور استاد تھے تحصیلِ علم کرتے رہے۔

غزنی سے ادیب ہرات آگئے اور چودہ مہینے وہاں رہے۔ اس کے بعد تربت شیخ جام کی طرف روانہ ہو گئے اور ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ وہاں گزارا۔

قریباً تیس سال کی عمر میں وہاں سے وہ مشہر آ گئے اور علومِ ہادب و حکمت کی تحصیل و تکمیل میں لگ گئے۔ اور وہاں کے مشہور مدرس مرزا عبدالرحمن سے حکمت اور ریاضی اور آخوند ملا غلام حسین شیخ الاسلام سے فلسفہ اور علومِ عقلیہ پڑھتے رہے۔ اور علومِ ادبیہ کی تکمیل میں بالخصوص کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ ذوقِ فطری اور حدتِ ذہن اور قوتِ حافظہ کی برکت سے وہ اس فن میں ماہرِ کامل ہو گئے اور اپنے معاصرین و اقران پر فوقیت حاصل کر لی۔

۱۲۸۷ھ (۱۸۷۵ء) میں ادیب سبزوار آ گئے۔ یہ شہر ان دنوں علومِ حکمت کا مرکز اور طلبائے معقول اور اہل معرفت کا مجمع تھا۔ دو سال تک استادِ محکما و المتاہین حاجی ملا ہادی سبزواری کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور ان ہی کے کہنے پر ان کے لڑکے آقا خوند ملا محمد کے حلقہٴ درس میں بیٹھتے رہے اور آخوند ملا اسماعیل سے بھی اس فن میں مستفید ہوتے رہے۔

حاجی سبزواری کی وفات کے بعد ادیب مشہر واپس آ گئے اور میرزا جعفر کے مدرسے

میں سکونت گزری ہو گئے۔ اب وہ خود علم و فضل میں مشہور ہو گئے تھے۔ اور امثال و افاضل حکماء و اہل
انھیں لوگ ادیب چندی کہا کرتے تھے۔

معنی | یہاں انھوں نے خود باطراف بات بچائی اور پڑھانے لگے۔ بڑے بڑے دانشمند بزرگ
بر غبت تمام اُن سے فیض حاصل کرنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کو غنیمت سمجھتے تھے۔

طہران میں ورود | سنہ ۱۸۸۲ء میں وہ طہران آ گئے۔ میرزا سعید خاں وزیر امور خارجہ
کی معرفی سے۔ جو اُن دنوں مشہد مقدس میں آستان قدس کی تولیت سے بہرہ مند تھے۔ ادیب
میرزا محمد علی خاں قوم الدولہ کے ہاں آ گئے۔ انھوں نے آپ کی تشریف آوری کو مفتختم سمجھا۔
اور جب تک جیتے رہے آپ کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ وہاں کے فاضل
اور ادیب آپ کی صحبت کو غنیمت جانتے اور ان کی ہم نشینی کو عزت سمجھتے تھے۔

مشاعروں میں شرکت | اُن دنوں سید محمد بقا کے مکان پر ہفتہ میں ایک بار انجمن شعرا کا جلسہ ہوتا
تھا۔ ادیب بھی گاہے گاہے بر سبیل تفنن ان جلسوں میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ یہ سید محمد بقا
جامع دیوان علی عبدالرہسولی کے استاد تھے۔ علی بھی ان جلسوں میں موجود ہوتے تھے وہ کہتے
ہیں کہ سب سے پہلے میں نے ادیب کی جو نظم سنی۔ وہ ایک قصیدہ تھا جو انھوں نے اس شاعر
میں پڑھا اور جس کا مطلع یہ ہے۔

تابید برمیاں جو کمر زلف تابدار برنیم تار بست مہ من ہزار تار
مشتوق کی کمر کی بار کی کے بیان میں موعے کمر کہہ کر شعر اکمر کو تار موی سے تو تشبیہ دیا
ہی کرتے تھے اور یہ مضمون خاصا پامال بھی تھا۔ ادیب نے بال کی بھی کھال اتار کر کمر کو نیم تار کر دیا
ناصر الدین قاجار سے تعارف | بادشاہ ایران ناصر الدین شاہ قاجار نے جب آپ کے فضائل علمی
کا شہرہ سنا تو اُسے آپ کی ملاقات کا شوق ہوا اور انھیں اپنے حضور میں طلب کیا۔ چنانچہ آپ

سید محمد بقا ند کو ر کے ساتھ حضور شاہی میں تشریف لے گئے اور مورد الطاف شاہی ہوئے بقول سعدی

اگر گوہر قیمتی غم مدار کہ ضائع نگر دانت روزگار

عبدالرسولی سے ربط | جامع دیوان کی ادیب سے پہلی ملاقات ۱۳۱۵ھ بمطابق ۱۸۹۷ء میں انجمن شعراء کے ایک اجلاس میں ہوئی۔ جامع اُن دنوں سید بقا کی شاگردی میں خطِ نسخ کی مشق کرتا تھا اور شاعروں میں اکثر موجود ہوتا تھا۔ گواہی وہ تو آؤں تھا اور مراتبِ ادبی کی تخصیص کے ناقابلِ تاہم وہ ادیب کے فضائل و شمائل پر ایسا فریفتہ ہوا کہ اُسے ان کی ملازمت اور صحبت کا شوق ہو گیا۔

اتفاق یوں ہوا کہ حاجی میرزا عبداللہ کاتب المتخلص بہ دانا کے حجرے میں ادیب کا آنا جاننا زیادہ ہو گیا۔ عبدالرسولی بھی اکثر وہاں ہوتا تھا۔ اور بسا اوقات یہ دونوں دن دن بھر اکٹھے ہوتے تھے۔ اس طرح عبدالرسولی کی مراد برائی۔ مختصر یہ کہ دانا اتفاقاً سفر مکہ و ہندوستان پر روانہ ہو گیا۔ اور قریب دو سال باہر رہا۔ اس دوران میں دانا کی جگہ جامع دیوان ہی اس حجرہ میں اقامت پذیر ہو گیا۔ اور اس طرح وہ ادیب کے دوامِ صحبت سے مستفیض ہونے لگا۔ اور رشتہ الفت و ارتباط ایسا بڑھا کہ عمر بھر قائم رہا۔

جمع دیوان | شروع شروع میں ادیب کے دو تین قصیدے اور چند غزلیں جامع کے ہاتھ آگئیں اُس نے انھیں خوشخط لکھ کر آپ کی نظر سے گزارا اور تقاضا کیا کہ جب آپ کوئی نظم لکھیں تو اُس کا نسخہ اُسے عنایت کریں۔ تاکہ جمع و تدوین کے کام سے وہ سرفراز ہو سکے۔

چنانچہ ادیب اپنی ہر نئی نظم جامع کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ عمر بھر ہی دستور رہا۔ اس تعلق سے پہلے کی کئی نظمیں ضائع ہو گئیں اور کئی ایک عبدالرسولی نے دوسرے لوگوں سے اور بعض بچے پرانے مسودات اور متفرق اوراق سے مرتب کر لیں۔

ادیب کی کم آمیزی | اُن مصائب و نزائب کے باعث جو ادیب کو کم عمری کے زمانے میں پیش آئے

اُن کی طبیعت میں کم ہوشی اور تند خوئی تھی۔ ان کی دو عکسی تصویروں کو جو شامل کتاب میں دیکھ کر اُن کی تند خوئی کا خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہی علاقہ غیر کا چہرہ۔ وہی خال و خط اور وہی نقوش کی درستی۔ مصائب کے اثر کے علاوہ اُن کی زاد بوم کی خصوصیتیں بھی یقیناً ان کی طبیعت پر اثر انداز ہوتی ہوں گی۔

وہ لوگوں کے ساتھ الفت و انس کم کرتے تھے۔ اور بہت کم ملتے تھے۔ اسی لئے وہ درس دینے میں بھی چنداں رغبت نہیں رکھتے تھے۔ اتفاقاً کسی دوست کو کبھی ریاضیات اور ادبیات کا درس دیدیا تو دیدیا۔

مطالعہ | اُن کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا تھا اور ہمیشہ اپنے محفوظات کے تکرار میں مصروف رہتے تھے۔ حتیٰ کہ رستے میں چلتے چلتے بھی وہ پڑھنے سے باز نہیں آتے تھے۔
شعر خوانی | انھیں کم خوابی کی تکلیف تھی۔ کبھی کبھی دو تہائی رات گئے سوک اور کبھی سحر تک اپنے مخصوص انداز میں ترنم کے ساتھ شعر گنگنااتے رہتے تھے۔ اس طرح کہ سننے والا باوجود کوشش کے کوئی لفظ سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ کبھی شعر خوانی سے تھکتے نہ تھے۔ اکثر شہنوی مولائے روم اور کبھی کبھی عربی قصیدے پڑھا کرتے تھے۔

حافظ | ادیب کے حافظے کے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ شیخ محمد خان قزوینی اپنی کتاب بیت باب میں لکھتے ہیں کہ ”مجھے ادیب کا حافظہ دیکھ کر حلاوت اور وہ یاد آ جاتا ہے۔ کتب ادبیہ میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ شعرائے جاہلی میں سے اُسے حروف تہجی کے ایک ایک حرف پر سو سو لے قصیدے یاد تھے۔ علاوہ مقطعات کے۔ شعرائے اسلامی کا تو ذکر ہی کیا۔“

سید محمد تقی کا کہنا ہے کہ جب کبھی انجمن میں کوئی آدمی ادیب کے سامنے قصیدہ پڑھتا تھا اور پھر وہ مہینے کے بعد کہیں اُس قصیدے کا ذکر آ جاتا تھا تو ادیب اس قصیدے کے شروع

درمیان اور آخر کے چند شعر زبانی سنا دیا کرتے تھے اور آخر کار بے توجہی کے عالم میں ہی ناقص صورت میں سارا قصیدہ سنا دیتے تھے۔

شنوی حفظی | جامع دیوان کا بیان ہے کہ میں نے خود ادیب سے سنا کہ جب وہ خراسان میں تھے اور مزاج پورے اعتدال اور استقامت پر تھا تو اکثر شہر کے باہر لوگوں سے دور نکل جایا کرتے تھے اور تیز چلنا اور شنوی پڑھنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ گرم خوانی کی یہ حالت ہوتی تھی کہ رستے میں گرھا اور پھر لڑنے لگتا تھا۔ اور کئی دفعہ گر پڑتے تھے۔ ان دنوں انھیں شنوی کے چھ کے چھ دفتر مرتباً زبانی یاد تھے۔ وہ ڈرا کرتے تھے کہ کہیں اختلالِ حواس کی نوبت نہ آجائے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے اس عادت کو چھوڑا، لیکن اقامتِ طہران کے زمانے میں یہ عادت پھر عود کر آئی۔ جب کبھی وہ کسی دوسرے کام میں مشغول نہیں ہوتے تھے تو شنوی پڑھتے رہتے تھے۔ ایک لمحہ بھی آرام نہیں کرتے تھے۔

تجرد | ادیب تمام عمر تنہا اور مجرد رہے۔ زن و فرزند خانہ و خواستہ غرضیکہ دنیا کے تمام تر تعلقات سے آزاد رہے اور کسی قسم کی بندھن گوارا نہ کی۔

سوائے تن کے لباس اور چند ایک کتابوں کے ان کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ طبع و آرزو سے ہمیشہ سختی کے ساتھ برکنا رہے۔ خوشاندی ان میں بونہ تھی۔ بغیر کلمہ حق کے کسی نے کبھی ان کی زبان سے کوئی بات نہ سنی۔ عالی ہمت اور مستغنی طبع تھے، مدائنت اور تزویر چھو تک نہیں گئی تھی ہی وجہ تھی کہ اظہارِ عقاید میں ان کے لہجے کی صراحت اکثر اوقات لوگوں کی طبیعتوں پر گراں گزرتی تھی۔

حب وطن | ان کا تعلق خاطر زیادہ تر سیاسیات کے ساتھ تھا اور ان کی گفتگو اکثر اسی باب میں ہوتی تھی۔ حب وطن اور مملکت کے استقلال کا عشق گویا ان کا مذہب تھا۔ وطن کے ساتھ خیانت اور اغیار خصوصاً انگریزوں کی طرف میلان طبع کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے چنانچہ آپ ان کے کلام کے ذکر میں رکھیں گے کہ ان کے اکثر قصائد اور شہوتیات اسی موضوع پر ہیں۔

مرح سے پھر ہیر | ادیب نے عمر بھری کی طرح نہیں کی یعنی مال کی طمع کی بنا پر کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کی۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

نیسم من چوں دگر گویندگاں۔ داند خدا کو ز طمع ز در طریقِ مرح و شیوہ ذم گرفت
عالم نمایان بے حقیقت کو سخت بُرا سمجھتے تھے اور اہل حقیقت و صلاح و دیانت سے
بہت محبت کرتے تھے

دوستوں سے محبت | ایک دفعہ اُن کا ایک دوست پردیس میں مر گیا۔ اس پر وہ بہت متاثر اور پریشان
خاطر ہوئے۔ کہتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ دنیا میں میرے اہل و فرزند کوئی نہیں۔ اس قسم کی
مصیبتوں سے بچا رہوں گا۔ لیکن اب دیکھتا ہوں کہ اگر میرا جوان بیٹا یا بھائی مر جاتا تو میں اس سے
زیادہ غمگین نہ ہوتا۔ جتنا اب ہوں۔

فضائلِ علمی | ادیب اتنے شاعر نہ تھے، جتنے عالم، صرف و نحو، لغت و منطق و کلام۔ معانی و
بیان۔ عروض و قافیہ۔ ہیئت و نجوم۔ حساب و ہندسہ اور تاریخ و تفسیر میں تبحر تام حاصل تھا۔ فلسفہ
اور الہیات میں کامل تھے۔ فوق العادت حافظہ کی وجہ سے اُن کی معلومات کے خزانے معمور تھے
جو کچھ کبھی پڑھا یا دیکھا۔ اُس کا بیشتر حصہ انھیں یاد تھا۔ فارسی اور عربی لغات میں استحضار کی یہ
کیفیت تھی کہ کسی سوال کے جواب میں انھوں نے کبھی لا ادری (نہیدانم) نہیں کہا۔

اُن کے خصائص و فضائل کے اس پہلو کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی کہ وہ عرب
و عجم کے کتاب تھے اور قدیم و جدید انساب بہت خوب جانتے تھے۔ مختلف مذاہب و ملل
کی تحقیق میں بھی دسترس تھی۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کئی قرون سے مادرِ گیتی نے ایران کی گود میں ایسے فرزند کی
پرورش نہیں کی۔ جامع دیوان کہتا ہے کہ اس بات کو مبالغے پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ فی الواقعہ

وہ وحید عصر اور فرید دہر تھے۔ اُن کے معاصرین میں سے کوئی فاضل جامعیت اور تمامیت میں اُن کے برابر نہ تھا۔

شعرِ عرب اور متقدمین شعرائے عجم کے متعلق اُن کی معلومات کی وسعت کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص ان دو طبقوں کے کسی بڑے شاعر کا کوئی شعر پڑھ دیتا اور شاعر کو نہ جانتا تو ادیب اس سے آگے اور پیچھے کے شعر سناتے۔ اور شاعر کے حالات اور تاریخ بیان کر کے سائل کو مستغنی کر دیتے۔ آپ نے تاریخِ بہتقی پر جو حواشی اور تعلیقات لکھی ہیں۔ ان سے تاریخ و ادبیات میں اُن کی اطلاعات کی وسعت اور معلومات کی گہرائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وفات | ۲ محرم ۱۳۲۹ھ بمطابق ۲۳ مئی ۱۹۱۱ء کی صبح کو آقائے بہار الملک کے مکان پر معمول سے ذرا پہلے اپنے سونے کے کمرے سے نکلے اور علی کے کمرے میں آگئے۔ اور کہا کہ میں طبیعت میں کالت اور سنگینی محسوس کرتا ہوں اور طبیعت ناساز ہے۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں سکتہ ہو گیا۔ اور دائیں طرف فالج ہو گیا۔ پورا ایک مہینہ بستر پر رہے۔ مزاج میں ضعف تھا اور عمر نوے سال کے قریب تھی۔ علاج معالجہ بے اثر رہا۔ ۳ صفر (۳۰ جون) کو جانِ جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

مدفن | دوسرے روز انھیں مزارِ زادہ عبداللہ میں دفن کر دیا گیا۔ وزیر اور اکابر و اعیانِ مملکت جنازے میں شامل ہوئے۔

ماتمی جلسے | مدرسہ سپاہ سالار میں مجلسِ ماتم منعقد ہوئی۔ وزارتِ معارف اور انجمنِ ادب میں بھی ماتمی جلسے ہوئے۔ وزراء، علما اور اعیانِ سلطنت نے شمولیت کی۔ تقریریں ہوئیں اور نظمیں پڑھی گئیں۔ عربی اور فارسی مرثیے سنائے گئے۔

تصانیف | (۱) دیوانِ تصاید و غزلیات فارسی (۲۲۰۰) بیت۔ قصائد و قطعات عربی (۳۷۰) بیت

(۲) رسالہ در بیانِ قصایا نئی بدرہیات اولیہ۔

(۳) رسالہ نقد حاضر۔ دیوان ناصر کی تصحیح میں۔ جو جامع دیوان کے نام اظہار ہوا۔ نسخہ ناتمام ہوا

(۴) شنوی در بحر متقارب۔ جس کا نام قیصر نامہ جامع دیوان نے رکھا۔ اور ادیب نے

یہ نام پسند کیا۔ چنانچہ نقد حاضر میں آپ نے اس شنوی کو اسی نام سے یاد کیا ہے (۱۴۰۰) بیت۔
جامع نے اسے مرتب اور محشی کر رکھا ہے۔ نا حال طبع نہیں ہوئی۔

(۵) ترجمہ اشارات شیخ الرئیس۔ بعض دوستوں کی خواہش پر متن اشارات کا ترجمہ کیا اور ایک

بیان مختصر اپنی طرف سے ایزاد کیا۔ یہ نسخہ بھی ناتمام رہا۔ کیونکہ اجل نے مہلت نہ دی۔

(۶) حواشی و تعلیقات بر تاریخ بہیقی۔

قصایا اور نقد حاضر دیوان کے ساتھ چھپ گئی ہیں۔

کلام | ۱۔ ادیب نے قصیدے زیادہ لکھے ہیں، غزلیں کم۔ بعض قصیدے بہت لمبے ہیں۔ ایک ہی

قافیہ لے کر صد ہا شعر لکھ جاتے ہیں۔ پُرانے قصیدہ گو شاعروں کی طرح وہ بھی الفاظ کی شوکت کا

خاص خیال رکھتے ہیں۔ بہت متین گو ہیں۔ بازاری لفظ یا خیال غالباً ایک بھی دیوان میں موجود نہیں۔

۲۔ مختلف علوم میں ان کی اطلاعات کی وسعت کے آثار تمام کلام میں نمایاں ہیں۔ بہت

پامال مضمون کم لکھتے ہیں اور کہیں کہیں ایسے موقع پر تھوڑا بہت تصرف کر کے پرانی چیز کو نیا بنا دیتے

ہیں۔ اس کی ایک مثال آپ پڑھ چکے ہیں۔

۳۔ تشبیہات اور استعارات میں پرانی لکیر کی فقیری کم کی ہے۔ اس بارے میں وہ ہندوستانی

الفاظ اور ہندوستانی اشار کو بکثرت استعمال کرتے ہیں جو فارسی شاعری میں نئی چیز معلوم ہوتی ہے بعض

دفعہ الفاظ کو نئی ترکیبیں بھی دے جاتے ہیں۔ جس سے ان کے قادر سخن ہونے کی شہادت ملتی ہے۔

(۴) منطق، فلسفہ، تاریخ، ہیئت وغیرہ علوم کے مصطلحات بھی بہت بے تکلفی سے بعض

دفعہ استعمال کر لیتے ہیں۔ لغات عرب و عجم کی مہارت تو قریباً ہر نظم سے ثابت ہوتی ہے۔ جامع دیوان کا یہ کہنا کہ ان کے استعمال شدہ الفاظ کو جمع کرنے سے ایک فرہنگ بن سکتی ہے زیادہبالغہ آمیز نہیں۔

(۵) بعض دفعہ بہت مشکل گوئی بھی کر جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک شعر کے متعلق عبدالرسولی نے جرات کر کے کہہ دیا کہ اسے ہزاروں میں سے کوئی ایک آدمی سمجھ سکے گا۔ ادیب نے جواب دیا کہ میں نے یہ شعر اسی ایک آدمی کے لئے کہا ہے۔

(۶) دوسرے شعرا کے مضامین کو اپنی نظم میں باندھنے سے بڑا پدہ بن کر جاتے ہیں اور غمو مانی نئی باتیں ہی کہتے ہیں۔

(۷) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ شاعر سے زیادہ عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شوخی اور رندی بہت کم ہے۔

(۸) سیاسیات کو تو گویا وہ اپنا مذہب و مسلک بنائے ہوئے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو جس میں یہ مضمون مستقلاً یا ضمناً موجود نہ ہو۔ انگریزوں سے اور دوسرے اغیار سے بہت نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

(۹) حب وطن اُن کے ہر قصیدے سے ظاہر ہے۔ تمام عمر ہندوستان سے باہر گزاری۔ لیکن کسی نظم میں ہندوستان کو، ہندو اور مسلمان کو اور ہندوستانی سیاست کو نہیں بھلایا اور انگریزوں کو وہ کھری کھری سنائی ہیں کہ یاد رکھیں گے۔

(۱۰) ایران سے ان کی محبت بھی ان کے قصائد سے ظاہر ہے۔ تمام عمر انھوں نے ایران میں ہی گزاری۔ اس لئے یہ جذبہ قدرتی تھا۔

(۱۱) غزل تو بغیر رندی اور شوخی کے لطف ہی نہیں دیتی اس لئے انھوں نے غزلیں لکھی بھی کم ہیں

اور جو ہیں وہ بھی قصائد کے شروع کے تہیدی رنگ تغزل کی طرز کی۔

نمونہ کلام سے جو ذیل میں درج ہے، ان کے کلام کی خصوصیتیں اور خوبیاں خود ظاہر ہو جائیں گی۔

قصائد دیوان کے شروع میں قصیدے کے شروع کے چند شعر جو ہند و حکمت میں ہیں۔ ملاحظہ کیجئے

مگر کہ مرگ۔ دولت بر کند ازیں دنیا	کہ دردِ حق ندارد بجز کہ مرگ دوا
نگار کردہ رخاں دیکار بردہ عمیر	ہی فریبت ایں گندہ پیر پشت دوتا
بلبل و گوہر دارد دہشت گردن و گوش	بزد و زور دارد نہاں چکادہ و پا
ہی بصفتِ ارژنگ چہرہ ارژنگ	کند چو صفحہ ارتنگ خرم و زیبا
ہزار دام و تلہ بر تہادہ دارد سخت	برامت اندر ہریک نہاں و ناپیدا
تو پائی بستہ بدام اندون و پنداری	کہ رستہ گشتہ و آزادہ جوک و بلا
چدار سخت بیابہ نہادت ایں جادو	قوی کند بگردن فگندت ایں رعنا
گرایں چدار بدتری۔ بدر روی از خرچ	در ایں کند بتری چو جاں شوی بصفہ
مکن مقام بویرانہ گر نہ خر کوئی	بروں خزام ازیں خانہ پاک چوں عنقا

یہ مضمون ایسا ہے جس پر قریباً ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن پڑھنے والا یہ محسوس نہ کرے گا کہ ادیب نے کسی کا کوئی خیال جوں کا توں لے لیا ہے۔ عجزہ ہزار دانا کو انھوں نے یہاں بالکل نئے زیوروں سے آراستہ کیا ہے اور اس کے سحر و فوس کو بھی نئے لفظوں میں بیان کیا ہے۔

ایک رزمیہ قصیدے کے چند شعر دیکھئے۔

وہ قصیدہ ہی کیا جو فرہنگ کی درد کے بغیر پڑھا جا سکے۔ لیجئے بالائے سر و پیشانی۔ عہ مشہور نقاش مانی کا نام۔
 عہ ایک دیو کا نام جسے رستم نے قتل کیا تھا۔ عہ مانی کا مرقع تصاویر۔ عہ حکم مہ پائی بند اسپ و استر۔ عہ آلہ۔

روئینہ شاہیں ہانگربا آہنی چنگا لہا گسترہ انھد باختر پرہائے کین و بالہا
 یکشادہ از منقار ہا برسان دوزخ غار ہا فدغار جستہ مار ہا تفتیدہ دُم و بالہا
 پیکار جویان فریخ پیودہ در کیں راہ رنج واز کردہ باتوف و تھنج انگختہ زلزلہا
 زان بانگ ہائے ہم ناک دیدہ شد پیونہ خاک شد سرو خمیدہ چوناک افتادہ استقلالہا
 سقلا بیان تیر جنگ بر خوش بستہ ساز جنگ چون شیر بچگاں بید رنگ جستہ بروں از ناہا
 اندل ہوں افگندہ پاک بسپردہ تن ہا بر ہلاک یا تحت شاید یا مناک مارا دیں احوالہا
 دیکھئے اس قصیدے کا ایک ایک لفظ جنگ کی ہولناکیاں اپنے ساتھ لئے ہے۔ ابن اشعار کو
 ذرا حلی آواز میں ایک ایک مصرعے کے دو دو ٹکڑے کر کے اس بھر کے مخصوص انداز میں پڑھئے تو یقیناً
 سننے والوں کے سامنے لڑائی کی تمام تر سہم نکیوں کا نقشہ کھینچ جائیگا
 ایسی نظم میں شاعر کے سامنے سب سے بڑا کام مناسب الفاظ کا انتخاب ہوتا ہے۔ ادیب
 یقیناً اس کام میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نظم میں زلزلہا کا لفظ پڑھ کر اذا زلزلت الارض زلزلہا و اخرجت
 الارض اثقالہا الایہ یاد آجاتا ہے۔ دیکھئے ان آیات کو پڑھ کر قیامت کا نقشہ اپنی تمام زہرہ گوار حقیقتوں کے
 ساتھ کس طرح انسان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے یہ انتخاب الفاظ کا ظلم ہے۔
 خمیدہ کو مشد اور بچگان کو محفف کرنا بھی زور آور آدمی کا کام ہے۔ ہر کسی کا نہیں۔ ادیب بہت
 مقامات پر الفاظ اور ترکیب میں اس طرح کا تصرف کر لیتے ہیں اور وہ معیوب بھی نظر نہیں آتا۔
 ایک قصیدے کے شروع کے تغزل کے چند شعر سنئے۔

چتر گیسوئے ترا خاصیت بال ہاست ملکوت خوبی مسلم زیں سبب عو کے تراست
 نور نگارستان چیتاں نگارے کس ندید باچیں ناز و ملاحت ہا کد روی کے شہاست
 ماہ راز آفتاب و آفتاب چرخ را ہم ز خورشید و گر یعنی ز روی تو ضیاست

چینتاں دیکھئے۔ ادیب کی اپنی ترکیب ہے اس طرح وہ کئی نئے لفظ گھڑیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر طاقت و شاعر قواعد و ضوابط اور حدود و قیود کی پابندیوں کو اپنی آزادی اور آزادی کے خوف کے منافی سمجھتا ہے۔ اسی قصیدہ میں ایک شعر ہے۔

روز ہاں گر دگل می گرد و شب برگرد شمع زندگی جز پرورد پر و انہ سپردن خطاست
پروانے کے رات کے کاروبار تو معلوم عوام ہیں لیکن اُس کی دن کی مصروفیتوں کا حال
اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ اب ادیب کے اس شعر سے معلوم ہوا کہ یہ ننھی سی جان رات
بھر شمع پر قربان ہوتی رہتی ہے اور دن بھر پھولوں پر نثار اور غالباً یہ بیان درست بھی ہے۔ یہ نہایت
چھوٹی بظاہر حقیر سی ہستی جس کا سینہ سوز بے پایاں کا خزینہ ہے دن بھر بیکار کس طرح بیٹھ سکتی ہوگی۔
جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے۔ ادیب کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی حب

وطن ہے۔ چنانچہ درالفاظ و انباء ہندواں فرمایہ ہندو سے یہاں مراد ہندوستانی ہے۔

چشم روشن بین آدم اندکے چونم گرفت	دیو آنگہ کام خود از حضرت آدم گرفت
چوں غبار غفلت بر چشم جم پردہ کشید	دیو فرصت دید شد از کلک جم خاتم گرفت
ہاں وہاں لے زادہ ہندوستان ہشیار باش	کر و اغفال دیوت را و صوت و دم گرفت
گر بُدے با خاک انبوہ بدے بہتر ازیں	کز شمای رنگ لندن سلیج و جلم گرفت
آبروئے ترک و ہندو بزدلیں ریزید چوں	لندنی جنا گرفت و دوس رود زم گرفت
وز ہر کس کہ بچا و را خیانت در سرشت	از برائے خویش اورا خاصہ و محرم گرفت
شورش ہندوستان بر لندنی از کار تو	بر تو ماتم گشت و ہم از کار تو ماتم گرفت
بہر او آباد و بہر تو خواب از دست تست	اے شگفتایک زیں ایں دو صفت با ہم گرفت

لے انگلی۔ لے دریا کا نام۔

چوں خدا تاں داد بخش دل فرام آید
آں شنیدی کہ قوم متفق عالم گرفت
بیکدی تاں راست خوابد کرد این بالائے کوثر
ساہا از دودی تاں راست بالائے گرفت
متفق بودن ہم اے زاد ہندوستان
شد بام عرش بر ہر کوچن سلم گرفت
کردہ دین عیسوی تزویج اندر ملک ہند
ہر کیشے کو بدزدی چا دراز مریم گرفت
انگریزوں سے خطاب ہے۔

ہریدی در ہر کجا یرسم کہ صادر شد ز تو
ہیں مہر ظن کش دیرد ہر لایہ قم گرفت
در حواس دہر بود خوف نیاں و ذہول
ہست حاضر گرز تو واضح و گریہم گرفت
آنچہ در ہندوستان از قتل و تہ و ملبس رفت
بر تو باد امراہ ہر یک آسمان مہر گرفت
ان اشعار میں چند چیزیں قابل غور ہیں۔

(۱) کسی قوم کے غافل ہو جانے پر سلطنت اس سے چلی جاتی ہے ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہوا۔
(۲) محکوم قوم کے خائن لوگ حاکم کے مصاحب بن جاتے ہیں۔

(۳) وہی ملک حاکم کی اغراض کے لئے آباد اور محکوم کی محرومی کے لحاظ سے ویران بن جاتا ہے۔

(۴) محکوم قوم کی اپنی بد اعمالیوں سے ملک میں صف ماتم بچھ جاتی ہے۔

(۵) ہندوستان کی مختلف قوموں کو یکدی اور اتفاق کی ترغیب۔

(۶) عیسائی پادریوں کی شدید مذمت

(۷) انگریزوں کو تنبیہ کہ ایک دن آسمان تم سے مظالم کا بدلہ لے گا۔

ایک اور قصیدے کے اشعار ہیں۔

ایروں منم از کار ہند و ز روز تیر و تار ہند
کیفر ازین جبار ہند یا آہ دل خواہم کشید

سہ زینہ ۔ سہ نہ لکھا گیا ۔ سہ غفلت ۔ سہ سزا بدلہ۔

خواہم زہد کاں بہتے تا گیر دم دل قوتے وز قوت دل سطوتے یا بہتے کزوئے شہید^۱
 زیں دم کہ آتش ے جہد دشمن آتش کے رہد وراز تنش دریا زہد گرد چو نفث آئچہ زہید^۲
 انگریزوں سے خطاب

در کا زنامہ روز و شب دیدار تو افتادہ شغب ایں گنبد و دار و لب در زیر دندان میگزید
 تا افگند در گوترا آں گو کہ بیرون شوترا زانجا بر وزو شو ترا ناہید بدستانے پدید
 گردوں ہمہ تن سینہ باد و آں سینہ پراز کینہ بار و آں کینہ اش دیر نیہ باد چوں باتو خشمیں بستہید^۳
 باہر کہ در آمیزشی نہ ہفتہ در آویر شی در شہر شور انگیزشی جز تو کجا کس بگرید
 عہد تو با کس بستہ نیت کاں زان پس شکستہ نیت دل نہ کہ خارت خستہ نیت کز بلاغ تو دل نشگفید
 بدخونی تو بیم ہا افگندہ در اقلیم ہا وز کا جہا و تیم ہا آسودگی از تور مید
 اس قصیدے سے ادیب کا انگریزوں سے شدید جذبہ انتقام ظاہر ہوتا ہے اور حد درجے کی
 نفرت سینہ و کینہ والا شعر کتنی زوردار اور سنگین بددعا ہے۔ اس شعر سے انگریزوں کے خلاف ادیب
 کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کسی بددعا میں اتنی شدت کبھی نہیں دیکھی۔ کائنات کی تمام
 نصا ایک سینہ بن جائے۔ پھر وہ سینہ کینے سے بریز بھر جائے۔ اس کینے میں پرانے کینے کی تندی اور
 سختی ہو اور پھر زمانہ اس کینے کے ساتھ انگریزوں سے انتقام لے۔

انگریزوں کی ہر ظاہری آمیزش کو باطنی آویزش کہا ہے اور یہ مبالغہ بھی نہیں۔ انگریزوں کے
 ہمدرد پیمان کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان انگریزوں کے خلاف ہمیشہ یہی شکایت
 کرتا رہا ہے۔ روئے زمین کے ہر گوشے میں انگریزوں نے جو بے اطمینانی پھیلائی ہے اس کا ذکر
 بھی کیا ہے۔

۱۔ ڈرتا تھا۔ ۲۔ آتش سیال۔ ۳۔ پانی کا بہنا۔ ۴۔ رات شب۔ ۵۔ لڑنا جھگڑنا۔

ایک اور قصیدے سے تغزل کے چند شعرا و ہندوستان کے متعلق کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہر کجا خوبے ست من مولا نیش	عاشقِ خال و خطِ زیبا نیش
ناظرِ خورشیدم اندر ہرافق	ہر کجا خورشید من حرمِ نیش
ہر گلے کز ہر چمن خداں شود	من چو بلبل شاد با سودا نیش
روحِ راجوں جز شمشیں مایہ نیست	ناں غلامِ زلفِ عنبر سا نیش
باد ہانشِ الفتے دارم فنوں	گرچہ من شیدائے سرتاپا نیش

اے برادرِ کشورِ ہندوستان	دیدہ ام دوشینہ در رویا نیش
بر مثالِ مرغِ بے بال کز	نالہ زارش کنوں دروا نیش
شد مصور پیشِ چشمِ ہچو ماہ	ہمت و دیدم در آں اثنا نیش
گفت ہمت گرچہ بالش سودو پر	من مسیحِ بال و پر بخشا نیش
گفت ہمت ہر کہ شد در من فنا	تا قیامت ضامنِ بقا نیش

یہاں ہندوستانیوں کو آزادی حاصل کرنے کے لئے کمر ہمت باندھنے کی ترغیب دی ہے

ایک اور قصیدے میں انگریزوں سے خطاب ہے۔

اشرِ بند تو بود ہند و کنوں کس گرفت	جاں برد سارباں چوں شتر آورد کیں
بندِ عقال ترا زانوئے او بُدِ مکاں	برہو پہلوت گشت جائے عقالش مکیں
مار فسون خواندہ بود ہند بدستِ اندرت	مار فائیندہ را مار کشید با یقین
بس رگِ جانِ کساں گشت گستہ ز تو	بگسلد روزگارِ نیرو و رید و تین

لے جانے سے کتاب پرست۔ لے دوا شیدا متیر۔ لے زانو بند شتر۔ لے مار گیر۔ لے رگِ قلب،

بر تو کشادہ مباد چرخ ہر دی و برو جز کہ میا فدرہ خشم جز کہ در افکنده چین
کشتی عمر تو باد رفته فروخت نخت تختہ در قلم و تختہ در بحر چین
خواستہ ام از خدا تا کہ بہ بینم ترا روبہ ذمہ در تلہ گر بہ بے پوستیں
لوح دعائے مرا بخش نگار قبول اے کہ کف فیض تو نیست بخشش ضنین
شروع کے شعروں میں ہندوستانیوں کی سیاسی بیداری کا ذکر ہے اور آزادی ہند کی
پیش گوئی ہے جو بفضلہ تعالیٰ پوری ہو رہی ہے۔

اس کے بعد دعا ہے۔ یا بالفاظ دیگر انگریزوں پر بددعا۔ ان شعروں کے ایک ایک لفظ
سے خلوص۔ حب وطن اور بغضِ اغیار کے جذبات پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ ادیب کا جسم ایران میں اور دل ہندوستان میں ہے۔ یہ خلوص و درد اور روز و گداز سے بھری ہوئی دعائیں
آخر قبول ہوئیں کیونکہ خدائی الواقعہ دعائیں قبول کرنے میں بخیل نہیں۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست
(حافظ)
ادیب کی خمریات کا اسلوب ان اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے۔

ساقی مگر رہ جائے آتش زینا رختہ آتش بے سرمائے دی در جام صہبار رختہ
ساقی بے افکنده پے در جام جم پالودہ وز نوش لب دادے کے ہنر خم دہار رختہ
چوں با جگر آمیزد تفت از جگر انگیزد سستی زتن بگزیدت گرد ز اعضا رختہ
چوں ماہی بریاں اگر بچیدہ دستار در صور سرافیلے نگر کاوائے اجار رختہ
سوز ز آغازت زباں چوں پور عمراں بگیاں وانگہ بفرقت را بگیاں نور تجلہ رختہ

لے ابرو کا مخفف۔ لے بخیل۔

ہندوستان کے متعلق ایک اور قصیدے کے کچھ شعر دیکھئے۔

باغی لے ہندوستان یک ویا گلہ بزاں	کت بود گر گے شاں و زارغ دوں خیا گرے
چوئی لے خاندہ شکر طوطی شیریں مقال	کت بود زارغ خطیب بر شدہ ہمنبرے
جز مگر بیدانشی و جز مگر ناداں امیر	نیست لے ہندوستان ہیچ گناہ دیگرے
عاقے نواب و مہراج تراچوں دیہ گف	اینست غافل مہترے آنست بجاہل سرورے
دزد کا فرخوی و تونادان وزیرے پاساں	گر برد یکبارہ نبود معجب و مستنکرے
لے مسلمان مر تراوے برہمن ہم مر ترا	از ثریا بردایں بیدانشی اندر ترے
خانہ زان تو و بیگانہ در آں فرماں روا	پس مگر خانہ من است این عاریت اں یا کرے
لے مسلمان وے برہمن النجا ثم النجا	تا کہ ملک تے دریغ آید ہر چوں دلبرے
باتوے گویم مباش لے سادہ دل ہندو سپر	در طریق جاں سپاری کم ز ہندو دخترے
چوں سپردہ شد طریقت کفر و دیں گرد دیکے	بیگمانت این زمین بایست کردن بادے
موردش اینجا ست لے ہندو کن دیکر جہاں	خضم کار افزا ست کم کن لے مسلمان باجرے
شش جہت گرد دیکے چوں بگری زین چنبرہ	حق پرستاں را چہ قبلہ آدر و چہ ایدرے
سوئے آتش لے برہمن شاد و ہموچوستی	سوئے شمشیر لے مسلمان شاد و چوں جعفرے
گریہ باشد زبوں چوں دل فراہم نیست موش	مور خاطر جمع در دیو ست بر شیر زے
از غمت لے گلستان ہندو زو شب منم	رستہ اندر آب چشم خولیش چوں نیلو فرے
تو بدیں جانے کہ داری ننگ ہر جانادری	شہسوارے شو کن خربندگی پیش خورے
تو بیدار اندر آوی و سچو مرداں تیغ زن	بزم مرداں را شاید جز حینس ساغر خورے
جز کہ دیو و دزد بہر جان اہل آسیا	بچہ ہرگز نزادہ در اروپا مادرے

ہندوستانیوں کو مذہبی جھگڑے چھوڑنے کی اور وسعت مشرب کی ترغیب دی ہے۔ راجاؤں اور نوابوں کا گلہ کیا ہے۔ دل مضبوط رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ ہندو مسلم اتفاق پر زور دیا ہے۔ ہندوستان کی بدحالی پر اپنی تاریخی بیان کی ہے اور آخری شعر میں یورپ اور ایشیا کے متعلق جو کچھ کہا ہے، اس کا ایک ایک حرف حقیقت کا آئینہ ہے۔

تجدیدِ مطلع کے بعد پھر اسی قصیدے میں کہتے ہیں۔

آمد اندر کشور ہندوستان سوداگرے	کردہ پنہاں زیر خاکستر بھلیت باغگرے
بعد چندے زیر خاکستر فروزینہ نہاد	تاکہ دود فتنہ بالا زد سراز ہر کھورے
آسمان با آزاوا از چشم سوزن تنگ تر	ویند میں دھکا زیا چوں زہدست ندرے
کشتی کیدش ریاں عراہد مکش دواں	آں میان بکھراوین دیمیان ہر برسے
ہم بدیں پیاں وعہ کاہد ز لندن تا کجا	تالیںچوں ہم ز سچوں زد سوئے پیشاورے
ہم ہوا مسموم گرد ہم زمیں زہر آب دم	ہر کجا زیں قوم یکتن بگذرد چوں عابرے
کار ایریاں این چنین نساختہ از ساز کیت	کش نہ بنابہ بماندہ در کفت و نہ بنصرے
آنچہ اکنوں میرود زیں قوم اندر مصر و ہند	در بخارا از تتر ہرگز نرفت و در ہرے
نیت مارے دین غارے کہ ہر زہر او	خلق تر باقے نکر دونا فرید و نترے
ہر زہر تو قضا خواہد فرستادن ز غیب	زہر کش تر یا کے و ہم مار گیر افسونگرے
طبل رسوائیش در عالم کبوب لے عدل حق	بہر عدل تو نخواہد یافتن کس داورے
اضطرائش باعث آلام جان عالم است	زندہ کن عالم ہر گاہیں چنین بدگوہرے

ان اشعار میں انگریزوں کا ہندوستان میں سوداگر بن کر آنا۔ زیباستیں خاکستر میں فتنے کی

لے خس و خوار و خاک۔ لے تانار

جنگاریاں لاتا۔ انگریزوں کی بے انتہا جوع الارض۔ ان کی مقراض کی پیراہن نوازی۔ جھوٹے عہد پیکار کے ذریعے کہاں سے کہاں تک پہنچنا۔ جہاں جانا وہاں کی ہوا کو زہریلا بنانا۔ مختلف ممالک کو قطعاً بے دست و پا کرنا۔ انگریزوں کو سانپ کہتا اور ان کے زہر کے لئے خدا سے تریاک کی دعا کرنا اور ان پر بددعا کرنا مندرجہ بالا اشعار کا ماحصل ہے۔

غزلیات | اب ادیب کی غزلیات کے چند شعرو درج کئے جاتے ہیں۔ تاکاُن کی غزل کے انداز کا اندازہ ہو سکے۔

از فراقِ روئے تو اشب مرا میر سدا میں نیمہ جاں برب مرا
گر مسماں وہ کہ کافر خوانیم نیست جز عشق اے صنم نہ سہ مرا

چوں کبوتر مرغِ دل در دست تست پرنیاں در پنجہ مشا ہیں مرا
آں فوں گر گیت کز افسوں او گشتہ آئینِ شمن آئیں مرا

۱۔ بت پرست

دل نہ تھا بتواز کون و مکانِ مشتغل است کہ بسودائے تو زانہ لیسے جاں مشتغل است
مردم دیدہ ازاں لحظہ کہ از روئے تو گل چیدن آموخت ز گلزارِ جاں مشتغل است

۲۔ مستغنی

بر سماعِ بلبلان گل جامہ ے دردِ بشوق تانہ پنداری ز شوقِ بلبلان آگاہ نیست
نیتی آسودہ خاطر زانکہ از شاخِ رطب دستِ تو کو تانہ و دستِ آرزو کو تانہ نیست

دانہ و دامم بجز خال و خطِ خویاں مباد زانکہ کار و بارِ گیتی غیر دانہ و دام نیست

کرد غارت چشم تو خواہم از آنک روز و شب چشم تو جز خوابیدہ نیست

ازیں محیط کہ سپہیل کرانہ نیست پدید بجز بے توانیم بر کنارہ کشید
بیار جام ہلالی تو اسے برخ چوں ماہ کہ بدر ویم میں داس - غم زد دل چو خود

در صورت لیلی ہمہ کس دیدہ یعنی نگریت ہماں دیدہ کہ مجنوں خدنی بود
ہر سینہ بجز سینہ موسیٰ پے آتش کہ طور پر فروخت نہ کانوں شدنی بود
عشق تو یکے خانہ ہے جت در آفاق بر کلبہ آدم زد و مسکوں شدنی بود
قانع شدے از لب شیرین تو بائے گر چارہ میخوارہ با فیوں شدنی بود

باخوئے جاں ساختے چوں دگراں من
گر مہبت من چوں دگراں دوں شدنی بود
بر کلبہ آدم زد دلے شعر کے ساتھ حافظ کا یہ شعر بھی پڑھ لیجئے۔

چلے کر درخش دید ملک عشق نہ داشت عین آتش شد ازیں غیرت و بر آدم زد

بہار آمد ہموارہ در گلستاں باش بہر کجا کہ دہر گل ہزار دستاں باش
چو غنچہ خون جگر میخوار از دہوں لیکن بچشم خلق چو گل تازہ روی و خنداں باش
ز خود چو مایہ ندارد از اں بکا ہواہ ہمیشہ از گہر خود چو خورزاں لٹاں باش

دوسرے شعر کے متعلق حافظ کا شعر بھی سنئے۔

بادلِ خویش لبِ خداں بیاہد بچو جام
نہ گرت نہ خمر رسد آئی چہ نے اندر فروش

مے قندہ اتفاق ہواں ہا دوسے مکول اشتغل از خلق و جہانے بتو مشغول

سحر جوئے نسیمت بخرہ جاں سپرم اگر اماں دیداشت فراق تا سحرم

بکشت غمزہ خونریز تو مرا صد بار من از خیال لب جانغرات زندہ ترم

برغم فلسفیاں بشنوائیں دقیقہ ز من کہ غائبی تو دہر گز ز رفتی از نظم

ساقی بیا و در گہ مے خانہ باز کن مطرب تو نیز پردہ متانہ ساز کن

طرز غزل رہا کن و حکمت طراز باش بشنوز من حقایق و ترک مجاز کن

مکن اسے خواجہ ملامت کہ پس از عہد شباب ہوس دلبر و را مشگرو ساقی دارم

دام ایام جوانی ست کہ نگزاردہ ماند خواہم۔ ار عمر امانے دہم۔ بگزارم

ز شمشیر محمود بزدہ تر نگاہے کہ چشم ایاز آورد

مندجہ بالا تین شعر اور مجنوں شدنی والا شعر مرزا عبداللطیف خاں نے خاص

طور سے دیوان ادیب سے منتخب کئے تھے۔

قطعات | چند متفرق شعرا در سنئے۔

برز نیستی و ز ہستی ست پایہ ام مارا مجال بحث وجود و عدم کجاست

گیتی پُر از خان پرندہ ز باد ہاست مردے چوکوہ ثابت و راسخ قدم کجاست

بگذرازیں ہمہ کہ ز دل رست بیخ غم یہ کہ بر کند ز دلم بیخ غم کجاست

ظلمت فرا گرفت اقالیم شرق را رخشنده آفتاب کہ رو بہ ظلم کجاست

آتشی کز جگر جام دلم را بفسر وخت • دود ازین ملک دوسہ روزہ بر آورد و بسوخت

سندباد

از ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ڈی لٹ پیرس

”یہ مختصر سا مقالہ میں نے زمانہ قیام یورپ ۱۹۳۲ء میں ایک فاضل ترکی دوست کی فرمائش پر لکھا تھا لیکن اُس وقت سے اب تک یونہی میرے مسودات میں پڑا رہا اب برہان میں شائع کر رہا ہوں شاید ارباب علم اسے دلچسپی سے پڑھیں“

عبداللہ چغتائی

سندباد صاحب برہان قاطع کے بیان کے مطابق ایک کتاب کا نام ہے جو حکمت میں ہے اور ابو بکر ازرقی نے اسے نظم کیا ہے جو ابو الفوارس طغان شاہ بن الپ ارسلان محمد بن جغری بیگ سلجوقی کا مداح تھا لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ”سندباد“ دراصل گشتا سپ بن لہر اسپ کے لڑکے کا نام ہے جو اسفندیار کا بھائی اور قدیم ملوک فرس میں سے تھا۔ اور بقول ریاقوت حموی۔ قدیم قلعہ باب الان کا بانی تھا۔ حکمت و دانش میں یدِ طولی رکھتا تھا۔ اس نے حکمت و نصیحت اور عقلیات میں ایک کتاب بھی تالیف کی تھی جو غالباً اس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہی ”سندباد نامہ“ کہلائی۔ شیخ سعدی بوستاں میں لکھتے ہیں ۵

۱۔ ملاحظہ ہو برہان قاطع و قہرنگ انجمن ارا نے ناصری و مصنف قلم و کاوہ پریس مطبعہ ص ۱۳

۲۔ معجم البلدان مطبوعہ یورپ ج ۱ ص ۳۱۵

چہ خوب آمد این نکتہ در سندباد کہ عشق آتش ستائے پسر پندباد
بعض لوگوں کے نزدیک سندباد کے معنی یا حقیقت واضح نہیں ہے انھوں نے اسے "سندباد"
پڑھا ہے حکیم ازرقی نے ایک قطعہ میں یوں لکھا ہے

زاں پیشتر کہ چشم کشا تم ز خواب خویش در خانہ گردم بہ قضائے بام داد
از کیہ ورع شمارم بہ پیش او گفتار شاہنامہ امثال سندبام
بعضوں نے سندباد کو بروزن بغداد لکھا ہے اور دال کو حذف کر دیا ہے۔ یہ ایک مجوسی کا نام
تھا جو نیشاپوری الاصل اور مذہبی فرق کے باوجود ابو مسلم مروزی کے ساتھ گہری دوستی رکھتا تھا۔
بعضوں کے نزدیک "سندباد" کے لغوی معنی تپھر کے ہیں جس پر شمشیر وغیرہ تیز کرتے ہیں جس کا "سنباج"
معرّب ہے۔ مگر کتاب سندباد قصص و حکایات ایران و ہند پر مشتمل ہے۔ اسلام سے قبل تالیف
ہوئی۔ مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذهب میں "باب اخبار ہند و ملوک قدیمہ" کے تحت یوں بیان
کیا ہے۔

ثم ملک بعده کوش بجا حدث ہند ارار فی الدیانات علی حسب ارای من صلاح الوقت
و یا یحمل من التکلیف اہل العصر و خرج من مذہب سلف و کان ملکتہ و عصرہ سندباد
”ولہ کتاب الوزرار السبعۃ و العلم و الغلام و امرة الملک و ہند (ہو) الکتاب المترجم
بکتاب السندباد“

ابن ندیم (متوفی ۳۸۵ھ) نے اپنی تالیف کتاب الفہرست میں "اخبار السامریہ و المحدثین
و اسماء الکتاب المصنف فی الاسمار و الخرافات" کے تحت بیان کیا ہے کہ کتاب کلیلہ و منہ کے متعلق
اختلاف ہے کہ یہ کتاب دراصل ہند میں تصنیف ہوئی جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے

لہ دیوان ازرقی مخطوطہ ایڈیشن موزیم۔ لہ ملاحظہ ہو۔ مروج الذهب از مسعودی۔

اور اسے شاہانِ اسکانیہ نے تالیف کرایا تھا پھر فارس کو بطور تحفہ دیدیا۔ یا فارس میں تالیف ہوئی اور شاہد کو بطور تحفہ دی گئی۔ ایک گروہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ حکیم بزرگچہر نے اس کو تالیف کیا تھا واللہ اعلم۔ بہر حال اصل کتاب یا تالیف ”سندباد نامہ“ حکماء ہند کی تصنیف ہو یا ایران والوں کی لیکن اس کے قدیم نسخہ کا پتہ ملتا ہے جسے الملک الرضا امیر نوح بن منصور بن نصر بن احمد بن اسماعیل ساسانی (۳۶۶-۳۸۷ء) کے حکم سے خواجہ عبدالغوارس قناذی نے زبانِ پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ابو عریٰظہ بن ابان ابن عبد الحمید الاحقی الرقاشی نے ابتدائی دور خلفائے عباسیہ میں پہلی مرتبہ ترجمہ کیا۔ قناذی کے فارسی ترجمہ کا ثبوت برٹش موزیم کے ایک مخطوطہ سے بھی ملتا ہے جس کا اول صفحہ نہیں ہے اور اس کے دوسرے باب میں جہاں مصنف کا نام لقب وغیرہ درج ہیں یوں مذکور ہے:-

”میگوید مقراین کلمات و محمد و امین مقامات الصدر الاجل الروح ملک الادبا

والکتاب بہار الدین سعد الاسلام صاحب نظم و شعر معجز البیانین منظر اللسانین بحر

الفصاحت والبلاغت مقبل زبان و علامہ جہاں فرید الدھر وحید العصر محمد بن علی بن

محمد بن عمر الظہیر الکاتب السمرقندی لکھ

اس نے بیان کیا ہے کہ ”سندباد“ پہلے قدیم فارسی یعنی پہلوی میں تالیف ہوئی حتیٰ کہ

اسے ابوالغوارس قناذی نے نصیر الدین ابو عمید نوح بن منصور سامانی کے حکم سے فصیح فارسی میں ۵۳۹ھ میں ترجمہ کیا جو تاریخ مندرجہ کے اعتبار سے غلط ہے کیونکہ نوح بن منصور نے

۱۵۱۱ھ میں ندیم۔ کتاب الفہرست (مطبوعہ مصر) ص ۲۳-۲۳۲۔ و مطبوعہ یورپ ص ۳۰۷ و ۳۰۵۔

۱۵۱۲ھ حاشی چار مقالہ علامہ قزوینی مطبوعہ یورپ ص ۱۷۵۔ ۱۵۱۳ھ عربی ادب از پروفیسر کلین مطبوعہ لندن

۱۵۱۴ھ ص ۹۷-۹۶۔ ۱۵۱۵ھ برٹش موزیم فہرست ۲۵۵ ص ۷۸

۳۸۷ء سے ۳۸۸ء تک سلطنت کی۔ کاتب کو تاریخ درج کرنے میں سہو ہو گیا ہے اس کی ادبی حیثیت کے متعلق بیان کرتا ہے کہ سادہ اور غیر مکلف زبان میں ہے۔

غوفی نے اپنی تالیف ”باب الالباب“ میں دق القی المروری کے تذکرہ میں درج کیا ہے کہ:-

”سندباد را لباس عبارت پوشانیده است“ ۱۷

بہار الدین محمد بن علی الظہیر الکاتب السمرقندی کافی عرصہ تک سلطان طغاج خاں ابراہیم کا دیوان انشاء تھا اس نے ترجمہ قناردی کی اصلاح و تہذیب کر کے اس کو ابیات و امثال زبان عربی سے مزین کیا۔ اس بات کو امین رازی نے بھی ہفت اقلیم میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ بہار الدین محمد بن علی نے تین یادگاریں چھوڑیں مثلاً:-

(۱) سندباد نامہ - (۲) اغراض الباست - (۳) سمع الظہیر فی جمع الظہیر - ۱۸

دوسری تصنیف کو قلیج طغاج محض کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بعد وفات سنجر (۵۵۸ء) مکمل ہوئی۔ قلیج طغاج خاں کے متعلق محض اس قدر معلوم ہے کہ یہ چھپن صدی ہجری میں ترکستان میں حکمران تھا جسے ابن اثیر نے ۵۶۲ء کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ رضی الدین نیشاپوری متوفی ۵۹۸ء اس کے عہد کا بہت بڑا شاعر ہوا ہے۔ زیر بحث مخطوطہ برٹش موزیم اس کی تعریف میں یوں لکھا ہے:-

”رکن الدین والدینا غیاث الاسلام والمسلمین فی العالمین قلیج الیکان طغاج خاں

بن قلیج قراخاں“

اس کو عظیم الشان بادشاہ بیان کیا گیا ہے اس نے اپنے دشمنوں کو ۵۶۷ء کے حدود میں توڑا اور انہیں

۱۷ غوفی باب الالباب ج ۱ ص ۹۱ - ۱۸ ہفت اقلیم نسخہ برٹش موزیم لندن ص ۵۵۹ -

۱۹ کشف الظنون مطبوعہ یورپ ص ۳۶۳ - ۲۰ کشف الظنون ص ۳۶۴

شکست دی تھی اور اپنی سلطنت کو وسعت دی اور انصاف بحال کیا۔

متذکرہ بالا بیان کو مد نظر رکھ کر علامہ قرظی نے شرح چار مقالہ میں فرماتے ہیں کہ سندباد کا نسخہ پیش موزیم جو بہا الدین ظہیری سمرقندی کی طرف منسوب ہے عوفی کی تعلیقا کرتا ہے۔ البتہ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کے دو نسخے ہوں ایک مروزی اور دوسرا بہا الدین ظہیری سمرقندی کی طرف منسوب ہونے والا لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ ظہیری اور مروزی بمعصر ہیں اس لئے دونوں ایک ہی کتاب کی اصلاح و تہذیب اپنے ذمہ لے لیں ذرا قابل غور معلوم ہوتا ہے۔ اول الذکر قلیچ طغاج خاں کا صاحب دیوان تھا۔ جبکہ "سندباد نامہ" سے ظہیر سمرقندی کا تعلق معلوم ہوتا ہے اور پھر عوفی خود بھی مروزی اور ظہیری کا بمعصر ہے اور مروزی سے اپنی ملاقات بیان کرتا ہے۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ عوفی کو سہو ہو گیا ہے۔ دراصل سندباد نامہ کی اصلاح و تہذیب دونوں کی نہیں ہے بلکہ ایک ہی نسخہ کی ہے اور وہ بہا الدین ظہیری سمرقندی کی طرف منسوب ہے حاجی خلیفہ صاحب کشف الطنون بھی عوفی کے اس قول میں متردد معلوم ہوتا ہے۔

غرض کہ متذکرہ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوالفوارس قناوڑی نے سندباد کو قدیم پہلوی زبان سے نوح بن منصور سامانی کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا اور بعد میں بہار الدین الظہیری السمرقندی نے اس کی اصلاح و تہذیب کی پھر حکیم ازرقی نے اسے نظم کیا۔ اس کے قصیدہ کا وہ حصہ جو عند الدولہ ابوبکر طغان شاہ کی مدح میں ہے ملاحظہ ہو۔

شہر یارا بندہ اندر مدحت فرمان تو مگر تو اندر نہ بناید ز معنی ساحری
ہر کہ بند شہر یارا پند ہائے سندباد نیک داند کا اندر و دشتوار باشد شاعری

۱۔ حواشی چار مقالہ ص ۱۷۱ و ۱۷۲ و ۱۸۹۔ ۲۔ کشف الطنون ص ۱۷۱

۳۔ دیوان الدیوبیش موزیم ۳۷۱۳۔ ۴۔ دق ۲۵۹

میں مایہ ناز اور یاد انش کسم گو کند بہت تو شاہ کاظم را باوری
اگر فی الواقع ازرقی کا یہ نسخہ نظم و جود میں آیا تھا تو کم سے کم آج کا پیدھنر وہ ہے اندر آفر
ہیں ایک نسخہ بنام "سندباد موجود ہے" جو ۱۷۷۷ء میں نظم ہوا جس کا ناظم یعنی مصنف کوئی
نامعلوم شخص ہے۔ علامہ قزوینی کا قول ہے کہ یہ نسخہ عیوب سے پر ہے۔

اس مختصر مضمون سے صرف "سندباد" کی تاریخی ادبی، اور ثقافتی حیثیت و حقیقت
پر روشنی ڈالنا مقصود ہے کہ نفس کتاب کی تفصیل۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (۱۹۵۷ء) میں اسے سندباد نامہ کے زیر عنوان درج کیا ہے
اور لکھا ہے کہ یہ ایک مجموعہ مقصص ہے جن کا عام مفہوم یہ ہے۔

ایک بادشاہ اپنے لڑکے کی تعلیم کو ایک فاضل "سندباد" کے سپرد کرتا ہے وہ اتالیق اس
لڑکے کو سات یوم خاموشی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ بلکہ اس لڑکے کو اس عرصہ میں
تہمت لگاتی ہے اور بادشاہ اس کو جان سے مارنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس بادشاہ کے سات
خدیو ہیں ان میں سے ہر ایک ایک یا دو قصے سنا کر اس لڑکے کے قتل کو ملتوی کر دینے میں کامیاب
ہو جاتا ہے۔ اب آٹھویں روز لڑکا اپنی خاموشی چھوڑ کر گفتگو شروع کرتا ہے تو بے گناہ ثابت
ہو جاتا ہے۔

بہر حال یہ کتاب مسلمانوں کا ایک اثر ادبی ہے اور اس سے ان کے ذوق قصہ گوئی
پر روشنی پڑتی ہے۔

سہ از ایچے مولف فہرست مخطوطات اندر آفر ۱۳۳۶

دنیا کے تین جاہلی تمدن

از جناب مولوی صالح صاحب اعظمی جالپور

دنیا میں انسان کی زندگی کے لئے جو نظام نامہ بھی بنایا جائیگا اس کی ابتداء لامحالہ چند بنیادی عقائد سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا ہر تاؤ پہاں کیا ہونا چاہئے اور کس طرح اسے اس دنیا میں کام کرنا چاہئے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا اور اس کائنات کا نظام کس ڈسنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈسنگ کو سمجھنا آہنگ ہونا چاہئے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا۔ پھر اسی نظریہ اخلاقی کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی۔ پھر اسی سلسلے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورت میں اختیار کریں گے، اور آخر کار تمدن کی پوری عمارت ان ہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دنیا میں اس وقت تک انسانی زندگی کے لئے جتنے مذہب و مسلک بنے ہیں ان سب کو بہر حال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریہ اخلاق مرتب کرنا چاہیے اور اصول سے لیکر فروعات تک میں ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے جو چیز ممتاز کرتی ہے، وہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطہ نظر ہے، کیونکہ ہر دستہ انسانی

کامزاج اس چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے اور یہ اس کے قاب میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا میں سب سے قدیم جاہلی تمدن یونان کا ہے جس کے افکار و نظریات پر دنیا کی تمام جاہلی تہذیبوں نے اپنا نشیمن بنایا ہے اور موجودہ مغربی تمدن بھی کوئی ایسا نو عمر تمدن نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں نہ ہوئی ہو، دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال کی پرانی ہے، اس کا تعلق یونان اور روم سے ہے، ان دونوں جاہلی تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام، اجتماعی فلسفہ، اور مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر اور عقلی اور علمی سرمایہ چھوڑا تھا۔ وہ سب کے سب اس مغربی تمدن کے حصہ میں آئے۔

یونانی تہذیب و تمدن | یونانی تہذیب موجودہ مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا واضح مظہر اور نمونہ تھی یہ پہلی تہذیب تھی جو خالص مغربی فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہوئی، اور اس میں مغربی نفسیات کا پورے طور پر ظہور ہوا۔ یونانی تہذیب کے کھنڈر پر رومی تہذیب کی تعمیر ہوئی۔ جس میں بھی وہی یونانی روح کام کر رہی تھی۔ مغربی قوموں نے صدیوں تک ان دونوں تہذیبوں کی خصوصیات کو حرز جاں بنائے رکھا، انیسویں صدی میں انھیں خصوصیات کے ساتھ انھوں نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا، اس لباس کی چمک دمک سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ نیا ہے لیکن دراصل اس کا تانا بانا یونانیوں کا اور رومیوں کے ہاتھ کا کاٹا ہوا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یونانی اور رومی تہذیبوں کا مطالعہ کیا جائے تاکہ بصیرت اور معلومات کے ساتھ مغربی تہذیب پر تنقید کی جاسکے۔ یونانی تہذیب کو اگر اندر سے کھنگالا جائے تو اس کا ایک مخصوص مزاج معلوم ہوتا ہے، اور اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

- ۱۔ یہ ایک غیر خدا پرستانہ تہذیب تھی، ان کے یہاں کسی حاکم علی الاطلاق کا تصور نہیں پایا جاتا، اور تقریباً خدا کے وجود میں بھی اشتباہ ہے۔

۲۔ آخرت کے تصور سے خالی، اور روحانیت سے بے نیاز۔

۳۔ عاجلہ پرستی اور دنیاوی فوائد و لذائذ کا اہتمام شدید

۴۔ وطنیت اور قومیت کے بت کی پرستش اور عبادت۔

یعنی مختصر لفظوں میں اس کی تعبیر ایک لفظ ”مادیت“ سے کی جاسکتی ہے، پس یونانی تہذیب کی نمایاں خصوصیت مادیت ہے اور یہ خصوصیت یونان کی ایک ایک چیز سے ظاہر اور عیاں ہے آپ ان کے لٹریچر کا مطالعہ کریں تو ان کی شاعری، ان کا فلسفہ کائنات، ان کے دین، سب ان کی عاجلہ پرستی اور مادی دلچسپیوں کی غمازی کریں گے۔ ان کے یہاں خدا کا ایک موہوم اور دھندلا سا تصور پایا جاتا ہے، ان کا نظریہ کائنات بالکل مادی ہے، خدا کی صفات اور اس کی قدرت کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ بت پرست قوموں کی طرح ان کے یہاں بھی خدا کے کام دیوتاؤں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں، ان کے یہاں بھی ایک روزی کا دیوتا ہے، ایک رحمت کا اور ایک قہر و عذاب کا، ایک محبت کا اور ایک حُسن کا۔ ارسطو کے فلسفہ میں ”عقول عشرہ“ اور ”افلاک تسعہ“ کا جو شجرہ ملتا ہے وہ بھی اسی مادی عقلیت کا کرشمہ ہے۔

ڈاکٹر اس نے جینو اس ”یورپی تہذیب و تمدن کیا ہے؟“ کے عنوان سے تین لکچر دیئے تھے جو یونانی تہذیب کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں، ان کا اقتباس ہم مشہور ترک خاتون خالدہ ادیب خانم کے توسط سے نقل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

”موجودہ مغربی تہذیب و تمدن کا مرکز قدیم یونانی تمدن تھا۔ اس کا اصل بلاصول انسان کی

تمام قوتوں کا ہم آہنگ نشوونما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا

تھا، ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے، جسمانی تربیت، مذہبی کھیلوں اور

رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ذہنی تعلیم جو شاعری، موسیقی، ڈرامہ، فلسفہ

سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی، ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے پائی تھی تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہنچے، یونان کے مذہب میں نہ روحانیت کا عنصر ہے نہ باطنیت کا نہ علم دین ہے نہ پیشوایان دین کا طبقہ۔

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تمدن سرتر یا خدا سے بغاوت پر قائم تھا اور ایک یوم آخر کے تصور سے نابلد، ان کے نزدیک نفع عاجل ہی سب کچھ ہے۔

کسی قوم کے آرٹ اور کلچر سے آپ اس قوم کے مخصوص رجحانات کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ یونان کے لٹریچر اور ان کی خرافیات (میتھالوجی) کے مطالعہ سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ جو قوم حسن و عشق کے دیوتا رکھتی ہو۔ جہاں دیوتاؤں کے حسن و عشق کے قصے مذہبی روایات کا درجہ رکھتے ہوں۔ کیا یہ خدا اور آخرت سے بے پروائی کا نتیجہ نہیں؟

تاریخ اخلاق کا مصنف "لیکلی" لکھتا ہے کہ یونانی تحریک تمام تر عقلی اور عیش پرستانہ رجحانات رکھتی تھی۔ تاریخ یونان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں مذہب کے مراسم میں بھی جن، کھیل، تماشے کی اتنی آمیزش پائی جاتی تھی کہ جس کا تصور ایک مذہبی اور خدا پرست انسان کر نہیں سکتا تھا ان کے یہاں خدا کا تقدس سب اسی درجہ کا تھا جتنا کسی بزرگ شخصیت کا ہوتا ہے اور اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا اس کی عظمت و تمجید کے لئے بالکل کافی تھا۔

یونانیوں کے ان مراسم پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ جو قوم اتنی مادہ پرست اور خود گر محسوسات ہو جس کے عقائد مراسم پرست ہوں، جو ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کا کوئی اچھا تصور نہ رکھتی ہو، جو اس کے حاکم علی الاطلاق اور قادر فعل و تصرف کا عقیدہ نہ رکھتی ہو، جو خدا کو ایک معطل اور بے صفت وجود مانتی ہو۔ جس کا نظریہ کائنات یہ ہو کہ یہ کائنات بے مقصد اور بے غایت ہے تو

اسے تاریخ اخلاق یورپ از لکلی ترجمہ مولانا عبد الماجد صاحب بی۔ اے دیوباد دی۔

لامحالہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی زندگی میں خدا سے کوئی دلچسپی اور تعلق نہ ہوگا۔

عقائد کا اثر علی زندگی پر | ان عقائد کا اثر یونانی معاشرت اور سوسائٹی پر یہ ہوا کہ دنیاوی لذائذ کی قدر و قیمت میں افراط و غلو، مجسموں اور عریاں تصویروں سے دلچسپی، سرود و موسیقی سے اہٹناک فنون لطیفہ کی قدر دانی اور غیر محدود شخصی آزادی پیدا ہوئی اور زندگی سے زیادہ تمتع اور لطف اندوزی اور بوالہوسی کا داعیہ شدید سے شدید تر ہو گیا اور ان کے اسی چٹور پن نے ان کے تمدن کے قصر رفیع کو بالآخر پیوند خاک کر دیا۔ اور ان کے اندر بد اخلاقی اور فحاشی اتنی عام ہو گئی کہ زندگی اور اخلاق کی قدیں بدل گئیں۔ اس دور میں زنانِ بازاری کو وہ عروج حاصل ہوا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرجع و مرکز بنا ہوا تھا۔ فلاسفہ، شعراء، مورخین، اہل ادب اور ماہر فنون۔ غرض کہ علم و فن کے تمام یارے اسی آفتاب کے گرد گھومتے تھے۔ وہ رنڈی صرف علم و ادب کی محفلوں کی صدر نشین نہ تھی بلکہ سیاست اور معاشرت کے مہات مسائل میں بھی اس کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ یونانیوں کے ذوقِ جمال اور حسن پرستی نے ان کے اندر شہوانیت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکا دیا وہ اپنے اس ذوق کا اظہار جن مجسموں میں کرتے تھے وہی ان کی شہوانیت کو اور زیادہ ہوا دیتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کے ذہن سے یہ تصویر ہی محو ہو گیا کہ شہوت پرستی بھی کوئی اخلاقی عیب ہے، ان کا معیار اخلاق اتنا بدل گیا تھا کہ بڑے فلاسفہ اور معلمین اخلاق بھی زنا اور فحش میں کوئی قباحت اور کوئی چیز قابلِ ملامت نہ باتے تھے۔ ان کی سوسائٹی میں نکاح ایک غیر ضروری رسم بھی جانے لگے۔ آخر کار ان کے روایاتی مذہب نے بھی ان کی حیوانی خواہشات کے آگے سر ڈال دی۔ کام دیوی کی پرستش تمام یونان میں پھیل گئی جس کی داستان یونانی معبان میں یہ تھی کہ ایک دیوتا کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے تین اور دیوتاؤں سے آشنائی کر لی تھی، اور ان کے ماسوا ایک

ایک فانی انسان کو بھی اس کی جناب میں سرفرازی کا فخر حاصل تھا۔ اسی کے بطن سے محبت کا دیوتا
"کیوبڈ" پیدا ہوا جو ان دیوی صاحبہ اور ان کے ایک دوست کی باہمی لگاؤ کا نتیجہ تھا۔
یہ فحاشہ اس قوم کی معبود تھی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں جو قوم اس کیرکٹر کی دیوی صاحبہ کو
اپنا معبود بنالے اس کی اخلاقی بستی کا کیا عالم ہوگا۔ یہ اخلاقی انحطاط کا وہ مرتبہ ہے جس میں گرنے کے
بعد کوئی قوم پھر کبھی نہیں ابھرتی۔ ہندوستان میں بام مرگ اور ہیران میں مزوکیت کا ظہور اسی دور
انحطاط میں ہوا۔

عظیم الشان بابل میں قحبہ گری اور عیش پرستی کو مذہبی تقدس کا درجہ اس زمانہ میں حاصل ہوا
جس کے بعد پھر دنیا نے کبھی بابل کا نام افسانہ ماضی کے سوا کسی دوسری حیثیت سے نہ سنا۔ یونان
میں جب کام دیوی کی پرستش شروع ہوئی تو قحبہ خانہ عبادت گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ فحاشہ عورتیں
دیوداسیاں بن گئیں اور زنا ترقی کر کے ایک مقدس مذہبی فعل کے مرتبہ تک پہنچ گیا۔ تاریخ کی شہادت ہے
کہ اس ذواقیت اور لذتیت کے بعد یونانی قوم کو زندگی کا کوئی دوسرا دور نصیب نہیں ہوا۔

قوم پرستی | یونانی تہذیب کی جو تھی خصوصیت قوم پرستی ہے۔ قوم پرستی کا سب سے پہلا درس دنیا
کو یونان نے دیا اور وطن پرستی کو ایک مذہبی حقیقت کا درجہ یونانی فلسفیوں کے ذہن کی اختراع ہی،
مقدس وطن اور مادر وطن کے الفاظ پہلے پہل انھیں کے لٹریچر میں استعمال کئے گئے۔ موجودہ جارحانہ
وطن پرستی اسی شجرہ خبیث کا ثمر غیر صالح ہے۔ ارسطو جسے لوگ معلم اخلاق کہتے ہیں اس کا سارا نظام
اخلاق یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے۔ یونانی حکمرانوں نے فضائل اخلاق کی جو فہرست تیار
کی تھی اس کے سرفہرست جو چیز رکھی گئی تھی وہ "حب الوطنی" تھی۔ ارسطو اس حب الوطنی کی تفسیر کرتے

سے مزوکیت کے بنیادی اصول یہ تھے "زہ" "زمین" "دن" کو مشترک اور سوسائٹی کی ملکیت ہونا چاہئے۔ یہ پہلی مشترک
تحریک تھی جس کے بطن سے موجودہ اشتراکیت نے جنم لیا ہے۔

ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے کہ یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانا کے ساتھ کرتے ہیں۔

تاریخ یونان میں زمرہ فلاسفہ میں سے صرف حکیم سقراط ایسا نظر آتا ہے جو انسانیت اور اخلاق کو کسی قوم کی میراث اور جائیداد نہیں سمجھتا اور نہ "حق" کو کسی مخصوص گوشہ میں محصور کر دینا چاہتا ہے اس استثناء کے سوا پورے یونان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو جہانیت اور آفاقیت کا قائل ہو۔ سقراط نے ایک موقع پر یہ کہہ دیا کہ میری ہمدیوں کا حلقہ صرف یونان تک محدود نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان تک وسیع ہے تو لوگ حیرت اور استعجاب سے دیکھنے لگے یہ

رومی تمدن | یونانیوں کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا وہ اہل روم تھے، یہاں پھر وہی اتار چڑھاؤ کا مرقع ہمارے سامنے آتا ہے جو اوپر دیکھ چکے ہیں۔ رومی لوگ وحشت و تاریکی سے نکل کر جب تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو ان کے نظام زندگی کا سارا نقشہ یونانیوں کے کھنڈر پر تعمیر ہوا نظر آتا ہے۔ رومی چونکہ بداوت اور وحشت کی زندگی گذل رہے تھے اس لئے انہیں علم و فن سے کوئی سروکار نہ تھا، لیکن جب ان کے ہاتھ میں دنیا کی زمام کار آئی تو ان کے سامنے بھی زندگی کے تمدنی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی مسائل آئے۔ چونکہ ان کے پاس علم و فن کی کوئی اپنی میراث آبائی نہ تھی اس لئے انھوں نے علم و فلسفہ، ادب و شاعری، اصولی زندگی، قوانین معاشرت و معیشت، شائستگی اور تمدن سب کچھ یونان سے لیا۔ گو یونانیوں کے ہاتھ سے طاقت و اقتدار چھینا جا چکا تھا لیکن یونانی علوم و فنون کی برتری کا سکہ ابھی تک دنیا میں جاری تھا۔ یہ پہلی مثال تھی کہ ایک فاتح قوم اپنے مفتوحوں کے آداب و اطوار، ذہنی اور فکری کمالات اختیار کرتی ہے۔ رومی عسکرانہ ذہنیت رکھتے تھے اور ادبِ عالیہ زبان و کلچر سے ناواقف تھے۔ نئے نئے

تمدنی مباحث، معاشرتی مسائل، مابعد الطبعی نظریات کے لئے ایسی زبان کی ضرورت پڑتی ہے جو اپنے دامن میں ایک وسیع ادب رکھتی ہو، موزوں اسلوب بیان کی حامل ہو اور اس میں اعلیٰ درجے کے اشارے اور کنایے کا ذخیرہ موجود ہو۔ چونکہ رومی زبان ان خصوصیات سے خالی تھی اس لئے رومیوں کے پڑھے لکھے طبقہ نے اپنے خیالات اور نظریات اور اپنے تصنیف و تالیف کے کاموں کو یونانی زبان میں شروع کیا، جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ رومی اپنے افکار و خیالات میں بالکل یونان کے غلام بن گئے اور یہ دستور عرصہ دراز تک قائم رہا اور صرف تصنیف و تالیف پر کیا موقوف اطوار و خصائل، طرز معاشرت، جذبات و احساسات۔ غرض کہ ہر شعبہ حیات میں یونانی تمدن، رومی تمدن پر غالب آگیا اور رومی پوری طرح یونان کے ذہنی غلام ہو گئے۔ یونانیوں کی جن چار خصوصیات کی طرف اوپر ہم نے اشارہ کیا، رومیوں کے یہاں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

رومیوں کا نظریہ کائنات | رومی بت پرست تھے، ان کے پاس کوئی آسمانی مذہب نہ تھا، ان کے عقائد چند خرافاتی اور توہماتی تخیلات پر مبنی تھے۔ بت پرستی نے ان کے اندر تمام بت پرستانہ خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔ یونانیوں کی ذہنی اور فکری غلامی میں آجانے کے بعد ان کے عقائد اور توہمات پر ایک کلامی اور فلسفیانہ رنگ ضرور چڑھ گیا تھا۔ چونکہ زندگی کی مشعل ہدایت یونان کے پاس بھی نہ تھی اس لئے رومی بھی روح ہدایت سے خالی رہے اور اس طرح آہستہ آہستہ ان میں مادیت سے لگاؤ اور مذہب سے نفور پیدا ہونے لگا۔ ان کے یہاں اخلاق اور سیاست کی دوئی پہلے ہی سے تسلیم شدہ تھی، بت پرستانہ اخلاق ان کو ورثہ میں ملا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں کو زمین و آسمان کے انتظام سے کیا مطلب، دنیاوی زندگی بے مقصد اور بے غایت ہے، زندگی کا اہلی فلسفہ یہ ہے کہ ”کھاؤ“ ”پیو“ ”عیش کرو“۔ دیوتا لوگ خود عرش پر بیٹھ کر سیاست اور امور دنیا سے بے تعلق ہیں۔ سسرو (Cicero) بیان کرتا ہے کہ تھیسٹیس جب اس مضمون کے

اشعار پڑھے جاتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیاوی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تو لوگ انھیں نہایت
خوش سے سنتے تھے۔

رومی زندگی کی تمام روحانی قدروں سے محروم تھا۔ ناواقف تھے۔ انھوں نے کبھی
بھی سنجیدگی اور واقعیت کے ساتھ دینداری اختیار نہیں کی، ان کے تقلیدی دیوتا محض یونانی
حکایات اور خرافات کی پھکی نقل تھے، انھوں نے محض اپنی اجتماعی شیرازہ بندی اور قومی وحدت
کے خیال سے ان ارواح اور بتوں کو تسلیم کر لیا تھا، انھوں نے اپنے ان دیوتاؤں کو کبھی بھی اپنی عملی
زندگی میں قدم رکھنے نہ دیا، انھوں نے ان کو یہ حق بھی کبھی نہ دیا کہ وہ لوگوں پر اپنے اخلاقی قوانین
نافذ کریں۔

قوم پرستی | قومیت اور وطنیت جو ایک مغربی مزاج قوم کی فطرت ہے اس کاشت سے ان کے
اندرا حساس پایا جاتا تھا، وہ ”روم“ کو خدا سے بلند و برتر سمجھتے تھے۔ طاقت ان کے یہاں بھی ”حق“
اور ”باطل“ کا واحد معیار تھی۔ اس لئے رومی شہنشاہی پر جو خاص خیال حاوی تھا وہ محض ملک گیری
اور جلب منفعت کا خیال اور مادر وطن کے لئے دوسری قوموں کو معاشی اور سیاسی حیثیت سے تباہ
کرنا تھا۔ رومی رومن اور امرا اور اپنے طبقہ کے لئے فارغ البالی اور عیش و عشرت کی زندگی کا سامان
حاصل کرنے کے لئے کبھی ظلم و ستم کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ خود ملک کے اندر اقتصادی جنگ برپا تھی۔
پروٹاریہ اپنی موجودہ حالت کو بے چینی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، ٹیکسوں اور دیگر ذرائع سے ان
کی تمام دولت حکومت کے پروردہ طبقہ کی جیبوں میں جا رہی تھی۔

نظام معاشرت | خدا سے بغاوت پر جو نظام عائلی بنتا ہے، اس کی اساس تاریکوت سے بھی زیادہ کمزور
ہوتی ہے۔ یونان کے نظام معاشرت کی تباہی کی داستان ہم آپ کے کانوں تک پہنچا چکے ہیں، وہی

لئے تاریخ اخلاقی یورپ۔ ۳۷۷ صرف رومی نہیں کہا جاتا تھا بلکہ مقدس روم (Holy) کہا جاتا تھا۔

اسباب اور امراض اس نظام معاشرت میں بھی اثر انداز تھے جسے رومی تمدن کہا جاتا ہے۔

یہاں تاریخ پھر اپنا فیصلہ دہراتی ہے جب روم میں شہوانیت، عربانی اور فواحش کا سیلاب بھوٹ پڑا۔ تھیرول میں بے حیائی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لئے ضروری ہو گئیں۔ قحبہ گری کے کاروبار کو فروغ نصیب ہوا کہ قیصر ٹائریس کے عہد میں معززہ خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لئے ایک قانون نافذ کرنا پڑا۔ فلورآ نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کو برسرِ عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ رومی لٹریچر میں فحش و عریلی مضامین بھی بے تکلف بیان کئے جاتے تھے اور عوام و خواص میں وہی ادب مقبول عام تھا جس میں استعارہ اور کنایہ تک کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔

آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس فحاشی کی اشاعت میں بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار فلسفیوں تک نے حصہ لیا۔ کاٹو (Cato) جس کو روم کا محتسب اخلاق کہا جاتا ہے صریح طور پر آوارگی کو حق بجانب ٹھہراتا ہے۔ اپیکٹیس (Epictetus) جو فلاسفہ رواقیین (Stoics) میں بہت ہی سخت اخلاقی اصولوں کا پابند سمجھا جاتا ہے اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے شادی سے پہلے عورت سے اجتناب کرو۔ مگر جو اس معاملہ میں ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے اس کو ملامت مت کرو۔

یہ ہے رومی تمدن کی پاک داماں کی حکایت اور یہ ہیں ان کے نظام عائلی کے روشن کارنامے۔
رومی تمدن میں انسانی جان کی قدر و قیمت | انسانی تمدن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے اس کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان اور اس کا خلیق محرم ہے۔ انسان کے مدنی حقوق میں اولیں حق زندہ رہنے کا حق ہے۔ اس کے مدنی عمارتوں میں اولیں فرض زندہ رہنے دینے کا حق ہے۔

ان دونوں اصولوں کو سامنے رکھ کر جب ہم رومی تمدن کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس تمدن میں ان دونوں اصولوں کو کبھی بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ ان کا خون کیا گیا، روم کے کو لوسیم (Colosseum) کے فسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔ جس میں ہزار ہا انسان شمشیر زنی کے کمالات اور رومی امراء کے شوقِ تماشہ کے تذکرے ہو گئے۔ مہمانوں کی تفریح کیلئے یادوستوں کی تواضع کے لئے غلاموں کو درندوں سے بھڑوا دینا یا جانوروں کی طرح ذبح کر دینا یا ان کے آگ میں جلنے کا تماشہ دیکھنا کوئی معیوب نہ تھا۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دے کر مار ڈالنا اس عہد کا عام دستور تھا۔ جاہل اور خونخوار امراء سے لے کر یونان و روم کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ کے اجتہادات میں بھی انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی وحشیانہ صورتیں جائز تھیں۔ ارسطو اور افلاطون جیسے اساتذہ اخلاق ماں کو یہ اختیار دینے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے کہ وہ اپنے جسم کے ایک حصہ (یعنی جنین) کو الگ کر دے یونان اور روم میں اسقاطِ عمل کوئی ناجائز فعل نہ تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق تھا۔ رومی مقننوں کو اپنے قانون کی اس خصوصیت پر فخر تھا کہ اس میں اولاد پر باپ کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ حکماء و اقبائین (Stoics) کے نزدیک خودکشی کوئی بری چیز نہ تھی۔ بلکہ ایک ایسی عزت کی چیز تھی کہ لوگ جلے کر کے خودکشیاں کیا کرتے تھے۔ حدیہ ہے کہ افلاطون جیسا حکیم بھی اسے کوئی بڑی معصیت نہیں سمجھتا تھا۔ شوہر کے لئے اپنی بیوی کا قتل بالکل ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دے اس لئے قانون میں اس فعل کی کوئی سزا نہ تھی۔

رومیوں کا فوجی اخلاق | وسیع پیمانہ پر ان کے قتل و غارت کے واقعات آج بھی تاریخ کے ریکارڈ میں۔ لیکن ان واقعات کو لکھنے سے پہلے روم کے فوجی نظام پر ایک نظر ڈالتے چلیں تاکہ واقعات کی روح آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ روم کا فوجی نظام، زمانہ حال کے فوجی نظام کی طرح تھا

جس میں اخلاقی حدود و ضوابط کی کوئی پابندی ممکن نہ تھی، اُن کو اخلاقی تربیت، جنگ کی تعلیم اور عسکری ضبط و نظم کے قائم رکھنے کا کوئی بندوبست نہ تھا، جنگ کے موقع پر عام جنگجو باشندوں کا ایک انبوہ امنڈ کر آیا کرتا تھا اور ان کا یہ شوق صرف انھیں قتل و خون کے کھیل میں شرکت کیلئے لاتا تھا تاکہ ہمسایہ ممالک کو لوٹیں، مخالف قوموں کو تہس نہس کریں، خوش باشی کے لئے مال و دولت خدمت کے لئے لونڈی غلام اور شہوت رانی کے لئے خوبصورت لڑکیاں حاصل کریں۔ خود ان کے بادشاہوں کے سامنے جنگ کا کوئی اخلاقی مقصد نہ تھا بلکہ محض نام و نمود کی خواہش، دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے تلوار اٹھائی جاتی تھی، یہ ہی وجہ ہے کہ جب ان کی کوئی فوج کسی ملک میں پیش قدمی کرتی تھی تو بچے، بوڑھے، عورتیں، جانور، درخت، معبد، مندر، غرض کوئی چیز ان بدستوں کے دستبرد سے نہ بچتی تھی، جو لوٹا جاسکتا تھا لوٹ لیا جاتا اور جو نہ لوٹا جاسکتا تھا اس کو آگ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ روم سے افریقہ کے ونڈالوں (Vandals) اور یورپ کے گاتھوں (Goths) کی ہمیشہ جنگ رہتی تھی۔ ان کے ساتھ جو وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا اس کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

قیصر حنین کے عہد حکومت میں جب ونڈالوں پر چڑھائی کی گئی تو ان کی پوری قوم کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا، جنگ سے پہلے اس قوم میں ۶۰۰۰۰ ہزار جنگجو مرد تھے اور ان کے علاوہ عورتوں، بچوں، مردوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ مگر جب رومی فاتحوں نے ان پر قابو پایا تو ان میں سے ایک شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ سارا ملک ایسا تباہ کر دیا گیا تھا کہ ایک اجنبی سیاح اس کے دیرانوں میں سارے سارے دن گھومتا تھا اور کہیں آدم زاد کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی، پیرو کو پیس ایک مشہور سیاح نے جب اول اول اس سرزمین پر قدم رکھا تھا تو اس کی آبادی کی کثرت اور تجارت اور زراعت کی فراوانی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا تھا مگر ۲۰ سال کے اندر وہ تمام گہما گہمی ویرانی سے بدل گئی اور پچاس لاکھ کی عظیم الشان آبادی قیصر روم کے

حملوں اور جفاکاریوں کی بدولت فنا کے گھاٹ اتر گئی۔ لے
 یورپ کے گاتھوں کے ساتھ ہی وحشیانہ سلوک ہوا، یہاں تک ہم سنتے ہیں کہ ان کا بادشاہ ٹوٹیلاب
 میدان سے زخمی ہو کر بھاگا اور ایک دور دراز مقام پر جا کر مر گیا تو رومی سپاہی اس کی تلاش میں نکلے۔ اس
 کی لاش کا سراغ لگایا، اس کو برہنہ کر کے ڈال دیا اور اس کے خون آلود کپڑوں کو تاج سمیت قیصر
 جسٹین کے پاس تحفہ بھیجا۔

سنتھ میں ٹیٹوس رومی نے جب بیت المقدس فتح کیا تو کہا جاتا ہے کہ دراز قد حین لڑکیاں
 فاتح کے لئے چن لی گئیں، ۷۰ سال سے زیادہ عمر کے آدمی ہزار ہزار پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے
 کے لئے بھیج دیئے گئے، کئی ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ اہم یعنی تعمیر و
 اور کلو سیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے اور شمشیر زلوں سے کٹوانے یا خود آپس میں
 ایک دوسرے کو کاٹنے کے کام لایا جاسکے، دوران جنگ میں ۷۰ ہزار آدمی گرفتار کر لئے گئے جن میں
 گیارہ ہزار صرف اس وجہ سے مر گئے کہ ان کے نگہبانوں نے انھیں کھانے کو نہیں دیا، ان کے علاوہ
 جنگ اور قتل میں جو لوگ ہلاک ہوئے ان کی مجموعی تعداد ۲۹۷۳۷۱ بتائی جاتی ہے۔

یونانی اور رومی اپنے سوا دوسری قوموں کو وحشی اور بربری کہتے تھے اور ان کے قانون میں
 غیر یونانی اور رومی کے لئے غلامی اور قتل کے سوا کوئی تیسری صورت موجود نہ تھی، ارسطو صیبا انسان
 اس بات کا قائل تھا کہ قدرت نے برابرہ کو محض غلامی کے لئے پیدا کیا ہے۔

باغیانہ سوسائٹی اور لادینی کے ماحول میں رہتے رہتے رومی اتنے درندے اور وحشی ہو گئے
 تھے کہ لوگ اپنے کھیل تماشوں میں ہیتناک نظارے دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور ان نظاروں میں
 مجاز کی بجائے حقیقت کو دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے اگر ان کو کسی گھر کو جلتے ہوئے دکھانا ہو تو فی الواقع

cf Gibbon. cf Early days of Christianity by ferror.

وہ چاہے سہ تھے کہ ایک گھر جلا دیا جائے قیصر آکشنس نے اپنی وصیت کے ساتھ جو تحریک منسلک کی تھی اس میں لکھا ہے کہ ۸ ہزار شیخیزلوں اور ۳۵۱ جانوروں کے کھیل میں دیکھ چکا ہوں۔ رومیوں کی تاریخ میں جنگ و جدال، قتل و غارت گری کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ تعمیری فلاح و بہبود کے کاموں سے انہیں کچھ بھی شوق نہ تھا۔ طوالت کے باعث میں ان کی سفاکیوں کی بہت بڑی داستان چھوڑ رہا ہوں۔

رومہ کی اقتصادی حالت | رومہ کی اقتصادی حالت کے متعلق ہمارے لئے اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ عظیم الشان رومہ جس کے افسانے آج تک بیان کئے جاتے ہیں۔ اور جس کے تمدن کی عظمت و شوکت کے گیت گائے جاتے ہیں، یہ تمام رومی بالحدوں کا تمدن تھا بلکہ جس تہذیب و تمدن کو اس قدر حیرت اور استعجاب دیکھا جاتا ہے وہ دراصل وہاں کے اعیان و امراء کا تمدن ہے جو پروردہ حکومت تھے وہاں کے غریب اور چھوٹے طبقہ کے لوگ طرح طرح کی معاشی دقتوں میں مبتلا تھے۔ طبقہ امراء کا دار و مدار زیادہ تر جنگوں اور امراء کے مالی غنیمت پر تھا یا عوام الناس کے ٹیکسوں پر۔

ڈاکٹر ڈریسپر نے اپنی مشہور کتاب ”معرکہ مذہب و سائنس“ میں رومیوں کی عیاشیوں اور بواہیوں کی بڑی دردناک داستان لکھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ”جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روم انتہائے ترقی پر فائز ہو گئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ اصل رومہ کی عیش پرستی اور عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہئے کہ زندگی کو سلسلۃ العیش بنا لے، پاک بازی، حظ نفس کے خوانِ نعمت پر بمنزلہ نکلے اور اعتدال سلسلۃ حظ نفس کی دلازی کا محض ایک ذریعہ ہے، ان کے دسترخوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی بیچ کاری ہوتی تھی جیسے ہوئے نظر آتے تھے ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے ہوئے ان کی خدمت کیلئے کمر بستہ کھڑے رہتے تھے، ماہر دیان روماء جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیروں کی قید سے آزاد تھیں ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف بالا کرنے کے لئے محو ناز رہتی تھیں، عالی شان حانوں، دل کشا

تماشہ گاہوں اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی درندوں سے اس وقت تک مصروفِ نور آزمائی رہتے تھے جب تک کہ حریفوں میں ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سونہ جائے۔ اہل روم کے سامانِ تعیش میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا، دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی ہے تو وہ قوت ہے، اسلئے کہ اس قوت کی بدولت ہی سرمایہ حاصل کیا جاسکتا ہے جو دوسروں کی محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے، مال اور املاک کی صنعتی، صوبہ جات کے مواصل کی تشخیص، زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانروائے دولت روم اس زور قوت کا نشان ہیں۔ غرض روم کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی ہے لیکن یہ جھلک اس نمائشی طمع کی چمک سے مشابہ تھی جو یونان و عہدِ قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر اقتصادی لوٹ چھی ہوئی تھی، اس کے لئے رومی لوگوں کو غلام بنارہے تھے اور قتل کر رہے تھے، تن آسانی اور عیش پرستی پر قوم و ملک کا کتنا سرمایہ اڑایا جا رہا تھا، جب ایک طبقہ کی ہوساکیوں کی یہ داستان ہے تو دوسرا طبقہ کس قدر مفلوک الحال رہا ہوگا؟ مانا کہ رومی امرار نے اپنی قوم کو اقتصادی حیثیت سے غلام نہ بنایا ہو لیکن اپنے مفتوحوں کے ساتھ ان کا یہ فعل کب جائز ہو سکتا ہے؟ ہم نے جہاں تک روم کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ خود اہل روم کا ایک بڑا طبقہ نانِ شہینہ کا محتاج رہتا تھا اور ان کے نکلے میں مفلوک الحالی کا جواب ہر وقت پڑا رہتا تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اپنی کتاب ”حجتہ اشرفیہ“ میں لکھتے ہیں:-

”جب ایرانیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور نہوی تعیش ان کا معبود بن گیا تو ان کی زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش و عشرت میں نہمک بن جائیں۔ چنانچہ ان کے طبقہ خواص (Privileged group) کا ہر شخص دادِ عیش دینے لگا اور ان میں ایک طرح تفاخر کی شان پیدا

ہوگئی۔ یہ دیکھ کر دنیا کے ہر گوشے سے علما اور حکما ان کے ارد گرد جمع ہونے لگ گئے جو ان کے لئے سامانِ عیش مہیا کرنے کیلئے عجیب عجیب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے پر فضیلت اور فوقیت حاصل کرنے کی کوشش اور ان ایجادوں پر فخر کرنے لگے حتیٰ کہ ان امراء اور سربراہوں کا یہ حال ہو گیا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ دس سو سے کم مالیت کا چٹکا یا ٹوپی ہوتی تھی اسے بھلی کا عار دلایا جاتا تھا۔ ایسے ہی انھوں نے عالی شان سر بھنگ محل، آئرن حمام، بے نظیر پائیں باغ، سواری کے نمائشی جانور خواہ صورت غلام اور حسین بانڈیاں اپنی زندگی کا لازمیہ قرار دیں۔ اس زندگی کی ضرورت اہلی اسے سمجھ لیا کہ صبح و شام عیش و نشاط کی محفلیں جمع ہوں جن میں طرح طرح کے لذیذ کھانے وسیع دسترخوانوں پر جمع ہوں اور فوق الممطرک لباس فاخرہ خوشبوؤں سے بے با ہوا زیب تن ہوا۔

ان لوگ اور امار کی زندگی کے یہ طور طریقے رفتہ رفتہ عوام کی معاشی حالت پر بے اثرات لائے اور ان کی معاشی حالت بد سے بتر ہوئی چلی گئی مسلسل خانہ جنگیوں کی سبب معیشت تباہ ہو گئے جس کی وجہ سے سوسائٹی تباہ و برباد ہو گئی۔ اس سبب یہ کہ یہ سامانِ عیش کثیر دولت صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا اس کے لئے امراء و حکمران طبقہ کا شکاروں اور تاجروں پر نئے ٹیکس لگاتے تھے۔ سامانِ معیشت چونکہ پہلے ہی سے تباہ تھا اس لئے کسان اور تاجر نئے ٹیکس دینے سے انکار کر دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ زبردستی ان سے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے اور زیادہ سرکشی پر فوجی کارروائی عمل میں لائی جاتی تھی اور انھیں گرفتار کر کے طرح طرح سے عذاب دیا جاتا تھا۔

جاگیردارانہ نظام سرمایہ داری کا یہ عہدہ مرقع جس کی صحیح تصویر شاہ جہاں کے فنکار قلم نے کھینچی ہے۔ یہ تمدن کے دو عظیم الشان ڈھانچے تھے جو غیر خدا پرستانہ نظریہ زندگی (Materialistic Conception) کی اساس پر قائم تھے لیکن چونکہ ان کی بنیاد زندگی کے صحیح تصور پر قائم نہ تھی اس لئے اس کا تباہ ہو جانا لازمی

(باقی)

عوالم خمسہ و مراتب وجود

ترجمہ از جناب خواجہ محمد علی رحمانی جہاںپور

ذیل کا مضمون حضرت شاہ فتح محمد صاحب محدث ابن حضرت شاہ عینی جند اللہ رحمہم اللہ کی تصنیف رسالہ ”فہر زونات رحمانی“ کا اردو ترجمہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوة والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ تمام تعریفیں اول سے آخر تک ظاہر و باطن میں جو کچھ ہیں، حق تعالیٰ ہی کیلئے ہیں۔ جو مدبر و سرپرست ہے کل عالم اور سارے جہانوں کا۔ اور رحمت و فضل، سلامتی و برکت نازل ہو، اس کے برحق پیغمبر جناب ختمی مرتبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، اور آپ کی اولاد و ازواج اور اصحاب و احباب پر، اور ان کے ساتھ جمیع امت پر قیام قیامت تک۔ حمد و صلوة کے بعد ہر طالب حق اور سالک طریقت کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرات صوفیہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی اصطلاح میں وجود کے پانچ مرتبے ہیں اور یہ حضرات کرام و جود کے ہر ایک مرتبہ کو عالم کہتے ہیں۔

اول عالم لاہوت ہے۔ دوم ہاہوت ہے۔ سوم جبروت۔ چہارم ملکوت اور پنجم ناسوت۔ مبتدی کی آسانی کیلئے پہلے ہم ناسوت کے مراتب بیان کرتے ہیں۔ عالم ناسوت صوفیہ کی اصطلاح میں مرتبہ ملک ہے۔ اور اسی کو عالم شہادت بھی کہتے ہیں۔ عرش اعظم سے مرکز خاک تک عالم ناسوت کہلاتا ہے اور اس دائرہ ناسوت کا مجموعہ کل تیرو چتریں ہیں۔ اول عرش مجید خطیب عقیانی

نے شرح بخاری میں بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ عرش عظیم یا قوت سرخ سے بنا ہوا ہے اور اس کی دوری و درازی اور بُعد کی مقدار ہر دو جانب میں پچاس ہزار برس کی راہ کی مسافت ہے اور اس کی چوڑائی اور پورنیچے دونوں طرف پچاس پچاس ہزار برس کی راہ کا فاصلہ ہے۔

فضائل اعمال کی ایک حدیث مرفوع ہے کہ عرش عظیم کے ستوپائے ہیں اور ملائکہ جب سے پیدا ہوئے ہیں اس وقت سے قیامت تک اگر ایک پائے کی مسافت طے کرنا چاہیں تو سرگزطے نہیں کر سکتے عرش کے بعد کسی ہے جو بہشت کی زمین ہے۔ بہشت کے تمام بڑے بڑے درجے ایک ہزار چھ سو سولہ ہیں۔ اور اس کے بعد فلک زحل ہے جو آسمان اول ہے۔ پھر فلک مشتری ہے جو آسمان دوم ہے۔ پھر فلک مریخ جو آسمان سوم ہے پھر فلک شمس جو آسمان چہارم ہے پھر فلک زہرہ جو آسمان پنجم ہے۔ پھر فلک عطارد جو آسمان ششم ہے۔ پھر فلک قمر جو کہ آسمان ہفتم ہے۔ فلک قمر کو اگر ادھار کی طرف سے شمار کریں تو آسمان ہفتم ہے اور اگر نیچے کی طرف سے حساب لگائیں تو یہ آسمان اول ہے۔

علامہ نووی وغیرہ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ کرسی اور جو چیزیں کہ کرسی کے اندر موجود ہیں عرش مجید کے مقابلہ میں رائی کے ایک دانہ کے برابر ہیں کہ جس طرح ایک وسیع میدان میں رائی کا ایک دانہ پڑا ہوا کالعدم معلوم ہوتا ہے اسی طرح کرسی اور جو چیزیں اس میں ہیں عرش مجید کے مقابلہ میں معلوم ہوتی ہیں اور اسی طرح ساتوں آسمانوں کا اپنی وسعت و گہرائی کے باوجود کرسی کے مقابلہ میں یہی حال ہے۔

فلک ہفتم کے بعد کرۂ آتش ہے جس میں شہاب پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کرۂ ہوا ہے جس میں ابر وغیرہ ہوتا ہے اور اس کے بعد کرۂ آب ہے جو دریائے محیط کے مانند ہے اور زمین کرۂ آب کے اندر گیند کی طرح ہے۔ زمین کا نصف سے زائد حصہ غرق آب ہے اور نصف سے کم حصہ پانی پر

باہر اور خارج ہے۔ زمین کا جو حصہ پانی سے باہر ہے پھر اُس کے دو حصے ہیں ایک حصہ محض ویران اور غیر آباد ہے اور اس میں کسی سمت اور جہت میں بھی عمارت و آبادی کا نام و نشان تک نہیں دوسرا حصہ معمور و آباد ہے اس کو معمورہ کہتے ہیں اور وہ ربع مسکون ہے۔ اسی معمورہ میں تمام دنیا آباد ہے۔ دریا، جبل میدان، پہاڑ، شہر، آبادیاں اور بستیاں اسی میں واقع ہیں اس کی مسافت کا اندازہ ایک سو بیس برس برابر چلتے رہنے کی مدت کا راستہ ہے۔ اس میں نوے برس کی راہ میں بتی ہے یا جوج و ما جوج کی جو یافت بن لوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اور بارہ برس کی راہ میں حبشی اور آٹھ برس کی راہ میں رومی اور تین برس کی راہ میں عرب بستے ہیں۔ اور سات برس کی راہ میں مغ یعنی آفتاب پرست و آتش پرست رہتے ہیں۔ یہ تفصیل بخاری شریف کی شرح میں خطیب عسقلانیؒ نے بعض کتب سے نقل کی ہے مگر یہ تمام تعبیریں معتقدین و سلف کی تحقیقات کی بنیاد پر ہیں۔

زمین پر حق تعالیٰ شانہ کی پیدا کی ہوئی انواع و اقسام کی مخلوق بکثرت موجود اور آباد ہے مگر اور دوسری مخلوقات ملائکہ، شیاطین، جنات وغیرہا کے مقابلہ میں انسان ایک ہزار کے مقابلہ میں صرف ایک ہوتا ہے۔ خطیب عسقلانیؒ ہی کی شرح میں ہے کہ زمین اپنی تمام وسعت اور پھیلاؤ، مہم گیری کے باوجود آسمانوں کے مقابلہ میں ایک خشتاش کے مانند کے برابر ہے۔ کسی عارف کامل نے اسی مضمون کی طرف اشارہ کر کے انسان کو اس کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا ہے کہ

جہاں در جنبِ این نہ سقفِ مینا چو خشتاشے بود بر روئے دریا

بہیں خود را کزین خشتاش چندے نزدگر بر پروت خود بخندے

اس کا حاصل یہ ہے کہ (یہ تمام دنیا جہاں کائنات، نو آسمانوں کے مقابلہ میں ایسا ہے

جیسا کہ خشتاش کا ایک دانہ دریائے وسیع و عمیق اور قلزم زخار میں پڑا ہوا ہو۔ تو تو بھی اے غافل بندے اور خود ہیں انسان اپنے آپ کو اور اپنی حقیقت کو دیکھ غور کر اور سوچ سمجھ کہ تو کتنا ہے۔ اور

تیری حقیقت اور ہستی کیا ہے، بے سوچے سمجھے اگر تو اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور اپنی طاقت اور مونچھ بل پر زور گھنڈر کھکھرنے سے تو کیا یہ تجھ کو لائق اور سزاوار ہے۔ یہاں تک بہت اختصار کے ساتھ عالمِ ناسوت کا بیان کیا گیا۔ اب اے جو یائے صداقت اور جوینہ حقیقت عالمِ ملکوت کا حال معلوم کر۔

عالمِ ملکوت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملکوتِ اعلیٰ۔ دوسرے ملکوتِ اسفل۔ ملکوتِ اعلیٰ عالمِ ارواح کو اور ملکوتِ اسفل عالمِ مثال کو کہتے ہیں۔ ملکوتِ اسفل اور عالمِ مثال، عرشِ عظیم کے اوپر ہے شاریحِ قیصری وغیرہ نے لکھا ہے کہ عالمِ مثال کی وسعت اور گیرائی اس قدر ہے کہ اس کے مقابلہ میں عرشِ عظیم مع اپنی تمام محتویات و موجودات اور اشیاءِ مشتملہ کے ایسا ہے جیسے ایک صحرائے عظیم اور لقی و بیابان ہیں ایک بہت چھوٹی سی انگوٹھی کا حلقہ پڑا ہوا ہو۔

عالمِ ناسوت جو کہ عالمِ اجسام ہے اور عالمِ ارواح جو کہ ملکوتِ اعلیٰ اور ارواحِ نورانی مجرّد ہیں ان دونوں کے درمیان یہ عالمِ مثال ایک برزخ اور درمیانی شے کے طریق پر ہے۔ ہر ممکن اور موجود کے لئے جو کچھ اس عالمِ اجسام و عالمِ ناسوت میں ہوتا ہے اور مقدر و مقدور ہے اس کے لئے اس عالمِ مثال و عالمِ برزخ میں ایک صورت ہوتی ہے جو تمثیل و مناسب ہوتی ہے عالمِ ارواح کے۔ پھر وہ صورت ارواح سے فیض حاصل کر کے اجسام میں پہنچاتی ہے اور اس ترتیب کے ساتھ کائنات و عوالم کی ترتیب و تدبیر اور تنظیم و تنسيق ہوتی ہے اور اس عالمِ مثال کو عالمِ خیال بھی کہتے ہیں۔ اور ملکوتِ اعلیٰ جو کہ ارواحِ نورانی اور مجرّد ہیں۔ اس کا نام عالمِ امر بھی ہے اور یہ ایک ایسا عالم ہے جس کی طرف حس و احاطہ کے ذریعہ دستی طور پر اشارہ نہیں کیا جاسکتا۔ ملکوتِ اعلیٰ کی جملہ موجودات دو قسم پر ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جن کا پند و جوہ عالمِ اجسام سے کوئی تعلق نہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو عالمِ اجسام سے صرف چند وجوہ کی بنا پر تدبیر و تصرف کا تعلق رکھتی ہے۔

اول قسم جس کا عالمِ اجسام سے کوئی تعلق نہیں ایک خاص قسم پر اور ملکوتِ اعلیٰ کی اس قسم کو

کروبی کہتے ہیں۔ پھر یہ بھی دو طرح پر ہیں۔ ایک قسم وہ ہے کہ جن کو عالم اجسام کی بالکل خبر نہیں اور عالم اجسام و عالم ناسوت کی طرف مطلق توجہ نہیں۔

وَهُمْ هَآؤَافِیْ جَلَالِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَجَمَالِہٖ مُنْذُ خَلَقَہُمْ

یعنی کروبیوں کی یہ خاص قسم ایسی ہے کہ جب سے حق تعالیٰ شانہ نے ان کو پیدا فرمایا ہے اس ذاتِ عالی صفات کے جلال و جمال میں ہائیم و مستغرق اور متوجہ و محو ہیں۔ اسی لئے اُن کو مہیمیہ کہتے ہیں اور ان کی دوسری قسم وہ ہے کہ اگرچہ ان کو بھی عالم اجسام سے تعلق نہیں ہے مگر وہ بارگاہ الوہیت کے دربان اور فیض ربوبیت کے وسیلے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ سے (جو اہل مبدع وجود و ایجاد اور سرچشمہ فیضانات و کمالات ہے) فیض حاصل کرتے اور پھر تمام ارواح کو پہنچاتے ہیں۔ ان ارواح میں سب سے افضل و اعلیٰ، اجل و ارفع، اور اکمل و اتم روحِ اعظم ہے جو تعبیر و مراد ہے روحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور روحِ اعظم کی نسبت افاضہ فیض اور احاطہ کمال میں تمام عوالم سے خواہ عالم ارواح ہو یا عالم مثال۔ عالم خیال ہو یا عالم شہادت، ایسی سمجھنی چاہئے کہ انسان کے نفس کی نسبت ہوتی ہے اس کے جسم و بدن کے ساتھ۔ حتیٰ کہ اگر مبدع فیاض کے سرچشمہ فیض سے ان وسائل و ذرائع اور علائق و وسائل کے ذریعہ صدور فیضان اور ایصال فیض نہ ہو تو ہرگز ہرگز ممکن نہیں کہ وجود یا شہود کے اعتبار سے کوئی چیز بھی خارج اور واقع میں صورت پذیر ہو سکے اور کوئی صورت حاصل کر سکے۔

ملکوتِ اعلیٰ کی پہلی قسم کا حال معلوم کر چکے کہ اس کا عالم اجسام سے بچند وجوہ کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یہ کہ اس کی دو قسمیں بھی ہیں جن کا حال ذکر کیا جا چکا۔ اب ملکوتِ اعلیٰ کی دوسری قسم کا حال معلوم کیجئے جس کو کہ عالم اجسام سے تعلق و ارتباط ہوتا ہے اور وہ تعلق و ربط تدبیر و تصرف کا تعلق و رابطہ ہے اس لئے کہ نوع انسانی کے ہر فرد کے لئے ایک روح مجرّدہ ہوتی ہے اور اس

شخص اور فرد انسانی کے تعلق و تصرف کا تمام تر معاملہ اس روح مجرہ پر موقوف و مبنی ہوتا ہے، انسان کے نفس اور اس کے جسم و بدن میں جیسی صلاحیت و استعداد اور قابلیت و لیاقت ہوتی ہے اسی کے مقتضائے مطابق ہوتی ہے اور روح مجرہ اسی کے موافق روح سے فیض حاصل کر کے اس شخص کی مثالی صورت اور برزخی ہیئت کے واسطے سے جو کہ عالم مثال میں مُثَلّ و مناسب ہے اس جسم و بدن اور نفس کو پہنچاتی ہے۔

نیز ان ارواح مجرہ کے علاوہ اور دوسری ملکی روہیں اور ملکوتی ارواح بھی ہیں جن کی صحیح تعداد و شمار حق تعالیٰ شانہ ہی کے علم و احاطہ میں ہے اور وہ ملکی روہیں ان ارواح مجرہ کی خاص معاون و مددگار ہوتی ہیں، اور ان کو بھی ملکوتِ اسفل کہتے ہیں۔ اسی بنا پر اربابِ مشاہدہ و اہل کشف نے فرمایا ہے کہ جب تک سات فرشتے نہ ہوں اس وقت تک درخت کا ایک پتہ بھی باہر نہیں نکلتا۔ چنانچہ پیغمبرِ حق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ مَلٰکًا" یعنی ہر چیز اور ہر شے کے لئے ایک نہ ایک فرشتہ ضرور ہوتا ہے جو اس شے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے "یَنْزِلُ لِکُلِّ قَطْرَةٍ مَلٰکًا" کہ بارش کے ہر قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے۔ اسی طرح احادیث و روایات میں قسم قسم کے ملائکہ، ملکوتی ارواح اور ملکی روحوں کا ذکر وارد ہے۔ چنانچہ ملک الریح (ہوا کا فرشتہ) ملک الرعد (کڑک کا فرشتہ) ملک البرق (بجلی کا فرشتہ) ملک السحاب (بادل کا فرشتہ) وغیر ذلک، ملائکہ کی احادیث صحیحہ میں تصریح موجود ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عالمِ ناسوت میں جو کچھ کون و فساد اور حرکت و سکون کے قبیل سے ہوتا ہے یہ تمام فیضانِ حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے جو کہ مبدی فیاض ہیں اولاً وبالذات اسماء الہیہ کو جو کہ اربابِ مقیدہ میں پہنچتا ہے، اور ذاتِ پاکِ مبدی فیاض سے یہ تمام فیضانات بواسطہ اسمائے الہی اعیانِ ثابتہ و (حقائق الہیہ) پر فائز و وارد ہوتے ہیں۔ اور اعیانِ ثابتہ و اسمائے کونیہ کے ذریعہ و

واسطہ سے روح اعظم کو یہ جملہ فیوض حاصل ہوتے ہیں۔ پھر روح اعظم سے ادراک و ادراک کی استعداد اور صلاحیت کے مناسب و لائق ان اسمائے الہیہ کا فیضان حاصل ہوتا ہے پھر ہر روح بواسطہ اپنی صورت معنوی کے اپنے عالم ناسوت میں خود متصرف ہوتی اور تدبیر و نظم کرتی ہے۔ روح کا اپنے اجسام و نفوس میں اس تصرف و تدبیر معنوی کا بعض افراد کو شعور و احساس ہوتا ہے جیسے انسانی افراد اور حیوانی افراد اور بعض افراد کو شعور و احساس نہیں ہوتا جیسے نباتاتی و جماداتی افراد۔

اگرچہ یہ امر پایہ ثبوت اور مرتبہ یقین کو پہنچ چکا ہے اور کشف و مشاہدہ ارباب بطون سے یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ نباتی و جمادی افراد کو بھی ایک خاص قسم کا شعور و ادراک ہوتا ہے۔ مگر اہل کشف بیان کرتے ہیں کہ نباتات و جمادات اور معدنیات کے شعور و ادراک کا یہ ڈھنگ اور طریقہ نہیں جیسا کہ انسان و حیوان کے ادراک و شعور کا حال ہے بلکہ ان کا علم و شعور ان کی اپنی صورت نوعیہ کے مناسب ہے۔

یہاں تک جو مذکور ہوا یہ سب عالم ملکوت کا بیان تھا اور اس سے قبل ہم عالم ناسوت کا ذکر کر چکے ہیں اب عالم جبروت کا ذکر سنئے۔ عالم جبروت عالم ملکوت کے اوپر ہے اور یہ عالم جبروت الہی صفات اور ربانی اوصاف ہیں اور اسی کو عالم واحدیت کہتے ہیں اور یہ عالم تمام اسمائے الہی اور اسمائے کوئی پر مشتمل و حاوی ہے۔ اور سب کا خزن و جامع۔ صوفیہ محققین نے اپنی اصطلاح میں اٹھائیں اسمائے الہی اور اٹھائیں اسمائے کوئی مقرر کئے ہیں۔ ان کی تفصیل اور مکمل تحقیق کتاب جام جہاں نما کے دائرہ واحدیت میں لکھی گئی ہے۔

قدر ضروری اس کا یہ ہے کہ اسماء الہی میں سے ہر ایک اسم کو حقائق الہیہ کہتے ہیں اور اسمائے کوئی و کیانی کو اعیان ثابتہ کے نام سے مسموم کرتے ہیں۔

اسمائے الہیہ ارباب مقیدہ ہیں اور ہمیشہ و پیوستہ اسمائے الہیہ کا فیض، اسمائے کوئیہ کو

جو کہ ایمانِ ثابتہ اور نظامِ ہوجالی اسمائے الہیہ میں پہنچتا رہتا ہے۔ اور پھر ان سے بواسطہ روحِ اعظم خارج و واقع میں ظاہر و صادر ہوتا ہے جیسا کہ سابق میں بیان کیا گیا۔ الغرض اس مجموعہ کے عالمِ جبروت کہتے ہیں۔

اور اس مرتبہ کے ادھر ذاتِ پاک الہی ہے اور اس کو ہا ہوت کہتے ہیں۔ یہی عالمِ وحدت ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کی ذاتِ مقدس اپنی وحدت میں صفتِ احدیت کے ساتھ متصف و موصوف ہے۔ جس میں تمام اعتبارات و تعینات اور نسب و قیود و اضافات ماقط و کالعدم ہیں اور تمام صفات و اوصاف مملوب و منفی۔ اور یہی ذاتِ تبارک و تقدس صفتِ واحدیت کے ساتھ بھی موصوف متصف ہے اور اس مرتبہ میں تمام اعتبارات کا اثبات بھی ہے اور تمام صفات لائقہ سے انصاف بھی۔ یہ مرتبہ تمام موجودات کے مربی و مالک اور تمام ممکنات کے مرجع (اور مرجع الیہ) کا مرتبہ ہے اور اس مرتبہ کو حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ کے بعد منظرِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ ظہور (وعیان اور وجود و شہود) میں سوائے وجوبِ ذاتی کے یہ کلمات (صفات و اعتبارات) بھی شامل ہو گئے۔

اس دقیقہ اور نکتہ کو حقیقتِ انسانی اور افرادِ انسانی کی مثال میں اس طرح سمجھو کہ مرتبہ جبروت، حقیقتِ انسانی کو کہتے ہیں۔ اب یہ مرتبہ جو تمام اسمائے الہی اور اسمائے کوئی پر مشتمل ہے بالاجمال اور فی الاصل ہر فردِ انسانی میں موجود و ثابت ہے لیکن اگر کسی فردِ انسان کی استعداد و صلاحیت کامل اور قابلیت تمام ہو تو اس فرد میں کامل و مکمل طور پر اس مرتبہ کا ظہور ہو گا۔ اگر کسی فردِ انسان کی صلاحیت و استعداد و قابلیت مکمل نہ ہو تو اس میں کامل طور پر اس کا ظہور نہ ہو گا۔ حالانکہ ہر انسان میں بالاجمال اور ہر فرد کی حقیقت میں بالاصل مستور و کامن ہے۔ اگر اہل کشف و اربابِ مشاہدہ کے اعتقاد کے بموجب تمام سالکین طریقت اور طالبین سلوک کے

یہ سلوک کا منتہی اسی مرتبہ جبروت تک ہوتا ہے۔

بعض محققین جیسے شیخ محی الدین ابن عربیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ سالک صادق یعنی
بیت محقق یا غوث، یا فرد کامل جو جناب رسالت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل
متابعت اور پوری پیروی کرتا ہے اور حضرت نبوت (ارواحنا و ارواح انبیائنا و انہما متابعا) کے
قدم بہ قدم چلتا ہے۔ سنت نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے اتباع اور پیروی کی وجہ سے
تمام ہاہوت تک پہنچ جاتا ہے اور اس کی سیر اور اس کا سلوک اس اول مرتبہ سے متصف ہو جاتا ہے
ن وہ دوسرے جن کو کمال متابعت کا درجہ اور پوری پیروی کا حصہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس
رتبہ کی سیر کے ساتھ متصف نہیں ہوتے بلکہ جبروت میں پہنچنے کے بعد رک جاتے ہیں البتہ اس
مرتبہ کا صرف مشاہدہ ان کو ہوتا ہے۔

یہ تمام مراتب جو بیان کئے گئے یعنی مرتبہ ہاہوت، مرتبہ جبروت، مرتبہ ملکوت، مرتبہ
اسوت۔ یہ جملہ مراتب اربعہ تعین اول میں داخل ہیں جو تمام تعینات کو شامل ہے اور اس مرتبہ کے
پر یعنی مرتبہ تعین اول کے اوپر مرتبہ لا تعین ہے جس کو لاہوت کہتے ہیں۔ اس مرتبہ کے
بال اور انتہا تک کسی نبی اور ولی کا علم نہ دنیا میں آج تک پہنچ سکا ہے اور نہ آخرت میں پہنچ سکا۔
برخلاف ان مراتب اربعہ کے کہ ہر فرد انسان جو سالک طریقت طالب حقیقت اور
خود شاہراہ معرفت ہو اپنی فطری استعداد اور جبلی قابلیت کی بنا پر درجہ بدرجہان مدارج کی
بے صعود و عروج کرتا ہے اور اپنے جوہر قابل اور قابلیت صالح کے موافق مراتب اربعہ بتدریج
تک پہنچتا ہے اور ترقی و ارتقاء سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

تو مستحق نظر شو کمال و قابل فیض

کہ منقطع نشود فیض ہرگز از فیاض

تبصرے

Alon Maskawaih. | از خواجہ عبد الحمید صاحب، تقطیع خورد ضخامت ۱۳۰ صفحات

ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد چکر

علامہ ابن مسکویہ المتوفی ۵۴۲ھ جس طرح اپنے عہد کے نامور طبیب، مورخ، اور علم الاخلاق کے ماہر و فاضل تھے ایک بلند پایہ فلسفی بھی تھے چنانچہ انھوں نے الفوز الاصفیٰ کے نام سے فلسفہ میں بھی ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ اس کتاب میں علامہ نے وجودِ صانع روح اور نبوت پر ایک مسلمان فلسفی کی حیثیت سے کلام کیا ہے۔ خواجہ عبد الحمید صاحب نے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے ہی استاد ہیں اس کتاب کا خلاصہ انگریزی میں مستقل کیا ہے اور پھر تقریباً چالیس صفحات میں علامہ ابن مسکویہ کے فلسفہ کی نمایاں خصوصیات پر فاضلانہ کلام کیا ہے اور اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ علامہ مرحوم کے مخصوص طرز فکر و طریق استدلال کے دراصل تاخذ کیا ہیں اور انھوں نے ارسطو اور افلاطون کے علاوہ خود فارابی سے جس کے فلسفہ کی شہرت ابن مسکویہ نے عہد میں کمال کو پہنچ چکی تھی، کس حد تک استفادہ کیا ہے۔ ارباب ذوق کے لئے عموماً اور فلسفہ کے طلباء اور اساتذہ کے لئے خصوصاً اس کا مطالعہ دلچسپی، افادہ اور ذہنی بصیرت کا موجب ہوگا۔

Muslim Contribution to Geography. | از جناب نفیس احمد صاحب ایم۔ اے پروفیسر جغرافیہ اسلامیہ کالج کلکتہ، تقطیع متوسط ضخامت ۱۸۰ صفحات

ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد پانچ روپے۔

علم جغرافیہ کی تحصیل و تکمیل اور پھر اس کی ترقی و ترویج میں مسلمانوں نے جو عظیم الشان کام کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں اس پر سلیقہ مندی سے مرتب و مہذب کلام کیا گیا ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ حج اور تجارتی شوق کی وجہ سے مسلمانوں میں کس طرح ابتداء جغرافیہ دانی کا شوق پیدا ہوا اور پھر کس طرح عہد بعہد اس نے ترقی پذیر ہو کر علم جغرافیہ میں مسلمانوں سے شاندار تحقیقات و کشفیات کرائے اور انھوں نے صرف نظری طور پر نہیں بلکہ ملک ملک کی خاک چھان کر اور سمندروں کی گہرائیاں تاپ کر اس علم کا عملی تجربہ کیا اور اس سلسلہ میں اپنے مخصوص افکار و نظریات قائم کئے۔ اگرچہ موضوع کی وسعت و پہنائی کے اعتبار سے کتاب مختصر ہے تاہم کام کی باتیں سب آگئی ہیں اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ جس وقت یورپ جغرافیہ ارض سے متعلق حد درجہ مضحکہ انگیز معلومات پر قانع بیٹھا تھا۔ مسلمان اس زمانہ میں ایک طرف مشرق و مغرب کی وسعتوں کا جائزہ لے رہے تھے اور دوسری جانب اجرام سماویہ کے ابعاد ثلاثہ کی پیمائش اور ان کے حرکات و افعال کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے متعدد نقوشوں نے کتاب کی اہمیت اور افادیت کو دو چندان کر دیا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں کتابوں کو شیخ محمد اشرف صاحب تاجر کتب کشمیری بازار لاہور سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان اور غیر مسلم حکومت | از پروفیسر محمد سرور صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ تقطیع خورد ضحاک
۲۳۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عجاظہ بہ ادارہ ادبیات نو ٹیل روڈ۔ لاہور۔

سنہ کا مشہور مقدمہ کراچی ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا اس مقدمہ میں حکومت برطانیہ مدعی تھی اور مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی شوکت علی وغیرہم مدعا علیہم حکومت کا دعویٰ یہ تھا کہ ان حضرات نے فوج کی ملازمت کو حرام کہہ کر حکومت کے خلاف بغاوت

پیدا کرنی چاہی ہے۔ اس کے جواب میں مجاہدینِ ملت کا کہنا یہ تھا کہ ایک مسلمان کے لئے ایک مسلمان کو قتل کرنا قطعاً حرام ہے اور جو لوگ انگریزی فوج میں داخل ہوتے ہیں انہیں ایک نہ ایک دن ترکوں سے ضرور لڑنا پڑے گا۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے فوج میں ملازم ہونا ناجائز اور حرام ہے۔ اور اگر حکومت پھر بھی مسلمانوں کو فوجی ملازمت پر مجبور کرتی ہے تو گویا وہ مذہب میں مداخلت کرتی ہے اور ملکہ و کٹوریہ کے اعلان کے مطابق اسے ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا محمد علی مرحوم نے جو بیانات اپنی اور اپنے رفقاء کی طرف سے عدالت کے روبرو دیئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ حق گوئی، جذبہ آزادی و ولولہ ایمانی، پھر ساتھ ہی سوز و گداز، درد و اثر اور جرأت و بیباکی کے لحاظ سے حد درجہ ایمان افروز بھی ہیں اور جرأت آموز بھی۔ پروفیسر محمد سرور نے زیر تبصرہ کتاب میں اسی مقدمہ کراچی کے مختصر و نادر نقل کر کے مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا محمد علی مرحوم کے یہ بیانات اور جج کا فیصلہ یہ سب چیزیں مرتب کر دی ہیں۔ اس کے بعد لائق مرتب نے ”محاکمہ“ کے عنوان سے ایک دلچسپ اور مفید بحث کی ہے جس میں انھوں نے سنہ کی تحریک خلافت سے لیکر سنہ تک کی تحریکات قومی کا وسعت نظر اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا ہے اور پھر بتایا ہے کہ اب مسلمانوں کو کس طرح قیادت کے بدلنے کی ضرورت ہے ورنہ ان کے لئے خطرات بیشمار ہیں محاکمہ کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے ہمارے نزدیک وہ اگرچہ تشنہ و ناتمام ہے۔ پھر مصنف کے نقطہ نظر سے کلی اتفاق بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم جو کچھ لکھا ہے بڑی سنجیدگی، معقولیت اور متانت سے لکھا ہے۔ اربابِ ذوق کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

محاوراتِ داغ | از جناب ولی احمد خاں صاحب وزیر اعظم دو جلد قطع ۳۰ x ۲۰ صفحات ۳۸۰
صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد چھ روپیہ پتہ: مکتبہ ادب۔ اردو بازار دہلی۔

نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کا کلام اردو زبان کے مستند اور نکسالی محاوروں اور

مضروب الامثال سے بھرا ہوا ہے۔ ولی احمد خاں صاحب نے کئی سال کی محنت کے بعد ان سب کو ایک کتاب میں حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا ہے۔ ترتیب کی صورت یہ ہے کہ ہر صفحہ میں چار کالم ہیں۔ پہلے کالم میں محاورہ، دوسرے میں اس کے معنی اور تشریح، تیسرے کالم میں وہ شعر جس میں محاورہ آیا ہے اور پھر آخر کالم میں شاعر کے اس دیوان کا حوالہ ہے جس سے وہ شعر لیا گیا ہے۔ اس طرح ۴۴۶۴ اشعار اور ان کے محاورات مع تشریحات کے یکجا ہو گئے ہیں۔ شروع میں داغ مرخم کی شاعری اور حالات پر ایک مختصر مگر سنجیدہ مقدمہ بھی ہے۔ لائق مرتب کی یہ ادبی خدمت بے شبہ لائق وسر اور آفریں ہے۔ امید ہے زبان کا ذوق رکھنے والے حضرات اس کی قدر کریں گے۔

ہم اور وہ | از خواجہ محمد شفیع تقیہ کلاں ضخامت ۸۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت بجلد ہر گد پوش خوبصورت پتہ۔ مکتبہ ادب اردو بازار دہلی۔

خواجہ صاحب نے کئی سال ہوئے مذکورہ بالا نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس عام خیال کی تردید کی گئی تھی کہ ہمارے بزرگ سراپا محاسن تھے اور ہم ان کے اخلاف سرتاسر عیب نقصان ہیں۔ پیرایہ بیان تمثیل کا ہے۔ خواجہ صاحب کی یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ تھوڑی مدت میں ہی اس کے تین ایڈیشن ختم ہو گئے اب مکتبہ ادب نے اس کا چوتھا ایڈیشن نسبتاً زیادہ ٹیپ ٹاپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ زبان و بیان۔ فصاحت و بلاغت، نور کلام اور جوش اظہار روانی و بیافنگی اور عبارت کی سلاست و انجام ان سب اوصاف کے لحاظ سے یہ کتاب اس زمانہ کا بہترین ادبی شاہکار ہے۔ امید ہے کہ ادب و ذوق رکھنے والے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور سچی قدر کریں گے۔

سرخ افسانے | از اسرار احمد صاحب آزاد۔ تقیہ ۲۰۰۰ حجم ۲۸۸ صفحات طباعت و کتابت بہتر قیمت تین روپیہ۔ پتہ نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ انقلاب کے بعد کے روس کی زندگی سے متعلق انیسویں صدی کے افسانوں کا اردو ترجمہ ہے۔ ان افسانوں میں اشتراکیت کی روح پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان کے مطالعہ سے غمزدگی کی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ رگوں میں زندگی کی امنگ، ولولہ و شجاعت انسانی ہمدردی اور جدوجہد عمل کا خون تیزی کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے۔ ہم روسی زبان سے واقف نہیں۔ البتہ ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ عبارت کا زور اور اس کی روانی اور برجستگی دیکھ کر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادیب جو اشتراکیت پرستی کی آٹھیں عریاں نویسی کی ترویج کر رہے ہیں وہ ان افسانوں سے اگرچہ اس تو کافی سبق لے سکتے ہیں کہ ان میں زندگی کی دردناک اور گوناگون تصویریں جگہ جگہ نظر آتی ہیں لیکن فحاشی کا کہیں شائبہ بھی نہیں۔

دیوان امام ابو بکر بن درید اللازدی

امام ابو بکر بن درید تیسری صدی ہجری کے نامور محدث اور دیب ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ مولانا سید محمد بدرالدین صاحب علوی استاد عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے کئی سال کی محنت اور وسیع مطالعہ کے بعد آپ کا دیوان اشعار مرتب کیا اور مصرعے شائع کیا گیا۔ کاغذ اور ٹائپ نہایت عمدہ کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ اور آخر میں انڈکس اور حاشیہ میں مشکل الفاظ کی شرح بھی ہے۔ ارباب علم و ادب کے لئے یہ کتاب ایک نادر تحفہ ہے۔ قیمت تین روپیہ

نیچر مکتبہ برہان قزول بارغ دہلی سے طلب کیجئے

خلافت راشدہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جدید ایڈیشن
 قیمت ۳۰ روپے مجلد ۱۲ مضبوط اور عمدہ جلد للہ
 سنہ ۱۳۳۲ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول
 لغت قرآن پر بے مثل کتاب ہے مجلد للہ
 سرمایہ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا مختصر شستہ
 ورفہ ترجمہ جدید ایڈیشن قیمت ۳۰ روپے
 اسلام کا نظام حکومت اسلام کے ضابطہ حکومت
 کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث ہے مجلد للہ
 خلافت بنی امیہ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ ہے
 مجلد ۱۳ مضبوط اور عمدہ جلد للہ
 سنہ ۱۳۳۲ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت
 بلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب للہ مجلد
 ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت
 بلد ثانی للہ مجلد صر
 حصہ القرآن حصہ سوم انبیاء علیہم السلام
 کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی۔ نئے مجلد صر
 مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی ہے مجلد للہ
 سنہ ۱۳۳۵ء قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف
 پر جدید اور محققانہ کتاب عالم مجلد صر
 قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا بیان ہے مجلد صر
 انقلاب روس سے
 سنہ ۱۳۳۶ء ترجمان السنہ ارشادات نبوی کا جامع
 اور مستند ذخیرہ جلد اول للہ مجلد ۱۲
 مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم
 للہ مجلد صر
 مسلمانوں کا نظم مملکت للہ مجلد صر
 تحفہ النظر یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ
 قسم اعلیٰ کے رسم دوم دو روپے آٹھ آنے
 مارشل ٹیوٹو یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر
 نتیجہ خیز اور دلچسپ کتاب دو روپے
 مفصل فہرست کتب دفتر سے طلب فرمائیے
 اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل
 بھی معلوم ہوگی۔

نیچر ندوۃ المصنفین دہلی قرول بلغ

مختصر قواعد ندوة المصنفین دہلی

(۱) محسن خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات تدریجی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں کو مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوة المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) اجا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوة المصنفین کے اجا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پرائس سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

- (۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔
- (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔
- (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ پہنچے، وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بوقت بھیجا جائے گا اس کے بعد شکایت قابل اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کیلئے ۱۔ کٹنگ یا جوابی کارڈ بھیجا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ہشماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸۔

(۶) سنی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹرز پبلشرز جمیع دہلی میں طبع کر کے دفتر رسالہ برہان دہلی قریب بلوغ سے شائع کیا

